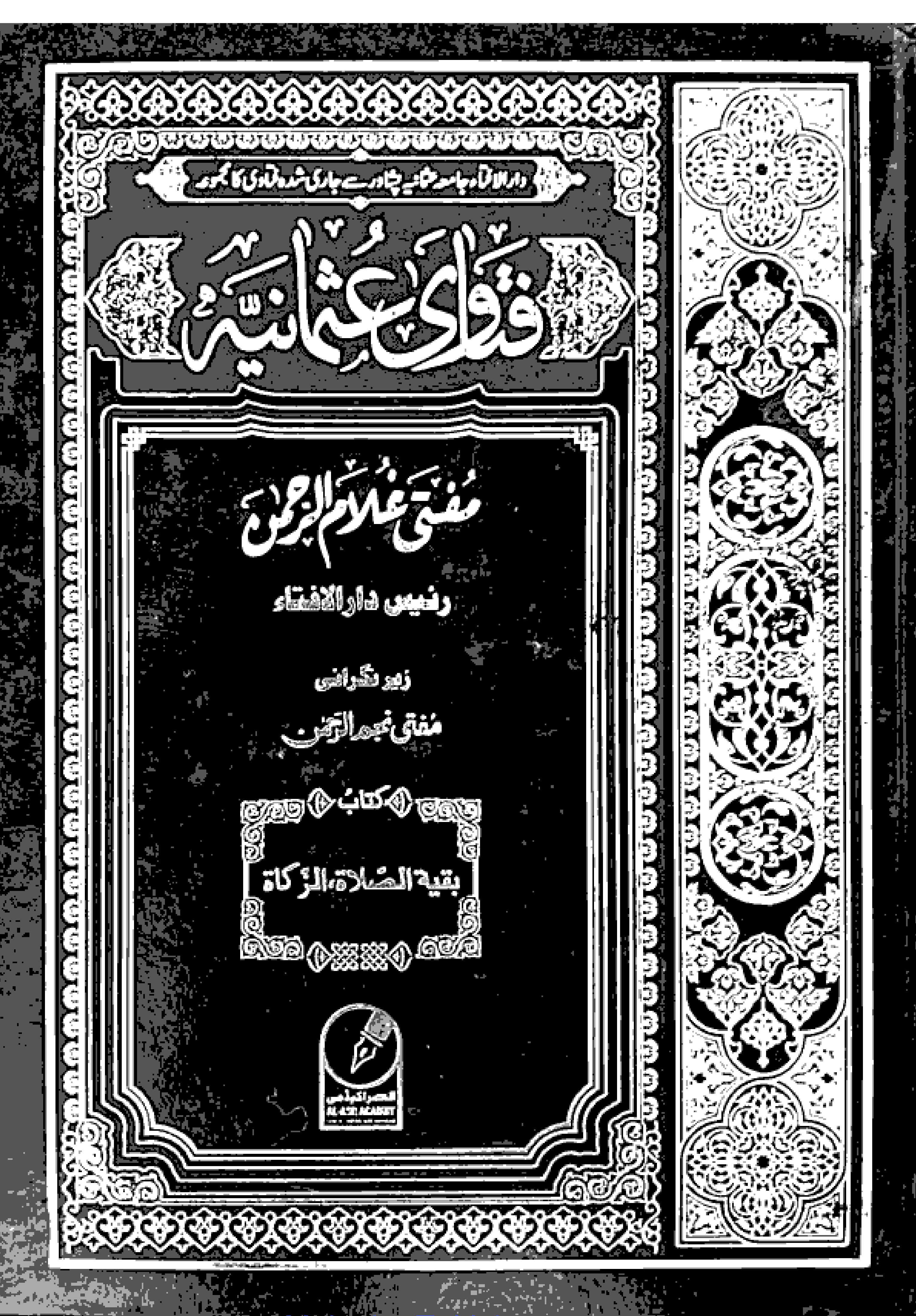
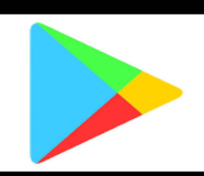


دار الافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور سے جاری شدہ فتاوی کا مجموعہ
فتاویٰ عثمانیہ
مفتی غلام الرحمن
رئیس دار الافتاء
زیر نگرانی
مفتی نجم الرحمن
کتاب
بقیة الصلاة، الزکاة



Maktaba Tul Ishaat



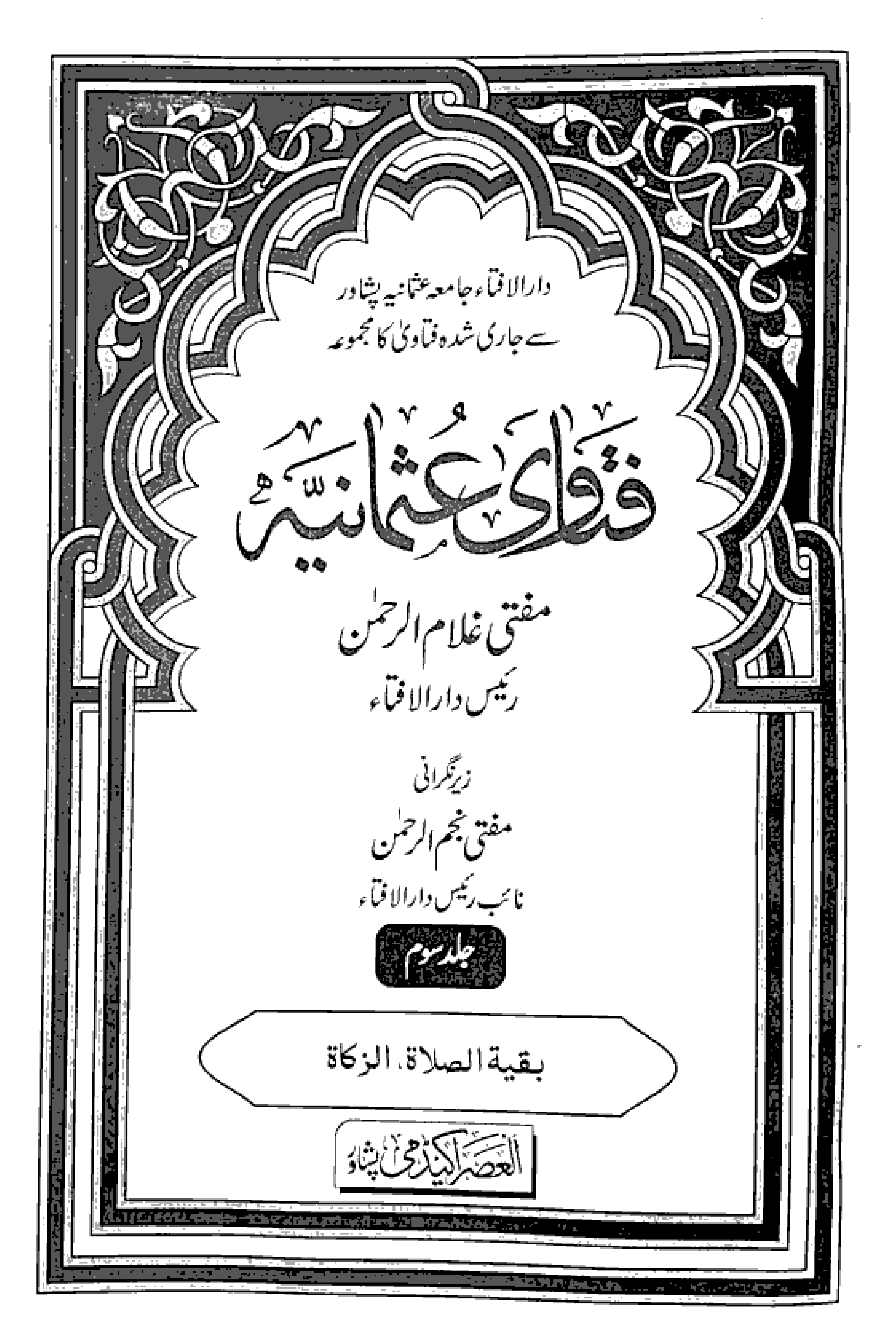
تمام فنون کے کتب ہمارے ویب سائٹ اور پلے سٹور سے فری ڈاون لوڈ کریں۔ ہم روزانہ کی بنیاد پر اس میں مزید نئے کتب شامل کر رہے ہیں نئے شامل شدہ کتب لیے روزانہ ہمارے پلے سٹور اور ویب سائٹ کو باقاعدگی سے چیک کیا کریں۔

اپنی کتاب کو ہمارے ویب سائٹ پر شائع کرنے کے لیے رابطہ کریں

تفاسیر	خطبات	منطق
احادیث	سیرت	معانی
فقہ	تاریخ	تصوف
سوانح حیات	صرف	تقابل ادیان
درس نظامی	نحو	تجوید
لغت	فلسفہ	نعت
فتاوی	حکمت	تراجم
اصلاحی	بلاغت	تبلیغ ودعوت
آڈیو دروس	مناظرے	تمام فنون

Contact Us: maktaba.tul.ishaatofficial.com


العصر اکیڈمی پشاور
AL-ASR ACADEMY
JAMIA USMANIA PESHAWAR



دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور
سے جاری شدہ فتاویٰ کا مجموعہ
فتاویٰ عثمانیہ
مفتی غلام الرحمٰن
رئیس دارالافتاء
زیرنگرانی
مفتی نجم الرحمٰن
نائب رئیس دارالافتاء
جلد سوم
بقية الصلاة، الزكاة
العصر اکیڈمی پشاور

فتاویٰ عثمانیہ

جلد سوم

علمی افادات: شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ
مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور

زیرنگرانی: حضرت مولانا مفتی نجم الرحمٰن مدظلہ
استاذ الحدیث ونائب رئیس دارالافتاء جامعہ عثمانیہ پشاور

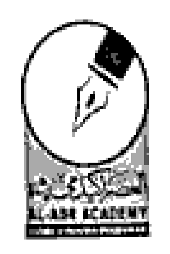
تحقیق وتبویب: شرکائے شعبہ تخصص فی الفقہ الاسلامی والافتاء

باہتمام: احسان الرحمٰن عثمانی

سنِ طباعت اشاعت ہفتم:
ذی الحجہ 1442ھ / جولائی 2021ء

سنِ طباعت اشاعت اول:
جمادی الثانیہ 1437ھ / مارچ 2016ء
سنِ طباعت اشاعت دوم:
جمادی الاولیٰ 1438ھ / فروری 2017ء
سنِ طباعت اشاعت سوم:
رجب المرجب 1439ھ / اپریل 2018ء
سنِ طباعت اشاعت چہارم:
ربیع الثانی 1440ھ / دسمبر 2018ء
سنِ طباعت اشاعت پنجم:
ربیع الاول 1441ھ / نومبر 2019ء
سنِ طباعت اشاعت ششم:
رجب المرجب 1442ھ / دسمبر 2020ء





lhsan.usmani@gmail.com
+92 333-9273561 / +92 321-9273561
+92 312-0203561 / +92 315-4499203

ملنے کا پتہ
مکتبہ العصر
احاطہ جامعہ عثمانیہ پشاور
عثمانیہ کالونی نوتھیہ روڈ پشاور کینٹ
صوبہ خیبر پختونخوا، پاکستان
رابطہ: 0314 9061952 / 0348 0191892



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست جلد۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	فصل في أحكام العيدين	
	(مسائل)	

باب صلوۃ المریض

(مباحث ابتدائیہ)

❁❁❁

باب قضاء الفوائت

(مسائل)

❁❁❁

باب إدراك الفريضة

(مسائل)

باب الاستسقاء

(مباحث ابتدائیہ)

باب الاستسقاء

(مسائل)

باب الجنائز

(مباحث ابتدائیہ)

❁❁❁

فصل فی غسل المیت

(مسائل)

2

2

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	❁❁❁	
	فصل في الدفن وأحكام القبر	
	(مسائل)	

❁❁❁

فصل في التعزية

(مسائل)

❁❁❁

فصل في زيارة القبور

(مسائل)

❁❁❁

❁❁❁❁❁

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	کتاب الزکوۃ	
	(مباحث ابتدائیہ)	

❁❁❁

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	فصل في شرائط الزكوة (مسائل)	

❁❁❁

فصل في أحكام الزكوة

(مسائل)

بابُ العیدین

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

دنیا میں موجود ہر ایک قوم کے لیے ضرور بالضرور کوئی ایسا دن ہوتا ہے جس میں وہ اپنا کوئی خاص مذہبی تہوار مناتے ہیں یا جسے وہ اپنی خوشی کی علامت سمجھ کر مسرت وشادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلام سے قبل بھی یہی دستور تھا۔ لوگ ''نیروز'' اور ''مہرجان'' کے نام سے مخصوص ایام میں اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے اور کھیل کود سے اپنا جی بہلاتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ پھر بھی ان مخصوص دنوں میں اپنی خوشی مناتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی اس فطری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس سے زیادہ بہتر، دو دن مقرر کیے ہیں، ایک عیدالاضحیٰ کا دن اور دوسرا عیدالفطر کا دن''۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی مسرت وشادمانی کا دن ایام جاہلیت کی طرح محض لہو ولعب نہیں بن سکتا تھا بلکہ ملتِ ابراہیمی کے شعائر کو زندہ کرنے اور اعلائے کلمۃ اللہ واطاعت کے جذبہ کو پروان چڑھانے کے لیے مسلمانوں کے ایامِ خوشی میں دوگانہ نمازِ عید رکھی گئی جس میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مؤمن کی خوشی کی انتہا یہی ہے کہ اس کی پیشانی اپنے خالق ومالک کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور وہ صدقۂ فطر اور قربانی جیسے احکام کے ذریعے اپنے مسلمان بھائیوں سے اپنی محبت وہمدردی کا اظہار کرے۔(۱)

عید کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

عید اصل میں عود سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ''لوٹنے'' کے ہیں۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ بھی ان دنوں میں ہر سال اپنے احسانات (روزوں کا افطار، کھانے پینے کی اجازت، صدقۂ فطر، قربانی اور قربانی کا گوشت، اتمامِ حج، خوشی اور سرور) کا بار بار اعادہ کرتا رہتا ہے، اس لیے اس کو عید کہتے ہیں۔ علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ: ''اس کو عید کہنا ایک طرح کی نیک فالی اور اس تمنا کا اظہار ہے کہ یہ روزِ مسرت بار بار آئے''۔ شریعت کی اصطلاح میں شوال کی

---

(۱) حجة الله البالغة، مبحث في العيدين و حكمة تشريعها: ۲/ ۳۰

یکم تاریخ کو عید الفطر جب کہ ذی الحج کی دس تاریخ کو عید الاضحیٰ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(۱)

نمازِ عیدین کا حکم اور وجوب کے دلائل:

حنفیہ کے نزدیک صحیح تر قول کے مطابق نمازِ عید واجب ہے۔جن فقہاے کرام نے اس کو سنتِ مؤکدہ قرار دیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وجوب سنت یعنی ''مواظبت النبی علیہ السلام'' سے ثابت ہے۔دراصل ان فقہاے کرام کے ہاں سنتِ مؤکدہ بھی عملاً اس طرح لازم اور ضروری ہوتا ہے جس طرح حنفیہ کے ہاں واجب پر عمل ضروری ہوتا ہے۔علامہ کاسانیؒ نے ''نمازِ عیدین'' کو شعائرِ دین میں سے بنیادی شعار کہا ہے اور قرآن وسنت اور تعامل امت وخلفاے راشدین سے اس کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔(۲)

نمازِ عیدین کے وجوب اور صحت کے لیے شرائط:

حنفیہ کے ہاں جن شرائط کے ساتھ جمعہ کی نماز واجب ہوتی ہے ،انہی شرائط کے ساتھ عیدین کی نماز بھی واجب ہوگی اور جن شرائط کی موجودگی میں جمعہ کی نماز کا انعقاد صحیح ہوتا ہے،انہی شرائط کے ساتھ عیدین کی نماز کا انعقاد بھی صحیح ہوجاتا ہے،البتہ صرف ایک شرط ایسی ہے جو جمعہ کی صحت کے لیے تو شرط ہے،لیکن عید کے لیے سنت ہے اور وہ ہے خطبہ۔چونکہ شرط شے، شے سے مقدم ہوتی ہے اس لیے خطبہ کو جمعہ کے دن نماز پر مقدم کیا گیا اور عیدین میں چونکہ خطبہ سنت ہے اس لیے اس کو نماز کے بعد رکھا گیا ہے۔

شرائط کا تذکرہ اجمالاً پیش خدمت ہے۔ان کی تفصیل اور چند احکام کا تذکرہ باب الجمعہ میں ملاحظہ ہو۔

شرائطِ وجوب:

عقل،بلوغ،حریت،ذکورت یعنی مردانگی،اقامت،صحت،خوف سے پرامن ہونا،آنکھوں اور ٹانگوں کا صحیح ہونا۔

شرائطِ وجوب اور شرائطِ صحت:

مصر یا فناے مصر،امام یا اس کے نائب کی موجودگی،وقت،جماعت اور اذنِ عام۔(۳)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار،کتاب الصلوۃ،باب العیدین:۴۴/۳، ۴۵،مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي،کتاب الصلوۃ،باب أحکام العیدین،ص:۴۳۲

(۲) حوالہ جات سابقہ،بدائع الصنائع،فصل في صلاۃ العیدین:۲۳۶/۲، ۲۳۷

(۳) بدائع الصنائع،کتاب الصلوۃ،فصل في شرائط وجوبها:۲۳۷/۲

عیدین کی نماز کا وقت:

نمازِ عید کا وقت طلوعِ آفتاب کے بعد، آفتاب کے کسی قدر، یعنی ایک نیزہ کے بقدر بلند ہونے سے شروع ہوتا ہے اور زوالِ آفتاب تک باقی رہتا ہے، تاہم نمازِ عیدالفطر میں کسی قدر تاخیر مسنون ہے تاکہ صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے اور عیدالاضحیٰ کی نماز میں تعجیل بہتر ہے، تاکہ قربانی میں سہولت ہو۔(۱)

عیدین کی نماز کا اپنے وقت سے مؤخر ہونے یا قضا ہونے کا حکم:

عیدالفطر کی نماز میں تاخیر کا حکم:

عیدالفطر کی نماز کی ادائیگی کے لیے صرف ایک ہی دن مقرر ہے اور وہ ہے یکم شوال کا دن، لہٰذا سورج نکلنے سے زوال تک اس کی ادائیگی درست ہے، تاہم اگر کہیں پر چاند نظر آنے کی اطلاع دیر سے پہنچے یا کوئی اور ایسا عذر پیش آئے جس کی وجہ سے لوگ یکم شوال کو عید کی نماز نہ پڑھ سکیں تو دوسرے دن، یعنی دو شوال کو عیدالفطر کی نماز اپنے وقت میں ادا کی جاسکتی ہے۔ دوسرے دن (دو شوال) کے بعد چاہے عذر ہو یا نہ ہو، عیدالفطر کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔

اور اگر کسی عذر کے بغیر عیدالفطر کی نماز پہلے دن ادا نہیں کی گئی یا امیر اور امام نے لوگوں کو نماز پڑھائی لیکن بعض افراد نے ادا نہیں کی یا کوئی شخص امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوگیا، لیکن کسی وجہ سے نماز ٹوٹ گئی تو ان تمام صورتوں میں عید کی نماز ساقط ہوگی، دوسرے دن اس کی قضا لانے کی اجازت نہیں۔

منفرد اور تنہا شخص سے اگر نمازِ عید چھوٹ جائے تو اسے کوشش کرنی چاہیے کہ شہر میں کہیں اور جماعت میں شریک ہوجائے، اس لیے کہ جمعہ کی طرح عیدین کا تعدد بھی ایک شہر میں جائز ہے، تاہم اگر کہیں بھی نماز نہ پاسکے تو مستحب یہ ہے کہ چار رکعت نماز چاشت ہی ادا کرلے جن میں تکبیراتِ زوائد کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ نمازِ عید کی قضا نہیں بلکہ ایک مستحب عمل ہے جس سے دل مطمئن ہوسکے۔

عیدالاضحیٰ کی نماز میں تاخیر کا حکم:

عیدالاضحیٰ کی نماز کو دوسرے یا تیسرے دن تک مؤخر کیا جاسکتا ہے، تاہم اگر تاخیر عذر کی وجہ سے ہو تو کوئی

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین، تنبیہ:۳/۵۲، ۵۳، مراقي الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوي، کتاب الصلوۃ، باب أحکام العیدین، ص:۴۳۶

کراہت نہیں اور اگر بلا عذر ہو تو نماز مکروہ ہوگی۔ تیسرے دن سے زیادہ تاخیر کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ چاہے عذر ہو یا نہ ہو۔(۱)

نماز کی ادائیگی کی جگہ:

اکثر فقہائے کرام کے نزدیک نمازِ عیدین کے لیے آبادی سے باہر کھلے میدان (عیدگاہ) میں جانا بہتر ہے۔ ایسی صورت میں امیر یا امام کو چاہیے کہ وہ شہر کے اندر ضعفا اور مریضوں کو نماز پڑھانے کے لیے کوئی اور شخص مقرر کرے، تاکہ یہ لوگ عید کی نماز سے محروم نہ رہیں۔ یاد رہے کہ عیدگاہ یا کھلے میدان میں جانا سنت ہے، فرض یا واجب نہیں، لہٰذا اگر لوگوں کو شہر کے اندر نماز پڑھنے میں آسانی ہو یا کوئی اور عذر ہو جس کی وجہ سے لوگ شہر سے باہر کھلے میدان میں نہ جا سکیں تو شہر میں نمازِ عید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔(۲)

نمازِ عیدین کی واجبات:

عید کی نماز کے سارے احکام بقیہ نمازوں کی طرح ہیں، تاہم جو چیزیں اس میں عام نمازوں سے زائد ہیں، وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) عیدین کی نماز میں جماعت ضروری ہے۔

(۲) عیدین کی نماز میں جہراً قراءت ضروری ہے۔

(۳) عیدین کی نماز میں ہر رکعت کے اندر تین تکبیرات پڑھنا بھی واجب ہے۔

ہر ایک کی تفصیل متعلقہ ابحاث میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔(۳)

طریقہ نماز:

عیدین کی نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز سے پہلے دل یا زبان سے یہ نیت کرلے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے اس عید کی نماز اس خاص امام کے پیچھے پڑھ رہا ہوں، اس کے بعد تکبیرِ تحریمہ پڑھی جائے گی اور امام و مقتدی ثنا پڑھیں گے، ثنا کے بعد امام اور مقتدی دونوں تین تکبیراتِ زوائد پڑھیں گے جن میں سے ہر تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائیں گے،

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۵۸، ۵۹، بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بيان وقت صلوة العيدين:۲/۲۴۲

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۴۹

(۳) الموسوعة الفقهية، مادة صلاة العيدين:۲۷/۲۴۵، ۲۴۶

امام ہر دو تکبیرات کے درمیان تین مرتبہ اللہ اکبر کہنے کے بقدر خاموشی اختیار کرے گا، اس کے بعد امام تعوذ اور تسمیہ خفیہ طور پر پڑھے گا، پھر سورۂ فاتحہ پڑھے گا، پھر اس کے ساتھ کوئی سورت (مستحب یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ) ملا دے، پھر رکوع اور سجدہ کریں گے۔ دوسری رکعت میں امام تسمیہ، فاتحہ اور سورت (مستحب یہ ہے کہ سورۂ غاشیۃ) پڑھے، قراءت سے فارغ ہونے کے بعد امام اور مقتدی تین تکبیراتِ زوائد پڑھیں گے جن میں ہاتھ بھی اٹھائیں گے، اس کے بعد رکوع کے لیے چوتھی تکبیر کہی جائے گی جس میں ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ اس کے بعد معمول کے مطابق نماز پوری کی جائے گی۔ تکبیرات زوائد کے درمیان میں ہاتھوں کو کھلا چھوڑنا (ارسال) بہتر ہے۔ نماز کے فوراً بعد امام منبر پر بیٹھے بغیر دو خطبے پڑھے گا جس کی مجموعی کیفیت جمعہ کی سی ہوگی۔(۱)

تکبیراتِ زوائد کے احکام:

عیدین کی نماز میں تکبیرِ تحریمہ اور ہر رکعت کے رکوع کے لیے ایک ایک تکبیر (کل ملا کر تین تکبیرات) تکبیراتِ اصلیہ کہلاتے ہیں۔ ان تکبیرات کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں چھ تکبیراتِ زوائد پڑھی جائیں گی۔ حنفیہ کے راجح قول کے مطابق یہی چھ تکبیرات واجب ہیں۔ یہی قول ابن مسعودؓ اور اکثر صحابہؓ کا ہے۔ امام ابویوسفؒ کے ہاں ان تکبیرات کی تعداد نو، امام شافعیؒ کے ہاں بارہ، اور ابن عباسؓ کے ہاں دس ہے۔

تکبیرات کے درمیان ترتیب اور قراءت پر اس کی تقدیم وتاخیر کا مذکورہ طریقہ محض اولویت پر مبنی ہے لہٰذا اگر کسی امام نے ان تکبیرات اور قراءت کی ترتیب میں ردّ و بدل کی تو مقتدی پر اس کی متابعت واجب ہوگی۔ یہ بات ضروری ہے کہ تکبیرات کی تعداد میں چونکہ اختلاف صحابہ کرامؓ سے مروی ہے، اس لیے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی امام تکبیرات کی تعداد میں اضافہ کردے تو سولہ تکبیرات تک اس کی متابعت ضروری ہے، اس لیے کہ صحابہؓ سے اتنی مقدار بھی ثابت ہے، تاہم سولہ سے زائد تکبیرات میں وہ امام کی متابعت چھوڑ دے، البتہ اگر مقتدی امام سے کافی دور ہو اور وہ دوسرے مکبّرین کی آواز پر تکبیرات پڑھ رہا ہو تو وہ سولہ سے زائد بھی پڑھ سکتا ہے، اس لیے کہ غلطی مکبّرین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔(۲)

(۱) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلوة، باب أحكام العيدين، ص: ٤٣٦، ٤٣٧، الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين: ١/١٥٠

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلوة، باب العيدين: ٣/٥٣-٥٥، بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان قدر صلوة العيد: ٢/٢٤٣-٢٤٦، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلوة، باب أحكام العيدين، ص: ٤٣٧

تکبیرات چھوٹ جانے کا حکم:

اگر کوئی شخص اتنی تاخیر سے امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے کہ تکبیراتِ زوائد پڑھی جا چکی تھیں، لیکن امام ابھی رکوع میں نہیں گیا تھا تو تکبیرِ تحریمہ کے بعد تکبیراتِ زوائد بھی پڑھ لے اور رفعِ یدین بھی کر لے اور اگر امام رکوع کی حالت میں ہو تو مقتدی قیام کی حالت میں تکبیرِ تحریمہ پڑھ لے اور ممکن ہو تو تکبیرات بھی پڑھ لے، تاہم اگر رکوع فوت ہونے کا خدشہ ہو تو رکوع میں جائے اور رکوع کے اندر تسبیحات سے پہلے تکبیرات پڑھ لے جس میں رفعِ یدین نہ کرے۔ یہی حکم امام کا بھی ہے یعنی اگر امام تکبیرات زوائد پڑھنا بھول جائے تو وہ بھی ان کو رکوع کے اندر ہی پڑھ لے اور اگر مقتدی سے مکمل رکعت فوت ہو جائے تو بعد میں ادائیگی کرتے وقت تکبیرات کو قراءت کے بعد پڑھ لے۔(۱)

چند متفرق احکام:

(۱) عید کی نماز کو تشہد کے دوران یا اس کے بعد پالینا:

امام ابوحنیفہؒ وابو یوسفؒ کے ہاں اگر کوئی شخص عید کی نماز میں قعدۂ اخیرہ یا سجدۂ سہو کے دوران شامل ہو جائے تو وہ بھی عید کی نماز کو پالینے والا متصور ہوگا، لہٰذا سلام پھر جانے کے بعد وہ مذکورہ طریقے سے دو رکعت نمازِ عید ادا کرے گا۔(۲)

(۲) عید کے دن نفل نماز پڑھنے کا حکم:

حنفیہ کے نزدیک عید کی نماز سے پہلے کسی بھی جگہ (گھر ہو یا مسجد یا عیدگاہ) نفل پڑھنا مکروہ ہے، تاہم عید کی نماز کے بعد گھر میں نفل پڑھنے کی اجازت ہے۔(۳)

(۳) عیدین کی نماز کے لیے بالاتفاق اذان واقامت نہیں۔(۴)

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۵۵-۵۷، الفتاوی الهندية، کتاب الصلوۃ، الباب السابع عشر في صلاة العيدين:۱/۱۵۱، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، کتاب الصلوۃ، باب أحكام العيدين، ص: ۴۳۷، ۴۳۸

(۲) الفتاوی الهندية، کتاب الصلوۃ، الباب السابع عشر في صلاة العيدين:۱/۱۵۱

(۳) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۵۰، ۵۲، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام العيدين، ص:۴۳۶

(۴) الصحيح للبخاري، کتاب العيدين، باب المشي والركوب إلى العيد بغير أذان ولا إقامة:۱/۱۳۱

مفسداتِ نمازِ عیدین:

نمازِ عیدین کی مفسدات بھی بالکل جمعہ ہی کی طرح دو قسم کی ہیں: ایک تو وہ چیزیں ہیں جن سے عام نمازیں بھی فاسد ہوتی ہیں اور دوسری قسم کی مفسدات وہ ہیں جن سے صرف جمعہ اور عیدین کی نمازیں فاسد ہوتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مخصوص وقت کا نکل جانا۔

(۲) نماز کے دوران جماعت کی مخصوص تعداد کا فوت ہو جانا یا کم ہو جانا۔

پہلی قسم کی مفسدات سے عیدین کی نماز فاسد ہو جائے تو دوبارہ عید کی نماز پڑھی جائے گی جب کہ دوسری قسم کی مفسدات پیش آنے کے بعد عید کی نماز ساقط ہو جائے گی۔(۱)

عید الفطر کی سنتیں:

عید الفطر کے دن مندرجہ ذیل امور کو فقہائے کرام نے سنت شمار کیا ہے۔

(۱) عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل میٹھی چیز کھانا، بہتر یہ ہے کہ کھجور ہو اور طاق عدد میں ہو۔

(۲) عید گاہ جانے سے قبل غسل کرلے، مسواک کرلے، خوشبو لگائے اور وہ لباس پہن لے جو پاک صاف ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو پسندیدہ ہو اور شرعاً جائز ہو۔

(۳) اگر صدقہ فطر اس پر واجب ہو تو عید گاہ جانے سے پہلے پہلے اس کو ادا کرلے اگر ممکن ہو تو بقدرِ طاقت کچھ صدقہ بھی کرلے۔

(۴) چہرے پر مسکراہٹ، خوشی اور تازگی لائے، ہر کسی سے خندہ روئی سے ملے۔

(۵) صبح سویرے اٹھے اور اپنے محلے کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھ لے۔

(۶) جلدی تیار ہونے کے بعد عید گاہ کی طرف پیدل چلنا مسنون ہے۔ چلنے میں وقار، سکون اور عاجزی اختیار کرے اور آنکھوں کو جھکا کر چلے۔

(۷) عید گاہ جاتے ہوئے راستے میں آہستہ آہستہ تکبیرات بھی پڑھتا رہے۔ صاحبین، اکثر فقہائے کرام اور صحابہ کرامؓ سے عید الفطر کے دن بھی تکبیرات میں جہر کرنا منقول ہے، لہٰذا اگر کوئی جہراً تکبیرات پڑھنا چاہے تو کوئی حرج نہیں اگرچہ علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ نے بعض فقہائے کرام کے حوالے سے جہر کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بیان ما یفسدها: ۲۴۸/۲

(۸) عیدگاہ پہنچنے کے بعد تکبیرات نہ پڑھنا، تاکہ امام کے وعظ ونصیحت اور خطبہ اچھی طرح سنا جا سکے۔

(۹) جس راستے سے عیدگاہ گیا ہو اسے بدل کر دوسرے راستے سے آنا مسنون ہے۔ آپ ﷺ کا معمول مبارک یہی تھا۔

(۱۰) عید کے دن چاندی کی انگوٹھی پہننا، ایک دوسرے کو عید مبارک یا کسی دوسری دعا کے ذریعے مبارک باد دینا بھی جائز ہے۔

(۱۱) عیدالفطر کے خطبے میں صدقہ فطر کے احکامات کا تذکرہ کرنا سنت ہے۔(۱)

عیدالاضحیٰ کی سنتیں اور امتیازی احکام:

عیدالاضحیٰ کے احکام عیدالفطر کی طرح ہیں، البتہ چند امتیازی احکام یہ ہیں۔

(۱) عیدالاضحیٰ کے موقع پر سنت یہ ہے کہ نماز پڑھنے تک کوئی چیز نہ کھائی جائے، بلکہ مستحب تو یہ ہے کہ اس دن قربانی کا گوشت کھانے تک انتظار کیا جائے۔ یہ حکم ہر شخص کے لیے ہے چاہے وہ ذاتی طور پر قربانی کرنے والا ہو یا نہ ہو۔

(۲) عیدالاضحیٰ کے دن عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیرات بلند آواز سے پڑھنا مسنون ہے۔

(۳) عیدالاضحیٰ کے خطبے میں قربانی کے احکامات کا تذکرہ کرنا سنت ہے۔

(۴) عیدالاضحیٰ کی نماز میں تعجیل مسنون ہے، تاکہ لوگ قربانی کے لیے جلد فارغ ہو جائیں۔(۲)

تکبیراتِ تشریق، تعارف اور تاریخی جائزہ:

تکبیر تشریق سے مراد وہ الفاظ ہیں جو حضرت جبرائیل، سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہم السلام نے مشترکہ طور پر اس وقت ارشاد فرمائے تھے جس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے راستے میں قربانی کرنے کے لیے زمین پر لٹا کر اس کے گلے پر چھری پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ اس عظیم قربانی کی یادگار کے طور پر مذکورہ الفاظ یعنی "اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر و للّٰہ الحمد" آج بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۴۷ـ۵۱، الفتاوی الهندية، کتاب الصلوة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين:۱/۱۴۹، ۱۵۰، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، کتاب الصلوة، باب أحکام العيدين، ص: ۴۳۳ـ۴۳۵، بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في مايستحب في يوم العيد:۲/۲۴۹، ۲۵۰

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوة، باب العیدین:۳/۵۹، ۶۰، الفتاوی الهندية، کتاب الصلوة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين:۱/۱۵۰، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، کتاب الصلوة، باب أحکام العيدين، ص: ۴۴۰

تکبیراتِ تشریق کا حکم:

حنفیہ کے راجح قول کے مطابق تکبیراتِ تشریق پڑھنا واجب ہے۔ جن فقہا نے ان کو سنتِ مؤکدہ کہا ہے ان کا مقصد بھی عملاً وجوب ہی کا ہے۔

تکبیراتِ تشریق کے وجوب کے لیے شرائط:

امام ابو حنیفہؒ کے ہاں تکبیر تشریق ہر اس فرض نماز کے بعد واجب ہوگی جو جماعت کے ساتھ پڑھی جائے اور پڑھنے والا مقیم ہو اور شہر میں ہو، تاہم صاحبین کے ہاں تکبیرِ تشریق ہر فرض نماز کے بعد واجب ہوگی اور ہر اس شخص پر واجب ہوگی جس پر نماز فرض ہو، چاہے منفرد ہو یا با جماعت نماز پڑھنے والا، مسافر ہو یا مقیم، مرد ہو یا عورت، شہر میں ہو یا دیہات میں۔ صاحبین کے قول کے بارے میں علامہ حصکفیؒ کا کہنا ہے:

”وعليه الاعتماد والعمل والفتوىٰ في عامة الأمصار وكافة الأعصار“.

اس قول پر اعتماد اور عمل کیا گیا ہے اور عام شہروں اور تمام زمانوں میں اس پر فتویٰ دیا گیا ہے، لہٰذا صاحبین کے ہاں ہر فرض نماز کا سلام پھیر لینے کے فوراً بعد کم از کم ایک مرتبہ بلند آواز سے تکبیر پڑھنا واجب ہے۔ اس سے زیادہ پڑھنا بعض فقہائے کرام کے ہاں محض مباح اور بعض کے ہاں مستحب ہے۔

کون سی نمازوں کے بعد تکبیرات پڑھنا واجب ہے؟

پنج وقتہ فرض نمازوں اور جمعہ کے بعد تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے، چاہے جماعت کے ساتھ پڑھی جائے یا تنہا، لہٰذا اگر ایام تشریق کی نمازوں کی قضا انہی دنوں میں جماعت کے ساتھ یا بلا جماعت کی جائے تو ان کے بعد بھی تکبیر کہنا واجب ہوگا، تاہم ایام تشریق کی نمازوں کی قضا اگر دوسرے ایام میں ہو یا دوسرے دنوں کی نمازوں کی قضا ایام تشریق میں ہو یا ایک سال کے ایام تشریق کی نمازوں کی قضا آئندہ سال کے ایام تشریق میں ہو تو ان تمام صورتوں میں تکبیرات کہنا واجب نہیں۔

عید کی نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب تو نہیں، تاہم تعامل امت کو دیکھ کر فقہائے بلخ نے عید کی نماز کے بعد بھی تکبیراتِ تشریق کو واجب کہا ہے۔ نوافل، سنن اور وتر کے بعد تکبیرات تشریق پڑھنا نہ تو واجب ہے اور نہ سنت، محض ذکر کی نیت سے اگر کوئی پڑھنا چاہے تو کوئی حرج نہیں۔

تکبیراتِ تشریق کے لیے مخصوص ایام:

صاحبین کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق ذی الحج کی نویں تاریخ کی نمازِ فجر سے ان تکبیرات کا آغاز ہوگا اور تیرہ ذی الحج کی نمازِ عصر تک یہ تکبیرات پڑھی جائیں گی۔ اسی طرح یہ کل تیئس (۲۳) نمازیں ہوں گی۔ فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں یہ تعداد کل آٹھ ہے یعنی نو ذی الحج کی فجر سے لے کر دس ذی الحج کی عصر تک تکبیرات پڑھی جائیں گی۔

تکبیراتِ تشریق کے چند متفرق احکام:

(۱) تکبیرِ تشریق سلام پھیر لینے کے فوراً بعد پڑھ لینا واجب ہے۔ سلام پھیر لینے کے بعد بولنے، وضو توڑنے یا تلبیہ پڑھنے سے تکبیر ساقط ہو جاتی ہے، لہٰذا تکبیر کو مسنون دعاؤں اور تلبیہ وغیرہ پر مقدم کرنا واجب ہے۔

(۲) عورت تکبیر پڑھتے وقت آواز کو پست رکھے۔

(۳) اگر امام تکبیر پڑھنا بھول جائے تو مقتدی خود پڑھنا شروع کرے۔(۱)

❁❁❁❁❁

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب العيدين:۳/۶۱-۶۶، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلوة، باب أحكام العيدين، ص: ۴۴۱-۴۴۴

فصل في شرائط صلوة العيدين

(نمازِ عید کی شرائط کا بیان)

حجاج کرام کے لیے عیدالاضحیٰ کی نماز

سوال نمبر(1):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حجاج کرام دس ذی الحجہ کو منیٰ میں ہوتے ہیں، ان پر عیدالاضحیٰ کی نماز واجب ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

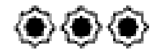
فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق عید کی نماز ہر مسلمان مرد، عاقل، بالغ اور مقیم پر واجب ہے، لیکن دوران حج حجاج کرام مناسک حج مثلاً وقوف مزدلفہ، رمی الجمار وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں، اس لیے اُن پر عیدالاضحیٰ کی نماز کی ادائیگی واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ليس علىٰ أهل منٰى يوم النحر صلاة العيد ؛لأنهم في وقتها مشغولون بأداء المناسك .(١)

ترجمہ:

عید کے دن منیٰ میں رہنے والے حجاج کرام پر عید کی نماز واجب نہیں، کیونکہ وہ اس وقت مناسکِ حج کی ادائیگی میں مشغول ہوتے ہیں۔



(١) رد المحتار، كتاب الاضحية، ٤٦١/٩

دیہات میں عید کی نماز

سوال نمبر(2):

ایسی بستی جوشہر سے کوسوں دور ہواور بڑے گاؤں کے حکم میں بھی نہ ہو۔ وہاں عید کی نماز شروع کرانا کیسا ہے؟ ہمارے علاقے کے بعض لوگوں کا اس بات پر اصرار ہے کہ شرائط کے فقدان کے باوجود عید کی نماز شروع کرنا درست ہے، البتہ جمعہ کی نماز درست نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جمعہ اور عیدین کی نماز کی صحت کے لیے فقہائے کرام کی بیان کردہ شرائط میں سے شہر بھی ہے۔ اگر کوئی بستی شہر یا بڑے گاؤں کے حکم میں نہ ہوتو وہاں عیدین کی نماز شروع کرانا مکروہ تحریمی ہے۔

اگر واقعی مذکورہ بستی پر شہر یا بڑے گاؤں کی تعریف صادق نہ آتی ہوتو پھر اس بستی میں عیدین کی نماز شروع کرانے سے اجتناب کیا جائے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

صلوۃ العید في القریٰ تکرہ تحریما: أي لأنہ اشتغال بما لا یصح؛لأن المصر شرط الصحۃ.(۱)

ترجمہ:

دیہاتوں میں عید کی نماز کا انعقاد مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ ایسے عمل کے ساتھ مشغول ہونا ہے جو درست نہیں، اس لیے کہ عید کی نماز کی صحت کے لیے شہر شرط ہے۔



آبادی میں آنے والی عیدگاہ کا حکم

سوال نمبر(3):

ہمارے گاؤں میں تیس، پینتیس سال پہلے ایک عیدگاہ بنائی گئی تھی۔ جس میں گاؤں کے اردگرد کے لوگ آکر

(۱)الدرالمختارعلیٰ صدررد المحتار، کتاب الصلوۃ،باب العیدین:۳/٤٦

عید کی نماز ادا کرتے تھے۔اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب اس کو عیدگاہ کہنا درست نہیں، کیونکہ عیدگاہ صحرا یا جنگل میں ہونی چاہیے، جبکہ دوسری طرف علما کا خیال یہ ہے کہ مذکورہ جگہ گاؤں کے درمیان ہونے کے باوجود علاقے کی سب سے بڑی اجتماع گاہ ہے، لہٰذا عید کی نماز بہ نسبت مسجد کے یہاں پڑھنا زیادہ اجر کا باعث ہے۔ مذکورہ جگہ کو عیدگاہ کہنا درست ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام نے عید کی نماز کو صحرا میں پڑھنا مسنون لکھا ہے، لیکن یہ بات واضح رہے کہ عیدگاہ کا گاؤں سے باہر ہونا کوئی ایسا امر نہیں کہ جس کو فرض اور واجب کہا جائے اور نہ ہی عید کی نماز عیدگاہ پر موقوف ہے، البتہ بعض روایات اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا میں پڑھنا بہتر ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر یہ عیدگاہ گاؤں سے باہر نہ ہو، بلکہ درمیان میں واقع ہو تو اس میں عید کی نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، چونکہ علاقے کے تمام لوگ اس میں جمع ہو سکتے ہیں، اس لیے یہ عیدگاہ کے حکم میں ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(والخروج إليها) أي الجبانة لصلاة العيد (سنة وإن وسعهم المسجد الجامع) هو الصحيح.(١)

ترجمہ:

صحیح قول کے مطابق عید کی نماز کی ادائیگی کے لیے صحرا کا رخ کرنا سنت ہے، اگرچہ جامع مسجد میں گنجائش پائی جاتی ہو۔

❁❁❁

عید کی نماز انفرادی پڑھنا

سوال نمبر(4):

کیا عید کی نماز عام نمازوں کی طرح انفرادی طور پر پڑھی جا سکتی ہے؟

بینوا توجروا

(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۴۹

الجواب وباللہ التوفیق:

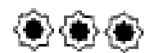
جس طرح عید کی نماز دوسری نمازوں سے شرائط میں مختلف اور جمعہ کی مانند ہے، اسی طرح عید کی نماز باجماعت پڑھنے کی شرط میں بھی نماز جمعہ کی طرح ہے۔ انفرادی طور پر عید کی نماز کی ادائیگی جائز نہیں، حالانکہ دوسری نمازیں بغیر جماعت کے بھی پڑھی جاسکتی ہیں، لیکن جمعہ اور عید دونوں کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(ولم تقض إن فاتت مع الإمام) لأن الصلوة بهذه الصفة لم تعرف قربة إلا بشرائط لا تتم بالمنفرد،فمراده نفي صلا تها وحده.(۱)

ترجمہ:

اگر امام کے ساتھ عید کی نماز فوت ہوجائے تو اس کی قضا نہیں لائی جائے گی، کیوں کہ اس صفت والی نماز عبادت کے طور پر معلوم ومعروف نہیں، مگر ان شرائط کے ساتھ معروف ہے جو منفرد سے پوری نہیں ہوسکتیں، پس اس سے مراد انفرادی نماز پڑھنے کی نفی ہے۔



گراؤنڈ میں عید کی نماز

سوال نمبر(5):

ایک گاؤں کی آبادی زیادہ ہو، گاؤں سے باہر صحرا میں اتنے لوگوں کی گنجائش نہ ہو تو پھر گاؤں کے اندر آبادی کے وسط میں سکول کے گراؤنڈ کو عیدگاہ کے طور پر استعمال کرنے سے سنت ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ صحرا کا احاطہ نمازیوں کی نسبت کم ہونے کی وجہ سے اس میں دشواری ہوتی ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر یا گاؤں سے باہر صحرا میں عید کی نماز پڑھنا سنت ہے، لیکن کسی عذر کی وجہ سے

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ العیدین:۲/۲۸۳

مسجد میں عید کی نماز پڑھنا خلاف سنت نہیں۔عید کے دن خروج إلی الجبانۃ (صحرا کی طرف نکلنا) سنت ہے اور جبانۃ کا اطلاق لغت کے اعتبار سے جس طرح بیابان پر ہوتا ہے، اسی طرح ہموار زمین پر بھی ہوتا ہے، اس لیے کسی گراؤنڈ میں عید کی نماز پڑھنے کو خلافِ سنت کہنا مشکل ہے۔

لہٰذا اگر صحرا میں دشواری ہو تو پھر شہر سے باہر جانے کی بجائے شہر کے اندر کسی مسجد یا گراؤنڈ میں پڑھ لینا بھی خلافِ سنت نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الخروج إلی الجبانة في صلوة العيد سنة، وإن كا ن يسعهم المسجد الجامع على هذا عامة المشايخ وهو الصحيح.(۱)

ترجمہ:

عید کی نماز ادا کرنے کے لیے صحرا کی طرف نکلنا سنت ہے، اگر چہ جامع مسجد میں لوگوں کی گنجائش ہو، عام مشائخ کا یہی قول ہے اور یہ صحیح ہے۔

❁❁❁

عیدالاضحیٰ کی نماز کا پہلے دن رہ جانا

سوال نمبر(6):

اگر بقرعید کی نماز کسی عذر سے پہلے دن ادا نہ کی جاسکے تو پھر اس کے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ کیا بقرعید شرائط اور احکام کے اعتبار سے عیدالفطر کی طرح ہے یا ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عیدالاضحیٰ شرائط کے لحاظ سے عیدالفطر کی طرح ہے۔تاہم بعض احکام میں عیدالفطر سے مختلف ہے۔ان میں سے ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ عیدالاضحیٰ کی نماز تیسرے دن تک مؤخر کی جاسکتی ہے، لیکن بغیر عذر کے مؤخر کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة،الباب السابع في صلوة العيدين:۱/ ۱۵۰

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وتؤخر بعذر إلی ثلثة أیام)لأنها موقتة بوقت الأضحیة،فتجوز مادام وقتها باقیا،ولاتجوز بعد خروجه؛لأنها لاتقضی.قید بالعذر؛لأن تاخیرها لغیر عذر عن الیوم الأول مکروه.(۱)

ترجمہ:

اور عذر ہو تو عیدالاضحیٰ کی نماز تیسرے دن تک مؤخر کی جاسکتی ہے، کیونکہ عید کی نماز کا وقت قربانی کے ساتھ مقید ہے تو جب تک قربانی کا وقت ہے تو نماز بھی درست رہے گی، لیکن وقت نکلنے کے بعد جائز نہیں، کیوں کہ اس کی قضا نہیں۔ عذر کی قید اس لیے لگائی کہ بغیر عذر پہلے دن سے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

❁❁❁

عید کی نماز کے لیے عیدگاہ کا وقف ہونا

سوال نمبر(7):

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عیدگاہ کی زمین اگر باقاعدہ طور پر وقف نہ ہو تو اس میں نماز پڑھنا درست نہیں، حالانکہ بعض فتاوٰی میں نقل کیا گیا ہے کہ عیدگاہ میں نماز پڑھنے کی صحت اس کے وقف ہونے پر موقوف نہیں، بلکہ غیر موقوفہ زمین پر بھی عید کی نماز ہو جاتی ہے۔ وضاحت فرمائیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضورﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات سے نوازا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پوری روئے زمین حضورﷺ کی امت کے لیے مسجد بنائی گئی ہے، لہٰذا نماز کی ادائیگی صرف مسجد تک خاص نہیں، بلکہ زمین کے کسی بھی حصہ کو نماز کے لیے بروئے کار لانا درست ہے ۔

صورتِ مسئولہ میں عیدین کی نماز کے لیے وقف زمین کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ جس طرح جمعہ اور دیگر نمازیں وقف مساجد کے علاوہ دوسری جگہ پڑھی جاسکتی ہیں، اسی طرح عید کی نماز بھی کسی چمن، صحرا یا میدان میں پڑھنا جائز ہے، اگرچہ وقف نہ ہو، تاہم عید کی نماز کے لیے باقاعدہ جگہ وقف ہو تو زیادہ مناسب ہے۔

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوۃ العیدین: ۲/۲۸۵

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال:قال رسول اللّٰہ ﷺ: "جعلت لي الأرض مسجداً وطهوراً".(١)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ:"میرے لیے پوری زمین (نماز کی جگہ) مسجد اور پاک بنائی گئی ہے"۔

الخروج إلى الجبانة في صلوة العيد سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع على هذا عامة المشايخ وهو الصحيح.(٢)

ترجمہ: عید کی نماز ادا کرنے کے لیے صحرا کی طرف نکلنا سنت ہے،اگرچہ جامع مسجد میں لوگوں کی گنجائش ہو، عام مشائخ کا یہی قول ہےاور یہ صحیح ہے۔

❁❁❁

عید کی نماز ایک دن مؤخر کرنا

سوال نمبر(8):

برف باری کی وجہ سے ہم نے عید الفطر کی نماز پہلے دن کی بجائے دوسرے دن پڑھی،شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عید الفطر کی نماز پہلے دن،یعنی یکم شوال کے ساتھ خاص ہے،البتہ کسی عذر کی وجہ سے پہلے دن نمازِ عید چھوٹ گئی تو دوسرے دن زوال تک پڑھنے کی گنجائش ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وتؤخر بعذر)، كمطر(إلى الزوال من الغد فقط).(٣)

ترجمہ: عید الفطر کی نماز کسی عذر بارش وغیرہ کی وجہ سے اگلے دن زوال تک مؤخر کی جاسکتی ہے۔

---

(١) سنن النسائي،كتاب الغسل والتيمم،باب التيمم بالصعيد:١/٤٨،٤٩

(٢) الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب السابع عشر في صلوة العيدين:١/١٥٠

(٣) الدرالمختار على صدر ردالمحتار،كتاب الصلوة،باب العيدين:٣/٥٩

فصل في أحكام العيدين

(عیدین کے احکام کا بیان)

عید کی نماز میں سجدۂ سہو چھوڑنے پر نماز کا حکم

سوال نمبر(9):

اگر امام عید کی نماز میں دوسری رکعت کی تکبیرات بھول کر رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں تکبیرات یاد آنے پر دوبارہ کھڑا ہو کر تکبیرات کہنے کے بعد رکوع میں چلا جائے اور نماز کے آخر میں سجدۂ سہو بھی ادا نہ کرے تو اس کی نماز صحیح ہو گی یا نہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

واضح رہے کہ عید کی نماز میں زائد تکبیریں پڑھنا واجب ہے، اگر امام تکبیرات بھول کر رکوع میں چلا جائے یا اس کو اپنے موقع کے علاوہ دوسرے مواقع میں ادا کرے تو اس پر سجدہ سہو لازم آتا ہے، تاہم کثرت ہجوم کی وجہ سے اگر لوگوں کے نماز میں فساد کا خطرہ ہو تو پھر سجدہ سہو ساقط ہو جاتا ہے۔

مسئولہ صورت میں جب امام تکبیرات بھول کر رکوع میں چلا گیا تو مناسب یہ تھا کہ وہ رکوع سے دوبارہ نہ لوٹے، لیکن اگر اس نے یاد آنے پر دوبارہ قیام کی طرف لوٹ کر تکبیرات ادا کیے تو اس پر سجدہ سہو لازم ہو گیا، تاہم اگر امام کثرت ہجوم کی بنا پر سجدہ سہو ادا نہ کرے تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ سجدہ سہو ادا کرنے سے نماز میں فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔

والدّليل على ذلك:

مشايخنا قالوا: لايسجد للسهو في العيدين، والجمعة؛ لئلا يقع الناس في فتنة.(١)

ترجمہ: ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ عیدین اور جمعہ کی نماز میں (امام) سجدہ سہو نہ کرے، تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں۔

❁❁❁

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوٰة، الباب الثاني عشر في سجود السهو: ١/١٢٨

عید کی نماز میں حدث لاحق ہونا

سوال نمبر(10):

ایک آدمی کو عید کی نماز میں حدث لاحق ہو جائے، اب اگر وہ وضو کے لیے چلا جائے تو اس سے جماعت فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو یہ شخص کیا طریقہ اختیار کرے؟ وضو کے لیے جانے کی صورت میں اگر جماعت فوت ہو جائے تو پھر یہ شخص اس کی قضا کرے گا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جس شخص کو عیدین کی نماز میں حدث لاحق ہو جائے، اگر پانی موجود ہو، لیکن وضو میں مشغول ہونے کی وجہ سے جماعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اُس وقت صرف تیمم کرنے پر اکتفا کرے۔ اور اگر امام کی اقتدا میں ایک رکعت پانا ممکن ہو تو ایسی صورت میں اُس کے لیے تیمم کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(أو عيد) أي يجوز التيمم لخوف فوت صلاة عيد......وإن كان المقتدي بحيث يدرك بعضها مع الإمام لو توضأ لايتيمم.(۱)

ترجمہ:

اور عید کی نماز فوت ہونے کی وجہ سے تیمم جائز ہے۔۔۔اور اگر وہ مقتدی اس حال میں ہو کہ اگر وہ وضو کرے تو امام کے ساتھ بعض نماز پا سکتا ہے تو وہ تیمم نہیں کرے گا۔

❁❁❁

عید کے دن نفل نماز پڑھنا

سوال نمبر(11):

فقہ کی کتابوں میں عید کے دن نوافل پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ یہ کراہت عیدگاہ کے ساتھ خاص

(۱) تبیین الحقائق، کتاب الطهارة، باب التيمم:۱/۱۳۱

ہے یا جس مسجد میں عید کی نماز ادا ہوتی ہے، وہاں بھی نوافل پڑھنا مکروہ ہے؟ نیز کراہت کا یہ حکم کس وقت تک ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

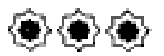
عید کے دن عید کی نماز سے پہلے نفل پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، چاہے گھر میں ہو، مسجد میں ہو، یا عیدگاہ میں، البتہ عید کی نماز کے بعد نوافل پڑھنے کی کراہت اُس جگہ کے ساتھ خاص ہے جہاں عید کی نماز ادا ہوتی ہو، کیونکہ اس میں عید کی نماز پر زیادتی کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر عید کی نماز کے بعد مسجد میں نوافل زوال تک پڑھنا مکروہ رہے گا، تاہم زوال کے بعد نوافل مکروہ نہیں ہوں گے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولا یتنفّل قبلها مطلقًاو کذا)لا یتنفّل(بعدها في مصلّاها) فإنّه مکروه عند العامة. قال ابن عابدین:حتیٰ أن المرأة إذا أرادت صلاة الضحیٰ یوم العید تصلیها بعد مایصلّي الإمام.(۱)

ترجمہ:

اور عید کی نماز سے پہلے مطلقاً نفل پڑھنا مکروہ ہے۔۔۔اور (عید کی نماز کے بعد عیدگاہ میں) نفل نہ پڑھے، کیونکہ عام علما کے نزدیک مکروہ ہے۔ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ’’کہ عورت اگر عید کے دن چاشت کی نماز کا ارادہ کرے تو یہ عورت نفل اُس وقت پڑھے گی جب امام عید کی نماز سے فارغ ہو چکا ہو‘‘۔



عید کی نماز کا رکوع رہ جانا

سوال نمبر(12):

عید کے ایک بڑے اجتماع میں بعض افراد جو امام کے ساتھ ابتداے نماز میں شریک تھے، لیکن پہلی رکعت کا رکوع امام کے ساتھ ادا نہ کر سکے، گویا باقی نماز تو مکمل ادا کی، لیکن رکوع رہ گیا۔ رکوع رہ جانے کی وجہ سے مذکورہ لوگوں کی نماز ہوگئی یا نہیں؟ نماز کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

(۱) ردالمحتار علي در المختار، کتاب الصلاة، باب العیدین، مطلب یطلق المستحب علیٰ السنة وبالعکس: ۳/ ۵۰،۵۱

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز کے ارکان اور شرائط میں سے اگر کوئی رکن یا شرط رہ جائے تو نماز مکمل نہیں ہوتی اور اس کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔نماز چاہے فرض ہو،واجب ہو یا نفل ہو۔

مذکورہ صورت میں جن لوگوں نے رکوع نہیں کیا،توان کی نماز نہیں ہوئی،لیکن عید کی نماز جماعت کے ساتھ واجب ہے،اس لیے انفرادی طور پر اعادہ درست نہیں اور عید کی نماز فوت ہو جانے کی صورت میں قضا بھی لازم نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من فرائضها التي لا تصح بدونها (التحريمة) قائما (وهي شرط...... منها الركوع).(۱)

ترجمہ:

نماز کے ان فرائض جن کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی،میں سے کھڑے ہوکر تکبیرِ تحریمہ پڑھنا ہے اور یہ (تکبیرِ تحریمہ) شرط ہے۔۔۔۔ان(شرائط) میں سے رکوع بھی ہے۔

(ولا يصليها وحده إن فاتت مع الإمام) ولو بالإفساد إتفاقاً في الأصح.(۲)

ترجمہ:

اصح اور متفق قول کے مطابق عید کی نماز اگر امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو تو انفرادا ادا نہیں کرے گا،اگر چہ یہ نماز قصداً فاسد کی گئی ہو۔

❁❁❁

مسجد میں عید کی نماز پڑھنا

سوال نمبر(13):

عید کی نماز مسجد میں پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ جبکہ حضور ﷺ تو عذر کے بغیر عید کی نماز مسجد نبوی میں نہیں پڑھایا کرتے تھے،بلکہ عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے تھے؟

بیّنوا تؤجروا

---

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب صفۃ الصلوۃ:۲/۱۲۷۔۱۳۳

(۲) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب العیدین:۳/۵۸

الجواب وباللہ التوفیق:

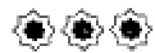
عیدین کی نماز واجب ہے اور اس کے لیے کھلے میدان میں نکل کر ادا کرنا سنت ہے، اگرچہ مسجد میں زیادہ نمازیوں کی گنجائش بھی پائی جاتی ہو، اس لیے بہتر یہ ہے کہ عیدگاہ میں پڑھی جائے، بغیر کسی عذر کے عید کی نماز مسجد میں پڑھنا خلافِ سنت ہے، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے عیدگاہ میں پڑھنا مشکل ہو تو مسجد میں پڑھنا بھی جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي التجنيس :والخروج إلى الجبانة سنة لصلاة العيدوإن كان يسعهم المسجدالجامع عندعامة المشايخ هو الصحيح.....لو صلىٰ العيد في الجامع،ولم يتوجه إلى المصلى، فقدترك السنة.(۱)

ترجمہ:

تجنیس نامی کتاب میں ہے کہ عام مشائخ کے ہاں عید کی نماز کے لیے صحرا کی طرف نکلنا سنت ہے، اگرچہ جامع مسجد میں وسعت ہو۔۔۔اگر کسی نے عید کی نماز مسجد میں پڑھی اور عیدگاہ کا رخ نہیں کیا تو اس نے سنت چھوڑ دی۔



قبرستان میں عیدگاہ بنانا

سوال نمبر(14):

ہمارے گاؤں کے قبرستان میں ایک خالی جگہ ہے جس کو عوام نے عیدگاہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔اس سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر قبریں ہیں۔اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ مقبرہ کی حدود میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ ازروئے شریعت اس کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے مقبرہ میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن اگر نماز پڑھنے کی جگہ مقبرہ سے الگ ہو اور گندگی وغیرہ بھی نہ ہو اور قبریں اتنے فاصلے پر ہوں کہ ان پر نمازیوں کی نظر نہ پڑتی ہو یا قبریں قریب ہوں، مگر نمازیوں اور قبروں کے

(۱) البحر الرائق، كتاب الصلوة، باب صلوة العيدين،تحت قوله:(ثم يتوجه إلى المصلى):۲/۲۷۸

درمیان فاصلہ ہو تو پھر بلا کراہت جائز ہے۔ کراہت کی علت تشبیہ ہے جو فاصلہ کی وجہ سے ختم ہوگی تو علت کے منتفی ہونے کی وجہ سے معلول، یعنی کراہت بھی منتفی ہوگئی۔

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی عیدگاہ سے قبریں بیس پچیس گز کے فاصلے پر ہوں تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ کوئی دیوار بنائی جائے، یہ زیادہ مناسب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وتكره الصلوة في المقبرة إلاأن يكون فيها موضع أعدّ للصلوة لا نجاسة فيه ولا قذر فيه ...... لأن الكراهة معللة بالتشبه وهو منتف حنيئذ......لا تكره الصلوة إلى جهةالقبر إلاإذا كان بين يديه بحيث لوصلى صلاة الخاشعين وقع بصره عليه.(١)

ترجمہ: مقبرہ میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ اگر ایسی جگہ ہو جو نماز کے لیے تیار کی گئی ہو، اس میں نجاست اور گندگی وغیرہ نہ ہو (تو وہاں نماز پڑھنا جائز ہے)۔۔۔۔کیونکہ کراہت کی علت تشبیہ تھی اور وہ اس وقت منتفی ہے۔۔۔۔قبر کی طرف نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، ہاں اگر قبر اس کے سامنے اس طرح ہو کہ خشوع سے نماز پڑھنے والے کی نظر قبر پر پڑتی ہو (تو اس کی طرف نماز پڑھنا مکروہ ہے)۔



عیدالاضحیٰ کی نماز تک کھانے پینے سے رُکنا

سوال نمبر(15):

عیدالاضحیٰ کے دن بعض لوگ عید کی نماز تک اپنے آپ کو کھانے پینے سے روکتے ہیں۔ ان میں بعض اس کو روزہ بھی کہتے ہیں۔ برائے مہربانی بتلائیں کہ اس طرح کھانے پینے سے رکنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عیدالاضحیٰ کے دن اپنے آپ کو عید کی نماز تک کھانے پینے سے روکنا مستحب ہے، چونکہ کھانے پینے سے رکنے پر صوم کا اطلاق لغوی یا عرفی طور پر جائز ہے، تاہم یہ وہ روزہ نہیں جو اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اس طرح کھانے پینے

(١) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلوة، فصل في المكروهات: ص: ٢٩٠

سے رُکنا ضروری بھی نہیں، اس لیے جہاں کہیں وجوب کے درجہ میں لوگ ثواب سمجھیں تو ترک بہتر ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وهي أحكام الأضحى لكن هنا يؤخر الأكل) للاتباع فيهما وهو مستحب، ولا يلزم من ترك المستحب ثبوت الكراهة.(۱)

ترجمہ: اور یہی احکامات عیدالاضحیٰ کے بھی ہیں، لیکن عیدالاضحیٰ میں کھانا پینا مؤخر کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس میں اتباع ہے۔ یہ مستحب ہے اور مستحب کے ترک سے کراہت لازم نہیں آتی۔

❁❁❁

ایامِ تشریق کا تعین

سوال نمبر(16):

ایامِ تشریق سے کون سے ایام مراد ہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نو ذی الحجہ کی فجر سے تیرہ ذی الحجہ کے عصر تک ایامِ تشریق کہلاتے ہیں۔ ان میں سے دسویں ذی الحجہ خاص طور پر قربانی سے متعلق ہے اور تیرھویں ذی الحجہ کا ایامِ تشریق سے خاص تعلق ہے۔ درمیان کے دو دن یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحجہ قربانی اور تشریق کے مشترکہ ایام ہیں۔ اس حساب سے تین دن ایام قربانی کے اور تین دن ایام تشریق کے بن جاتے ہیں، لیکن ایام قربانی کو بھی تشریق کے ساتھ ملانے سے مجموعی طور پر تشریق کے ایام پانچ بن جاتے ہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

أيام النحر ثلاثة، وأيام التشريق ثلاثة ......العاشر من ذي الحجة للنحر خاصة، والثالث عشر للتشريق خاصة، واليومان فيما بينهما للنحر والتشريق جميعاً.(۲)

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوة، باب صلوة العیدین: ۲/۲۸۴

(۲) البحرالرائق، کتاب الصلوة، باب صلوة العیدین، تحت قوله: (وسن بعد فجر عرفة): ۲/۲۸۶

ترجمہ:

قربانی کے تین دن ہیں اور تشریق کے بھی تین دن ہیں۔دس ذی الحجہ قربانی کے ساتھ خاص ہے اور تیرھویں ذی الحجہ تشریق کے ساتھ،دودن قربانی اور تشریق دونوں میں مشترک ہیں۔

❁❁❁

عید کی نماز فوت ہو جانا

سوال نمبر(17):

اگر عید کی نماز فوت ہو جائے تو اس کی قضا لانے کا طریق کار کیا ہے؟ اجتماعی طور پر اور انفرادی طور پر فوت ہونے کے الگ الگ احکام بتائیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

واضح رہے کہ عید کی نماز اگر کسی عذر کی وجہ سے اجتماعی طور پر فوت ہو جائے تو دوسرے دن بھی اجتماعی طور پر ادا کی جاسکتی ہے،لیکن عید کی نماز اگر مقررہ ایام میں بھی ادا نہیں کی گئی تو پھر اس کی قضا لانا لازم نہیں۔انفرادی طور پر اگر کوئی شخص کسی ایک عیدگاہ میں عید کی نماز ادا نہیں کر سکا تو دوسری عیدگاہ میں ادا کر سکتا ہے،کیونکہ عید کی نماز متعدد جگہوں پر بھی ادا کی جاسکتی ہے،تاہم اگر عید کی نماز سرے سے پڑھی ہی نہیں یا امام کے ساتھ شروع کی مگر فاسد ہو گئی تو پھر علیحدہ قضا نہیں لائی جائے گی۔

والدّليل علىٰ ذلك:

(لم تقض إن فاتت مع الإمام)......وإلا فإذا فاتت مع إمام وأمكنه أن يذهب إلى إمام آخر فإنه يذهب إليه ؛ لأنه يجوز تعدادها في مصر واحد......إذا كان في الوقت، أو خرج الوقت،وما إذا لم يدخل مع الإمام أصلاً، أو دخل معه وأفسدها، فلا قضاء عليه أصلاً.(١)

ترجمہ:

عید کی نماز کی قضا نہیں ہے،اگر چہ امام کے ساتھ فوت ہو گئی ہو۔۔۔۔مگر یہ کہ ایک امام کے ساتھ نہیں

(١) البحرالرائق، كتاب الصلوة،باب صلوة العيدين:٢/٢٨٣،٢٨٤

پڑھی اور ممکن ہو تو دوسرے امام کے پیچھے ادا کرے، کیوں کہ ایک شہر میں متعدد جگہوں پر پڑھنا بھی درست ہے۔۔۔۔۔
تاہم اگر وقت میں نہ پڑھ سکا یا وقت نکل گیا یا امام کے ساتھ سرے سے داخل نہیں ہوا یا داخل تو ہوا مگر نماز توڑ دی تو سرے سے قضا ہی نہیں ہے۔

❁❁❁

عید کی نماز کے لیے منبر عیدگاہ لے جانا

سوال نمبر(18):

ہم عید کی نماز ادا کرنے کے لیے جب عیدگاہ کا رخ کرتے ہیں تو منبر بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔عید کے خطبہ کے لیے منبر کا استعمال از روئے شرع کیسا ہے؟

اور منبر کے بغیر خطبہ دینے کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام نے منبر عیدگاہ ساتھ لیجانے کو خلاف سنت لکھا ہے۔ہاں اگر عیدگاہ میں مستقل طور پر منبر نصب ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔حضور ﷺ اونٹنی پر کھڑے ہو کر عید کا خطبہ دیا کرتے تھے۔اگر منبر کے بغیر خطبہ دینا جائز نہ ہوتا تو پھر حضور ﷺ ایسا کیوں کرتے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کا بغیر منبر کے خطبہ دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منبر کے بغیر خطبہ دینا جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولا یخرج المنبر في العیدین؛ لما روینا أن النبي ﷺ لم یفعل ذلك،وقد صح أنه کان یخطب في العیدین علی ناقته.(۱)

ترجمہ:

عیدین میں منبر ساتھ نہیں لے جانا چاہیے،اس لیے کہ حضور ﷺ نے ایسا نہیں کیا اور صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ

(۱) بدائع الصنائع،کتاب الصلوۃ،فصل فیمایستحب في یوم العید:۲/ ۲۵۰

اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عیدین فرمایا کرتے تھے۔

❁❁❁

ایک شہر میں عید کی نماز متعدد مقامات پر پڑھنا

سوال نمبر(19):

کیا عید کی نماز بھی جمعہ کی نماز کی طرح متعدد مقامات پر ادا کی جاسکتی ہے؟ علمائے کرام سے یوں سنا ہے کہ جمعہ کی نماز مفتی بہ قول کے مطابق متعدد مقامات پر پڑھی جاسکتی ہے۔کیا عید کی نماز کا متعدد مقامات پر پڑھنے کا بھی یہی حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی ایک شہر میں جمعہ کی نماز متعدد مقامات پر ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں۔اس مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے،تاہم مفتی بہ قول کے مطابق جمعہ کی نماز متعدد مقامات پر ادا کی جاسکتی ہے،لیکن عید کی نماز کے متعدد جگہوں پر ادا کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔فقہائے کرام کی تصریح اور متفقہ رائے کے مطابق عید کی نماز متعدد مقامات پر ادا کرنا جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لأنه يجوز تعدادها في مصرواحد في موضعين وأكثراتفاقاً، إنماالخلاف في الجمعة.(١)

ترجمہ:

چنانچہ بالاتفاق عید کی نماز کسی ایک شہر میں دو الگ الگ جگہوں پر یا متعدد مقامات پر ادا کرنا جائز ہے،البتہ اختلاف صرف جمعہ کی نماز میں ہے۔

❁❁❁

(١) البحرالرائق،کتاب الصلوة،باب صلوةالعيدين،تحت قوله:(ولم تقض إن فاتت):٢/٢٨٣

عیدگاہ پر چھت ڈالنا

سوال نمبر(20):

اگر عیدگاہ پر چھت ڈالی جائے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ عیدگاہ کھلا میدان ہوتا ہے۔ اسی طرح عید کی نماز پڑھنا شرعی حکم ہے یا یہ کوئی علاقائی رواج ہے۔ وضاحت کریں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عیدگاہ پر مستقل چھت ڈالنا کسی بھی روایت میں منقول نہیں اور چھت ڈالنے سے مسجد کی طرح بن جائے گی، جبکہ تمام فقہا نے (خروج إلی الجبانۃ) یعنی صحرا کی طرف نکلنے کو سنت لکھا ہے۔ ہاں مستقل طور پر موقوفہ عیدگاہ کے کچھ حصہ پر اگر مصالح عیدگاہ کی خاطر چھت ڈالی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں تک عید کی نماز کا تعلق ہے تو یہ محض علاقائی رسم و رواج نہیں، بلکہ شریعت کی رو سے ہر مقیم اور صحت مند شخص پر واجب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(والخروج إلیها) أي الجبانة لصلوة العید سنة.(۱)

ترجمہ:

عید کی نماز کے لیے (عیدگاہ) صحرا کی طرف نکلنا مسنون ہے۔

وهي واجبة وهو الأصح،هکذا في محیط السرخسي.(۲)

ترجمہ:

اور عید کی نماز صحیح قول کے مطابق واجب ہے، اسی طرح سرخسی کی کتاب محیط میں منقول ہے۔

❁❁❁

---

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب العیدین:۳/۴۹

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوۃ، الباب السابع عشر في صلوۃ العیدین:۱/۱۴۹

عیدالفطر کی نماز مؤخر کرنا

سوال نمبر(21):

اگر عیدالفطر کی نماز کسی عذر کی وجہ سے رہ جائے تو کب تک مؤخر کی جاسکتی ہے؟ اگر عیدالفطر اتوار کے دن ہو، مگر کسی عذر کی بناپر نماز ادا نہ ہوسکی تو اب یہ نماز تیسرے دن، یعنی منگل کو ادا کی جاسکتی ہے یانہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

عیدالفطر کی نماز اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے پہلے دن ادا نہ ہوسکی تو دوسرے دن ادا کرنے کی گنجائش ہے اوراس کے بعدادانہیں کی جاسکتی۔عذر کی قیداس لیے لگائی گئی کہ بغیر عذر کے مؤخر کرنا درست نہیں۔اگر بغیر کسی معقول عذر کے پہلے دن ادانہیں کی تو پھر دوسرے دن ادا کرنا جائز نہیں، تاہم عذر کی وجہ سے دوسرے دن تک مؤخر کرنے کی گنجائش ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عید کی نماز منگل کو پڑھنا جائز نہیں، اس لیے کہ منگل تیسرا دن ہے اور تیسرے دن تک عیدالفطر کی نماز مؤخر کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

بخلاف تأخیر عید الفطر لغیرعذر، فإنه لا یجوز ولا یصلي بعده،فالتقیید بالعذر هنالنفي الکراهة،و في عید الفطر للصحة.(۱)

ترجمہ:

اور بغیر عذر عیدالفطر کی نماز کا مؤخر کرنا (اس کا حکم ماقبل سے مختلف ہے) کیونکہ یہ جائز نہیں اور نہ بعد میں پڑھنا جائز ہے۔تو عذر کی قید وہاں (عیدالاضحیٰ میں) کراہت کی نفی کی وجہ سے ہےاور عیدالفطر میں صحت کی وجہ سے ہے۔ یعنی بغیر عذر کے مؤخر کرنے سے نماز صحیح نہیں ہے۔

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃالعیدین،تحت قوله: (وتؤخربعذرإلی ثلاثة ایام):۲/۲۸۵

ویصلی غدا بعذر لا بعده.(۱)

ترجمہ:

اور عذر کی وجہ سے دوسرے دن ادا کی جائے گی، اس کے بعد نہیں۔

❁❁❁

عید کے دن زیارتِ قبور اور ارواح کے انتظار کا عقیدہ رکھنا

سوال نمبر(22):

عید کے دن قبروں پر جانا کیسا ہے؟ نیز بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عید کے دن مُردوں کے ارواح ہمارا انتظار کرتی ہیں، شرعاً یہ عقیدہ رکھنا کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رو سے قبرستان جانا ایک مستحب امر ہے، عید کا دن خوشی ومسرّت کا دن ہوتا ہے۔ عموماً خوشی میں انسان آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور زیارتِ قبور اس غفلت کے لیے ایک بہترین اکسیر ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص عید کے دن قبرستان چلا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر قبرستان جانے کا اہتمام اس قدر ہو جس سے یہ شبہ ہو کہ یہ ایک لازمی وضروری امر ہے یا شریعت میں مطلوب ہے تو پھر قبرستان جانا جائز نہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عید کے دن مُردوں کے ارواح رشتہ داروں کا انتظار کرتی ہیں، یہ بات کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

أفضل أيام الزيارة أربعة: يوم الاثنين، والخميس، والجمعة، والسبت ....وكذلك في الأزمنة المتبركة، كعشر ذي الحجة، والعيدين، وعاشوراء.(۲)

---

(۱) شرح الوقاية، كتاب الصلوة، باب العيدين: ۱/۲۰۳

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيارة القبور: ۵/۳۵۰

ترجمہ:

زیارتِ قبور کے لیے افضل ایام چار ہیں۔پیر،جمعرات،جمعہ اور ہفتہ کا دن۔۔۔۔اور اسی طرح متبرک اوقات،مثلاً:ذی الحجہ کے پہلے دس دن،عیدین اور عاشوراء(کے دن زیارت افضل ہے)۔

❁❁❁

''تکبیراتِ تشریق'' کب اور کس پر واجب ہیں؟

سوال نمبر(23):

''تکبیرات تشریق'' کتنے دن تک پڑھنی چاہییں؟اور کن لوگوں پر پڑھنا واجب ہے؟اور''تکبیراتِ تشریق'' کے الفاظ کیا ہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

''تکبیراتِ تشریق'' ۹ذی الحجہ تا۱۳ذی الحجہ ہرفرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے۔احنافؒ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق مقیم،مسافر،شہری،دیہاتی مرد اور عورت سب پر واجب ہے،تاہم عورتیں پست آواز کے ساتھ پڑھیں گی۔''تکبیراتِ تشریق'' کے الفاظ یہ ہیں:

"اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر لاإلٰہ إلّا اللّٰہ و اللّٰہ أکبر،اللّٰہ أکبر وللّٰہ الحمد"

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ویجب تکبیر التشریق) في الأصحّ للأمر بہ (مرّۃ).....ولو منفرداً،أو مسافراً،أو امرأۃ؛ لأنّہ تبع للمکتوبۃ (إلی) عصر الیوم الخامس (آخر أیّام التشریق، وعلیہ الاعتماد).(۱)

ترجمہ:

اور صحیح قول کے مطابق''تکبیراتِ تشریق'' کا ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے،اگرچہ وہ منفرد ہو یا مسافر ہو یا عورت ہو،کیونکہ(یہ تکبیر پڑھنا)فرض نمازوں کے تابع ہے،پانچویں دن عصر کی نماز تک (ایامِ تشریق کے آخر تک) پڑھنا چاہیے اور اسی قول پر اعتماد ہے۔

(۱) الدر المختار علی صدر ردالمحتار،کتاب الصلاۃ،باب العیدین:۳/۶۱۔۶۴

عیدگاہ میں نمازِ عید

سوال نمبر(24):

جامع مسجد میں وسعت کے باوجود عیدگاہ میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟اور جولوگ عید کی نماز عیدگاہ کی بجائے جامع مسجد میں پڑھتے ہیں،ان کی نماز کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

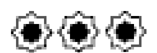
الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام نے نماز جمعہ کے انعقاد کے لیے جوشرائط مقرر کی ہیں۔وہی شرائط عید کی نماز کے لیے بھی ہیں۔ کسی گاؤں یا بستی میں شرائط جمعہ پائے جانے کی صورت میں متعدد مساجد میں عید کی نماز درست ہے،جس طرح کہ ایک جگہ میں پڑھنا درست ہے۔لیکن سنت یہ ہے کہ اہل علاقہ اجتماعی طور پر ایک عیدگاہ میں نماز پڑھنے کا اہتمام کریں،اس لیے اگر عیدگاہ میسر ہوتو بشرط امکان عیدگاہ میں اکھٹے نماز پڑھنا اتفاق واتحاد اور آپس کی الفت ومحبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا،لیکن جولوگ عیدگاہ کی بجائے جامع مسجد میں نماز پڑھتے ہیں،ان کی نماز بھی درست ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي التجنيس والخروج إلى الجبانة سنة لصلاة العيدوإن كان يسعهم المسجدالجامع عندعامة المشايخ هوالصحيح......لوصلىٰ العيد في الجامع،ولم يتوجه إلى المصلىٰ، فقدترك السنة.(۱)

ترجمہ: تجنیس نامی کتاب میں ہے کہ عام مشائخ کے ہاں عید کی نماز کے لیے صحرا کی طرف نکلنا سنت ہے،اگرچہ جامع مسجد میں وسعت ہو۔۔۔اگر کسی نے عید کی نماز مسجد میں پڑھی اور عیدگاہ کا رخ نہیں کیا تو اس نے سنت چھوڑ دی۔



رکوع میں تکبیراتِ عید

سوال نمبر(25):

اگر امام عید کی نماز کی تکبیراتِ زوائد بھول جائیں تو اعادہ کی کیا صورت ہوگی،کیونکہ ان تکبیرات کا محل پہلی

(۱) البحرالرائق،کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ العیدین،تحت قولہ:(ثم یتوجہ إلی المصلی):۲/۲۷۸

رکعت میں قرأت سے پہلے ہے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے ہے۔کیا اپنے محل کے علاوہ بھی ان کا اعادہ ممکن ہے؟ وضاحت کریں۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ تکبیراتِ زوائد یا تکبیرات عیدین واجب ہیں،اس لیے ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔اگر کہیں امام تکبیرات بھول جائیں اور قرأت شروع کرے تو قرأت کے بعد بھی کہی جا سکتی ہیں۔اگر قرأت کے بعد بھی تکبیرات نہیں کہے تو رکوع میں جا کے کہہ لیں۔اسی طرح دوسری رکعت کی تکبیرات بھی اگر کہیں قرأت کے بعد نہ کہہ سکے تو رکوع میں جا کے کہہ سکتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذانسی الإمام تکبیرات العید حتیٰ قرء ،فإنه یکبر بعد القراء ۃ أوفي الر کوع مالم یر فع رأسه.(۱)

ترجمہ:

اگر امام عید کی تکبیرات کہنا بھول جائیں، یہاں تک کہ قرأت پڑھ لی تو قرأت کے بعد پڑھے گا یا رکوع میں (پڑھے گا) جب تک سر نہ اٹھائے۔

❁❁❁

عید کے دن خواتین کا گھر پر نفل پڑھنا

سوال نمبر(26):

عید کے دن عورت گھر پر نفل نماز پڑھ سکتی ہے یا نہیں؟ کیا مردوں کی طرح خواتین کے لیے بھی نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھنا مکروہ ہے یا خواتین کا حکم مردوں سے الگ ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کے دن نماز سے پہلے مطلقاً نفل پڑھنا جس طرح مردوں کے لیے مکروہ ہے،اسی طرح عورتوں کے لیے

(۱)الفتاویٰ الھندیة ،کتاب الصلوۃ، الباب السابع عشرفي صلوۃالعیدین:۱/۱۵۱

بھی مکروہ ہے اور نماز پڑھ لینے کے بعد عیدگاہ یا مسجد میں پڑھنا مکروہ ہے، تاہم نماز کی ادائیگی کے بعد گھر میں پڑھ لینے میں کوئی قباحت نہیں۔لہٰذا جس طرح مردوں کے لیے نماز عید کے بعد گھر میں نفل پڑھنا جائز ہے،اسی طرح خواتین کے لیے بھی جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولا یتنفل قبلها مطلقا......وکذا) لا یتنفل (بعدها في مصلاها) فإنه مکروه عند العامة (وإن تنفل بعدها (في البیت جاز) قال ابن عابدین تحت قوله:(یتعلق بالتکبیر والتنفل) حتیٰ أن المرأة إذا أرادت صلوة الضحیٰ یوم العید تصلیها بعد ما یصلي الإمام في الجبانة.(۱)

ترجمہ: عید کی نماز سے پہلے مطلقاً (عیدگاہ، مسجد اور گھر) میں نفل پڑھنا مکروہ ہے اور اسی طرح عیدگاہ میں نماز کے بعد بھی عام علما کے نزدیک مکروہ ہے، اگر نماز کے بعد گھر میں پڑھ لیں تو جائز ہے۔ابن عابدینؒ (یتعلق بالتکبیر والتنفل) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''عورت اگر عید کے دن چاشت کے نفل پڑھنے کا ارادہ کرے تو تب پڑھے گی، جب امام عیدگاہ میں نماز پڑھانے سے فارغ ہو جائے''۔

❁❁❁

عید کی نماز کی بجائے نفل نماز باجماعت پڑھنا

سوال نمبر(27):

ایک بستی میں نماز عید کی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے وہاں کے باشندگان مسجد میں اکٹھے ہو کر باجماعت نفل نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا عید کے دن اس عمل کا کوئی ثواب ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جہاں عید کی نماز کی شرائط پائی جاتی ہوں، وہاں عید کی نماز پڑھنا واجب ہے اور جہاں شرائط مفقود ہوں، وہاں نماز عید کی جگہ نفل نماز باجماعت پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ نفل نماز عید کی نماز کا قائم مقام نہیں بن سکتی۔دوسری بات یہ ہے کہ نفل نماز کے لیے اعلانیہ طور پر لوگوں کو بلا کر اجتماعی طور پر ادا کرنا سوائے تراویح کے مکروہ ہے، البتہ انفرادی طور پر

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلوۃ،باب العیدین، مطلب:یطلق المستحب علی السنة وبالعکس: ۵۰/۳

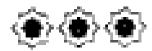
اپنے اپنے گھروں میں اشراق کی نماز پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ چند لوگوں کا اجتماعی طور پر یہ عمل کرنا اور باقاعدہ لوگوں کو اس کی دعوت دینا مکروہ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولا يصلي تطوعاً بجماعة إلا قيام رمضان، وحكي عن شمس الأئمة السرخسيؒ أن التطوع بالجماعة على سبيل التداعي مكروه.(۱)

ترجمہ:

رمضان کی تراویح کے علاوہ نفل نماز باجماعت نہیں پڑھے گا۔ شمس الائمۃ امام سرخسیؒ سے منقول ہے کہ نفل نماز باجماعت اعلانیہ طور پر پڑھنا مکروہ ہے۔



تکبیراتِ زوائد بھول جانا

سوال نمبر(28):

اگر امام عید کی پہلی رکعت کی تکبیرات بھول جائے اور فاتحہ شروع کرنے کے بعد یا سورت شروع کر لینے کے بعد یاد آجائیں تو کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کی نماز کی پہلی رکعت کی تکبیرات قرأت شروع کرنے سے پہلے کہی جاتی ہیں۔ اگر امام تکبیرات بھول جائے اور فاتحہ شروع کرے یا فاتحہ پوری کر لے لیکن سورت شروع کرنے سے پہلے تکبیرات یاد آجائیں تو اولاً تکبیرات کہے اور فاتحہ از سر نو پڑھے، اگر سورت بھی شروع کر لی ہے تو یاد آنے پر سورت پوری کرنے کے بعد رکوع سے پہلے یا رکوع میں تکبیرات پوری کر لے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذا نسي الامام تكبيرات العيد حتى قرء، فإنه يكبر بعد القراءة أو في الركوع مالم يرفع

---

(۱) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الصلوة، الفصل الثالث عشر في التراويح، نوع آخر في المتفرقات: ۱/۴۸۷. (۱)

رأسه.(۱)

ترجمہ: جب امام تکبیراتِ عید بھول جائے، یہاں تک کہ قرأت شروع کرے تو قرأت کے بعد تکبیرات کہے گا یا رکوع میں کہے گا، جب تک رکوع سے سر نہ اٹھایا ہو۔

❁❁❁

نمازِ عید کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال نمبر(29):

عید کا خطبہ دینے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جاتی ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کی نماز کے بعد دعا مانگنا جائز ہے، لیکن خطبہ کے بعد ثابت نہیں، کیونکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام اجمعین سے اس کی بابت کوئی روایت منقول نہیں، لیکن نماز کے بعد دعا کی فضیلت کے عمومی نصوص کو دیکھ کر عیدین کی دعا کو اس عموم میں داخل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لہٰذا مطلق نماز کے بعد دعا کی فضیلت اور عید کی نماز کے لیے مسلمانوں کے خروج کے دوران اجتماعی طور پر مسلمانوں کے دعا مانگنے کے ثبوت پر روایات وارد ہونے کی وجہ سے دعا مانگنا مستحب ہے، تاہم اگر کوئی نہ مانگے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن أم عطية قالت: أمرنا أن نخرج الحُيّض يوم العيدين وذوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم......الخ.(۲)

ترجمہ: ام عطیہ نقل کرتی ہیں کہ ہمیں عیدین کے ایام میں حکم دیا گیا تھا کہ ہم حیض والی اور باپردہ عورتوں کو بھی عیدگاہ کی طرف نکالیں، تاکہ مسلمانوں کی جماعت اور اجتماعی دعا میں حاضر ہوسکیں۔

❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين: ۱/۱۵۱

(۲) الخطيب، ولي الدين محمد بن عبدالله، مشكوة المصابيح، كتاب الصلوة، باب صلوة العيدين، الفصل الأول: ۱/۱۳۸

تکبیراتِ تشریق کا چھوٹنا

سوال نمبر(30):

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ایامِ تشریق کی تکبیرات پڑھنا واجب ہے۔تو سوال یہ ہے کہ اگر تکبیرات چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

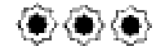
تکبیراتِ تشریق کے لیے ایامِ تشریق متعین ہیں اور ایامِ تشریق میں بھی یہ تکبیرات فرض نمازوں کے ساتھ خاص ہیں، لہٰذا اگر ایامِ تشریق، یعنی نو ذی الحجہ سے تیرہ ذی الحجہ تک دن گزر جائیں تو پھر پڑھنا واجب نہیں، اسی طرح ان ایام میں بھی اگر نماز کے بعد فوری طور پر نہ پڑھی جائیں، بلکہ اس طرح کوئی حرکت سرزد ہوجائے، جس سے نماز کی حرمت ختم ہوتی ہے تو کسی اور وقت میں پڑھنا واجب نہیں، اس کا کفارہ توبہ واستغفار ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وأما محل أدائه: فدبر الصلوة......حتیٰ لو قهقه، أو أحدث متعمداً ،أو تكلم عامداً أو ساهياً، أو خرج من المسجد......لايكبر؛ لأن التكبير من خصائص الصلوة،حيث لا يؤتیٰ به إلا عقيب الصلوة،فيراعی لإتيانه حرمة الصلوة، وهذه العوارض تقطع حرمة الصلوة فيقطع التكبير.(۱)

ترجمہ:

تکبیر تشریق کا محل نماز کے بعد ہے۔۔۔۔اگر قہقہہ لگایا یا جان بوجھ کر وضو توڑا، قصداً یا بھول کر بات کی یا مسجد سے نکل گیا۔۔۔۔تو تکبیر نہیں پڑھے گا، کیونکہ تکبیرات نماز کے ساتھ اس طرح خاص ہیں کہ ان کو نماز کے ساتھ متصل پڑھے گا، لہٰذا انہیں پڑھتے وقت نماز کی حرمت کا لحاظ بھی رکھا جائے گا اور یہ مذکورہ عوارض نماز کی حرمت کو ختم کرتے ہیں پس تکبیر کو بھی ساقط کریں گے۔



(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في محل أداء التكبير: ۲/۱۶۰،۱۵

عیدین اور ایامِ تشریق میں روزے رکھنا

سوال نمبر(31):

ایامِ تشریق میں روزے رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت ہے، اگر ممانعت کے باوجود کوئی رکھ لے تو شرعاً کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

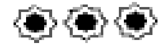
شریعت جس چیز سے روک دے، اس سے رکنا چاہیے، اس میں حکمت اور مصلحت ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر ممنوع چیز کی وجۂ ممانعت بھی ہمیں معلوم ہوجائے۔ ایامِ تشریق اور عیدین اللہ پاک کی طرف سے ضیافت کے ایام ہیں، ان دنوں میں روزہ رکھنا گویا اللہ تعالیٰ کی ضیافت کو نظر انداز کرنا ہے، ایامِ عیدین اور تشریق میں روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔ لہٰذا ممانعت کے باوجود بھی اگر کوئی ان دنوں میں روزہ رکھے گا تو گناہ گار ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

كل صوم ثبت بالسنة طلبه والوعد عليه كصوم داؤد عليه السلام، والنفل ما سوىٰ ذلك مما لم يثبت كراهته، والمكروه تنزيهاً عاشوراء مفرداً عن التاسع، ونحو يوم المهرجان، وتحريماً أيام التشريق والعيدين.(۱)

ترجمہ:

ہر وہ روزہ جس کی طلب سنت سے ثابت ہو، جیسے صوم داؤد۔۔۔۔ اور نفلی وہ روزہ ہے، جو ماقبل کے علاوہ ہو جس کی کراہت ثابت نہ ہو اور مکروہ تنزیہی عاشورہ کا روزہ ہے، جبکہ اس کے ساتھ نو محرم کا روزہ نہ رکھا جائے، اسی طرح یوم مہرجان کا تنہا روزہ اور ایامِ تشریق اور عیدین کا روزہ مکروہ تحریمی ہے۔



---

(۱) البحرالرائق، كتاب الصوم، أقسام الصوم: ۲/۴۴۹، ۴۵۰

تکبیراتِ تشریق کی تعداد

سوال نمبر(32):

تکبیراتِ تشریق نماز کے بعد ایک بار پڑھنا واجب ہے یا تین بار، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تین بار خلافِ سنت ہے، وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

علماے کرام کے مشہور اور مختار قول کے مطابق ایامِ تشریق میں ہر نماز کے بعد مرد کے لیے ایک بار اونچی آواز کے ساتھ اور عورت کے لیے آہستہ آواز سے تکبیرات پڑھنا واجب ہے، تین بار نہیں۔ اس لیے ایک بار پڑھنی چاہیے، تاہم تین بار پڑھنے کو خلافِ سنت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بعض علماے کرام کے ہاں تین بار پڑھنا افضل اور بہتر ہے، اگرچہ راجح قول اول ہی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ثم المشهور من قول علمائناأنه يكبر مرة،وقيل ثلث مرات.(١)

ترجمہ:

ہمارے علما کے مشہور قول کے مطابق تکبیرات ایک مرتبہ پڑھے گا اور کہا گیا ہے کہ تین بار۔

❁❁❁

(١) ردالمحتارعلى الدرالمختار، كتاب الصلوة،باب العيدين،مطلب:يطلق إسم السنة على الواجب،تحت قوله:(وإن زاد): ٦٢/٣

فصل في خطبة العيدين

(عیدین کے خطبہ کا بیان)

عید کے خطبہ میں عجمی الفاظ کا استعمال

سوال نمبر(33):

بعض علاقوں میں عید کے دن خطبہ میں عربی زبان کے ساتھ مقامی زبان (پشتو وغیرہ) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ایسی صورت میں خطبہ کی ادائیگی کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

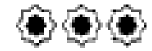
جمعہ وعیدین کے خطبہ میں اُمّت کا یہ تعامل رہا ہے کہ دونوں خطبے عربی زبان میں ادا کیے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پورے خطبے کو غیر عربی زبان میں یا اس کے ساتھ غیر عربی الفاظ پڑھنا جائز نہیں۔خطیب کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو خطبہ کی ادائیگی سے پہلے مقامی زبان میں دینی مسائل سمجھائے اور دورانِ خطبہ غیر عربی الفاظ کے استعمال سے مکمل اجتناب کرے،کیونکہ خطبہ میں عربی کے علاوہ دوسری زبان کے الفاظ استعمال کرنا خلافِ سنت اور مکروہ ہے۔

والدّليل علىٰ ذلك:

فإنّه لا شكّ في أنّ الخطبة بغير العربية خلاف السنّة المتوارثة من النبيّ ﷺ والصحابة، فيكون مكروهاً تحريماً، وكذا قراء ة الأشعار الفارسية، والهندية فيها.(۱)

ترجمہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر عربی زبان میں خطبہ دینا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل شدہ سنّت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہوگا اور اسی طرح فارسی اور ہندی میں اشعار کہنا بھی مکروہ ہوگا۔



(۱) عمدة الرعاية علي هامش شرح الوقاية، كتاب الصلوٰة،باب الجمعة:۱/۲۰۰

عید کے خطبہ کا وقت

سوال نمبر(34):

اگر نمازِ عید سے پہلے خطبہ دیا جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر سرے سے خطبہ نہ دیا جائے تو پھر نماز کا کیا حکم ہوگا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

خطبہ نمازِ عید کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ مسنون ہے، اس لیے اگر کوئی سرے سے خطبہ ہی نہ پڑھے تو بھی عید کی نماز ہو جاتی ہے اور اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ خطبہ نماز کے بعد دیا جائے۔ اگر خطبہ نماز سے پہلے دیا جائے تو اس سے نہ تو نماز فاسد ہوگی اور نہ نماز کا اعادہ ضروری ہے، البتہ خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگا، گویا خطبہ سرے سے دیا ہی نہیں، کیونکہ اس طرح خلافِ سنت خطبہ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ویخطب بعدها خطبتین)......وفي العید لیست بشرط ولهذا إذا خطب قبلها صح، وکره ؛ لأنه خالف السنة، کما لو ترکها أصلا.(۱)

ترجمہ:

(اور نماز کے بعد دو خطبے دے گا)۔۔۔۔عید کی نماز کے لیے خطبہ شرط نہیں، اس لیے اگر خطیب نے خطبہ نماز سے پہلے پڑھا تو نماز درست رہے گی، لیکن یہ فعل مکروہ ہوگا، کیونکہ اس نے سنت کی مخالفت کی (تو یہ اس طرح ہوا) گویا کہ اس نے سرے سے خطبہ ہی چھوڑ دیا۔

❁❁❁❁❁

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ العیدین: ۲/۲۸۳

باب صلوۃ المسافر

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

انسانی زندگی کی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت سفر ہے۔ سفر میں انسان اپنی مانوس و مامون جگہ چھوڑ کر جاتا ہے، راستہ میں خطرات وخدشات پیش آتے ہیں، صحت وزندگی کی بابت بھی خطرات رہتے ہیں اور دینی معمولات کی بھی کماحقہ ادائیگی دشوار ہوجاتی ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے سفر کو عذاب کا ٹکڑا قرار دیا ہے، تاہم دینی اور دنیوی مقاصد کے لیے سفر کرنا چونکہ ایک اہم ضرورت ہے، اس لیے شریعت نے سفر کو ان اعذار میں شمار کیا ہے جن کی وجہ سے احکام میں تخفیف اور سہولت پیدا ہوجاتی ہے، لہٰذا سفر کے دوران موزوں پر مسح کی مدت میں توسیع، نماز میں قصر، روزہ افطار کرنے کی رخصت، جمعہ، جماعت، عیدین، قربانی اور تکبیرِ تشریق کا اسقاط اسی تخفیف کی مثالیں ہیں۔(۱)

سفر کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

سفر کا لغوی معنی ہے ''قطع المسافۃ'' یعنی فاصلہ طے کرنا، کھولنا اور واضح کرنا۔ سفر کے ذریعے بھی مختلف مقامات اور لوگوں کے احوال واضح ہوجاتے ہیں۔ صلوۃ المسافر میں صلاۃ کی اضافت سفر کی طرف "اضافة الشيء الى شرطه" کے قبیل سے ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں سفر کا معنی ہے:

"خروج من عمران الوطن مع قصد سير مسافة مخصوصة".

اپنے وطن کی آبادی سے مخصوص مسافت طے کرنے کی نیت سے نکلنا سفر کہلاتا ہے۔(۲)

صلاۃ المسافر، یعنی قصر کا حکم اور اس کی مشروعیت:

اس پر تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ دوران سفر ظہر، عصر اور عشاء یعنی چار رکعت والی نمازوں میں چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جائے گی۔ اسی کو اصطلاح میں قصر کہتے ہیں۔ فجر اور مغرب کی نماز میں بالاتفاق کوئی تخفیف نہیں۔ قصر کا مذکورہ حکم قرآن کریم کی آیت" واذاضربتم في الارض ......"(النساء:۱۰۱) اور مختلف احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ۱/۱۳۸، قاموس الفقه، مادة سفر: ۴/۱۵۵

(۲) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الصلوة، باب صلاة المسافر: ۳۴۰، ۳۴۱

البتہ اختلاف اس میں ہے کہ تمام چار رکعت پڑھنا، یعنی اتمام کرنا جائز بھی ہے یا نہیں تو اس بارے میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ چار رکعت پڑھنا عزیمت اور بہتر ہے جب کہ دو رکعت پڑھنا رخصت ہے۔ فقہاے کرام کی اصطلاح میں اس کو رخصتِ حقیقی یا رخصت ترفیہی کہتے ہیں جس طرح کہ رمضان میں مسافر کے لیے روزہ رکھنا عزیمت ہے اور افطار کرنا رخصت ہے، تاہم حنفیہ کے ہاں قصر واجب ہے، اتمام سرے سے جائز ہی نہیں، یہاں تک کہ اگر کسی شخص نے چار رکعت ادا کرلی اور دوسری رکعت پر قعدہ نہیں کیا تو حنفیہ کے ہاں یہ نماز بالکل جائز ہی نہیں رہی۔

بعض حنفی فقہاء کرام نے اگرچہ قصر کو رخصت کہا ہے لیکن اس سے مراد رخصتِ اسقاط یا رخصتِ مجازی ہے جو عزیمت کے ہم معنی الفاظ ہیں لہٰذا حنفی فقہا کے اقوال میں یہ اختلاف محض لفظی اختلاف ہے۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: ''مسافر کے حق میں دو رکعت چار رکعت کے بدلے نہیں، بلکہ سفر کی دو رکعت ایک مستقل فرض ہے، لہٰذا چار رکعت کی ادائیگی سخت گناہ اور سنت سے مخالف ہے۔ قصر کے وجوب پر حنفیہ درج ذیل احادیث سے استدلال پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''ابتدا میں تمام نمازیں دو دو رکعتوں میں فرض تھیں، پھر سفر کی نماز اسی طرح باقی رہی اور حضر میں چار رکعت کردی گئی''۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان پر حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں فرض کی ہیں''۔(۱)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سفر کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے انتہائی تاکید سے فرمایا:

"رکعتان رکعتان، من خالف السنة فقد کفر".

(۴) حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی بھی سفر ایسا نہیں فرمایا ہے جس میں فرض نماز دو رکعت کی صورت میں نہ پڑھی ہو''۔(۲)

سفر کی قسمیں اور اس کے احکام:

علامہ کاسانیؒ اور شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ: ''سفر کی تین قسمیں ہیں: سفرِ طاعت، جیسے حج، جہاد اور طلب علم کے لیے سفر کرنا، سفرِ مباح، جیسے تجارت کے لیے سفر کرنا اور سفرِ معصیت جیسے، ڈاکہ زنی وغیرہ کے لیے سفر کرنا۔ پہلی دونوں

(۱) الصحیح للمسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا: ۱/۲٤۱

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في صلوۃ المسافر: ۱/٤٦٣، ٤٦٥

قسمیں بالاتفاق رخصت کے اسباب ہیں بشرطیکہ اس میں دوسری شرائط پائی جائیں، جب کہ تیسری قسم یعنی سفرِمعصیت کے متعلق ائمہ ثلاثہ کی رائے یہ ہے کہ معصیت رخصت اور سہولت کا سبب نہیں بن سکتی، تاہم حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ معصیت کا گناہ اپنی جگہ مسلم ہے، تاہم سبب ہونے میں یہ دوسرے اسباب کے برابر ہے۔(۱)

وطن کی تقسیم وطنِ اصلی، وطنِ اقامت اور وطنِ سکنیٰ کی طرف:

چونکہ آدمی وطن سے نکلنے کے بعد ہی مسافر شمار ہوتا ہے، اس لیے سفر کے احکام کا تذکرہ کرنے سے پہلے وطن کی اقسام کا تذکرہ ضروری ہے۔

وطنِ اصلی :

یہ وہ مکان ہے جس میں انسان مستقل سکونت اختیار کرے اور وہاں سے کوچ کر جانے کا بالکل ارادہ نہ ہو، چاہے وہ اس کا آبائی وطن ہو یا وہ جگہ ہو جہاں اس نے شادی کر کے اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کی ہو یا وہاں شادی کیے بغیر اس نے اپنے اہل وعیال بسائے ہوں اور مستقل رہنے کی نیت کی ہو۔ اگر کسی شخص نے دو شادیاں کی ہوں اور ہر بیوی الگ الگ شہر میں مستقل رہائش پذیر ہو تو یہ دونوں شہر اس کے وطنِ اصلی ہوں گے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے مختلف مقامات پر اپنی مستقل سکونت کے لیے مکانات تعمیر کیے ہوں اور وہاں پر سال کا کچھ حصہ گزارتا ہو تو ایسے تمام مکانات بھی اس کے لیے وطنِ اصلی شمار کیے جائیں گے۔ یعنی وطنِ اصلی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آدمی کی ذاتی ملکیت کا گھر یا زمین ہو بلکہ آبائی وطن ہونے یا مستقل سکونت کی نیت اور اہل وعیال بسانے کی وجہ سے کوئی بھی جگہ وطنِ اصلی ہو سکتی ہے۔

وطنِ اصلی میں اقامت اختیار کرنے کے لیے نیت کی ضرورت نہیں بلکہ بلا نیت ہی آدمی مقیم متصور ہوگا۔ اس کو وطنِ اہلی، وطنِ فطرت اور وطن القرار بھی کہتے ہیں۔

وطنِ اقامت:

وطنِ اقامت وہ جگہ ہے جہاں کم سے کم پندرہ یا اس سے زیادہ دن رہنے کی نیت کی جائے اور وہاں مستقل رہنے کی نیت نہ ہو اور نہ وہاں اس کے اہل وعیال ہوں، بشرطیکہ وہ جگہ اقامت، یعنی سکونت کے قابل بھی ہو۔ حنفیہ کے راجح قول کے مطابق وطنِ اقامت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ وطنِ اصلی سے مدتِ سفر یعنی اڑتالیس میل یا اس سے

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في صلوة المسافر: ۱/ ۴۶۷، مراقي الفلاح، باب صلوة المسافر، ص: ۲۴۱

زیادہ دوری پر ہو بلکہ اڑتالیس میل کے اندر اندر بھی وطن اقامت اختیار کرنا درست ہے۔ اس کو وطنِ سفر، وطنِ مستعار اور وطنِ حادث بھی کہتے ہیں۔(۱)

وطنِ سکنیٰ:

وطن سکنی وہ جگہ ہے جہاں انسان پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت سے رہائش اختیار کرلے اور وہ جگہ اس کا آبائی وطن یا وطن اصلی نہ ہو۔ بعض فقہانے وطن کی صرف دو قسمیں ذکر کی ہیں اور وطن سکنی کو چھوڑ دیا ہے، اس لیے کہ وطن سکنی اگر وطن اصلی سے مدت سفر یعنی اڑتالیس میل کی دوری پر ہو تو یہ بہرصورت سفر کے حکم میں ہے لہٰذا اگر کوئی شخص کسی جگہ میں پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت سے رہائش اختیار کرلے، لیکن بلانیت اس کی رہائش وہاں پر طویل ہو جائے تو وہ بدستور مسافر ہی رہے گا اگر چہ اس کا رہنا کئی سالوں تک ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے تبوک میں بیس دن نماز میں قصر فرمایا تھا۔(۲)

اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نیشا پور کے ایک شہر میں مسلسل دو ماہ تک قصر فرمایا تھا۔(۳)

وطنِ اصلی، وطنِ اقامت اور وطنِ سکنیٰ کے احکام:

وطن اصلی میں نیت کے بغیر ہی آدمی مقیم شمار ہوتا ہے جب کہ وطن اقامت میں نیت کی وجہ سے آدمی مقیم بن جاتا ہے، لہٰذا ان دونوں مواضع میں نماز پوری پڑھی جائے گی اور اقامت کے احکام جاری ہوں گے جب کہ وطن سکنی فقہاء کی محض ایک اصطلاح ہے جس کا احکام پر کوئی اثر نہیں۔

وطن اصلی صرف وطن اصلی سے ختم ہوسکتا ہے، یعنی جب ایک جائے سکونت کو چھوڑ کر مکمل طور پر دوسرے شہر میں سکونت اختیار کرلی جائے اور پہلے وطن کو چھوڑ دینے کا عزم وارادہ ہو (چاہے دونوں جگہوں کے درمیان اڑتالیس میل سے کم کا فاصلہ ہو یا زیادہ)۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بیان مایصیر به المسافر مقیما: ۱/۴۹۷-۴۹۹، مراقي الفلاح، باب صلوۃ المسافر، ص: ۳۴۹، الدر المختار مع رد المحتار، باب صلوۃ المسافر، مطلب في الوطن الاصلي ووطن الإقامة: ۲/۶۱۴

(۲) سنن أبي داؤد، کتاب الصلوۃ، باب إذا قام بأرض العدو: ۱/۱۸۲

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بیان مایصیر به المسافر مقیما: ۱/۴۹۸، مراقي الفلاح، باب صلوۃ المسافر، ص: ۳۴۶، ۳۴۹، ۳۵۰، الدر المختار مع رد المحتار، باب صلوۃ المسافر: ۲/۶۱۵، ۶۱۶

اگر کوئی شخص ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ مستقل سکونت اختیار کرلے لیکن پہلی جگہ میں اس کی اراضی اور مکانات وغیرہ موجود ہوں تو یہ دونوں جگہیں اس کے لیے وطن اصلی شمار ہوں گے۔

وطن اصلی نہ تو وطن اقامت سے باطل ہوتا ہے، نہ وطن سکنی سے، نہ سفر کے ارادے سے اور نہ سفر کرنے سے بلکہ سفر سے لوٹنے کے بعد بلا نیت ہی آدمی مقیم بن جاتا ہے۔(۱)

وطن اقامت تین چیزوں سے باطل ہوتا ہے۔

(۱) وطن اصلی سے یعنی وطن اقامت سے اپنے وطن اصلی کی طرف لوٹ آنے سے۔

(۲) سفر کرنے سے بھی وطنِ اقامت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے کہ وطن اقامت کسی حاجت کے لیے اختیار کیا جاتا ہے لہٰذا وطن اقامت سے محض سفر کر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ضرورت ختم ہوگئی، لہٰذا علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ محض سفر کرنا دلالۃً وطنِ اقامت سے اعراض کرنے اور اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۳) وطن اقامت سے، یعنی کسی اور جگہ کو وطنِ اقامت بنانے کی وجہ سے پہلی جگہ کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اگر چہ دوسری جگہ پہلی جگہ سے اڑتالیس میل کی دوری پر نہ ہو۔

وطن اقامت وطن سکنی سے باطل نہیں ہوتا اس لیے کہ وطن سکنیٰ کی حیثیت وطن اقامت سے کم ہے اور کسی چیز کو منسوخ اور تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تبدیل کرنے والی چیز پہلی چیز سے یا تو زیادہ قوی ہو یا کم از کم اس کے برابر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وطنِ سکنیٰ وطن اصلی، وطنِ اقامت اور سفر کے علاوہ کسی دوسری جگہ کو وطنِ سکنیٰ بنانے سے بھی باطل ہوتا ہے۔

مذکورہ قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن اصلی میں تعدد اور کثرت درست ہے مگر وطنِ اقامت صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ ایک سے زیادہ مواضع وطنِ اقامت نہیں ہوسکتے۔ علامہ کاسانیؒ نے اس باریکی کو سمجھانے کے لیے کئی مثالوں کا سہارا لیا ہے جن میں سے ایک مثال پیش خدمت ہے:

اگر خراسان کا رہنے والا کوئی شخص کوفہ آجائے اور وہاں پر مثال کے طور پر ایک مہینہ رہنے کی نیت کرلے، پھر ایک مہینہ بعد کوفہ سے مقامِ حیرہ منتقل ہو جائے (یاد رہے کہ مقام حیرہ اور کوفہ کا فاصلہ اڑتالیس میل سے کم ہے) اور وہاں پر بھی پندرہ دن یا اس سے زیادہ اقامت کی نیت کرلے تو ایسا شخص اگر حیرہ میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان مايصيربه المسافر مقيما: ۱/ ۴۹۸، ۴۹۹، مراقي الفلاح، باب صلوة المسافر، ص: ۳۴۸ـ ۳۵۰، الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ۱/ ۱۴۲

گزارنے کے بعد واپس خراسان جانا چاہے تو وہ کوفہ سے گزرتے ہوئے نماز میں قصر کرے گا اس لیے کہ کوفہ کی حیثیت وطن اقامت کی تھی جو اس وقت ختم ہوگئی جب اس نے مقام حیرہ میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ اقامت اختیار کرلی (اس لیے کہ وطن اقامت دوسرے وطن اقامت سے ختم ہوجاتا ہے)۔اسی طرح یہ شخص حیرہ سے نکلتے ہی مسافر متصور ہوگا اس لیے کہ وطن اقامت سفر سے بھی ختم ہوتا ہے اور مقام حیرہ سے خراسان تک کا فاصلہ مقدار سفر سے زیادہ ہے۔

تاہم اگر مذکورہ شخص نے مقام حیرہ میں پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت کرلی تو ایسا شخص مقام حیرہ میں بھی اور وہاں سے خراسان جاتے ہوئے کوفہ میں بھی اتمام کرے گا اس لیے کہ مقام حیرہ کو اس شخص نے نہ تو وطن اقامت بنایا ہے اور نہ ہی وہ سفر کی مقدار کے برابر ہے لہٰذا کوفہ کی حیثیت بدستور ''وطن اقامت'' ہی کی رہے گی۔(۱)

بلاشبہ علامہ کاسانیؒ کی مذکورہ مثال سفر کے بے شمار مسائل کو حل کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دو مستقل شہروں کو ملا کر پندرہ دن قیام کرنے کی نیت کرے، اگرچہ ان کے درمیان معمولی فاصلہ ہو جیسے مکہ و منیٰ، اور ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی رات گزارنے کی نیت نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ شہر ''وطن اقامت'' متصور نہیں ہوں گے اور ایسا شخص مسافر ہی رہے گا تاہم اگر ایک جگہ شب باشی کی نیت کرلے اور ارادہ یہ ہو کہ دن کے وقت دوسری جگہ جا کر پھر واپسی ہوگی تو یہ صورت وطن اقامت ہی کی ہوگی اور وہ نمازیں پوری ادا کرے گا۔دو مستقل شہروں سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ایک شہر دوسرے شہر کا اس طور پر تابع نہ ہو جس طرح دیہات شہر کا تابع ہوتا ہے۔علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ جس جگہ رات گزاری جائے اسی جگہ پہنچنے کے بعد آدمی مقیم شمار ہوتا ہے، جہاں پر دن گزارا جائے وہاں اولاً پہنچنے کے بعد آدمی بدستور مسافر ہی رہے گا۔(۲)

ایک وطنِ اقامت میں مال ومتاع باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر اور دوسری جگہ اقامت کا حکم:

علامہ شامیؒ، کاسانیؒ اور شرنبلالیؒ وغیرہ نے مطلق سفر یا کسی دوسری جگہ وطن اقامت بنانے کو پہلے وطنِ اقامت کے لیے مبطل قرار دیا ہے چاہے اس کے باطل کرنے کی نیت ہو یا نہیں اور چاہے وہیں اس کا ساز وسامان موجود ہو یا نہ ہو، تاہم علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا ساز وسامان اور دیگر ضروریات پہلے وطن میں موجود ہوں

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بيان مايصيربه المسافر مقيما: ۱/۴۹۹

(۲) فتاویٰ قاضي خان على الهندية، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ۱/۱۶۶، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المسافر، ص: ۳۴۶

اور وہ واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں سفر کرنے یا کسی دوسری جگہ کو وطنِ اقامت بنانے سے پہلے وطن کی حیثیت متاثر نہیں ہوگی، لہٰذا پہلے والے وطن اقامت میں واپسی کے بعد اس کے لیے دوبارہ اقامت کی نیت ضروری نہیں۔ اپنے بستر اور کتابیں مدرسہ میں چھوڑ کر چھٹیوں کے لیے گھر جانے والے طلبہ کے متعلق یہی حکم ہے۔(۱)

آدمی کب مسافر شمار ہوتا ہے؟

سفرِ شرعی (جس سے احکام میں تخفیف ہوسکے) درج ذیل شرائط پر موقوف ہے۔

(۱) سفر کی نیت کرنا: سفر کی نیت کے بغیر اگر کوئی شخص تمام دنیا کا چکر بھی کاٹ لے تب بھی وہ مقیم شمار ہوگا اور اس پر سفر کے احکام جاری نہیں ہوں گے، جیسے: کوئی شخص اپنے غلام، قرض دار یا دشمن وغیرہ کے پیچھے چلتے ہوئے بلانیتِ سفر سینکڑوں میل طے کرلے تو یہ شخص مسافر شمار نہیں ہوگا۔

سفر کی نیت میں اعتبار متبوع یعنی اس شخص کا ہے جس کی مرضی سے لوگ سفر کر رہے ہوں، لہٰذا بالغ شخص کی موجودگی میں نابالغ بچے، شوہر کی موجودگی میں بیوی، امیر کی موجودگی میں عام سپاہی اور فوجی اور مالک کی موجودگی میں مزدور کی نیت کا اعتبار نہیں، بلکہ سفر کے احکام کا تعلق متبوع کی نیت سے ہوگا۔(۲)

علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ: ''نیت سفر کے لیے تین شرائط ضروری ہیں: سفر کی نیت میں بااختیار ہونا، عاقل بالغ ہونا اور ایسے سفر کی نیت کرنا جو کم از کم تین دن کی مسافت (شرعی مقدار یعنی اڑتالیس میل) کے برابر ہو''۔(۳)

(۲) نیت کے ساتھ ساتھ اپنے شہر یا گاؤں کی آبادی یا فنا یعنی مضافات سے نکلنا بھی ضروری ہے۔ مسافر شمار ہونے کے لیے خروج کے بغیر محض نیت کافی نہیں۔ آبادی اور فنا کی بحث آگے آرہی ہے۔(۴)

(۳) ایسے سفر کی نیت کی ہو جو شرعی مقدار کے برابر ہو۔(۵)

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الصلوة، باب المسافر: ۲/۲۳۹

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في بیان مایصیر به المقیم مسافر: ۱/۴۷۶، الفتاوی الهندية، کتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ۱/۱۳۹

(۳) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المسافر، ص: ۳۴۴، ۳۴۵

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في بیان مایصیر به المقیم مسافر: ۱/۴۷۶، ۴۷۷

(٥) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في بیان مایصیر به المقیم مسافر: ۱/٤٦٧

مسافتِ سفر کی تحقیق:

مفتی اعظم حضرت مولانا شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''سفر شرعی کی مسافت کی تعیین میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب مختلف ہیں۔امام ابوحنیفہؒ کا صحیح اور راجح مذہب یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جائے بلکہ تین دن تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر یا اونٹ کی سواری پر با آسانی طے کر سکے وہی شرعی سفر کی مسافت ہے۔علامہ ابن ہمامؒ کے ہاں بیلوں کی سواری کا بھی یہی حکم ہے اور اونٹ سے بھی قافلہ کا اونٹ مراد ہے تیز رو سانڈنی مراد نہیں اور دن رات چلنا بھی مراد نہیں بلکہ دن کے وقت جس قدر عادۃً متوسط قوت کا آدمی با آسانی چل سکتا ہے وہی مراد ہے جو فقہاء کے ہاں صبح سے زوالِ آفتاب تک ہے۔بعض فقہائے کرام نے فراسخ اور میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے،امام مالکؒ کے ہاں 48 میل ہے کم میں قصر کرنا درست نہیں یہی رائے بعض شوافع اور حنابلہ کی بھی ہے۔مشائخِ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ (63 میل)،بعض نے 18 فرسخ (54 میل) اور بعض نے پندرہ فرسخ (45 میل) کا قول ذکر کیا ہے۔عمدۃ القاری میں 18 فرسخ جبکہ البحر الرائق میں 15 فرسخ پر فتویٰ دیا گیا ہے تاہم علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ تین دن رات کی مسافت جو اصل مذہب ہے وہ راستوں کے اختلاف سے مختلف ہوسکتی ہے،کیوں کہ صاف راستہ میں اگر انسان ایک دن میں سولہ میل چل سکتا ہے تو دشوار گزار راستہ میں بارہ میل بمشکل طے ہوتے ہیں اور پہاڑی علاقوں میں تو آٹھ دس میل بھی طے کرنا مشکل ہوتا ہے،اس لیے میلوں کی تعیین مناسب نہیں،بلکہ جیسا راستہ ہو اس کے انداز سے جس قدر میل با آسانی تین دن میں پیادہ طے ہوسکیں،وہی مسافتِ قصر ہے،لیکن ہندوستان کے عام بلاد میں چونکہ راستے تقریباً مساوی ہیں اس لیے محققین علمائے ہندوستان نے 48 میل انگریزی کو (تقریباً 78 کلومیٹر) مسافتِ قصر قرار دے دیا ہے جو بعض حنفی فقہا کے ہاں 45 میل (15 فرسخ) والے قول کے مطابق بھی ہے اس لیے کہ 45 شرعی میل 48 انگریزی میل سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں رہتے۔مذکورہ قول کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے "یا اهل مكة لا تقصروا الصلوة في ادنى من اربعة برد" اے اہل مکہ چار برید (48 میل) سے کم میں نماز کا قصر مت کرو۔اس روایت کی سند میں اگرچہ ایک راوی ضعیف ہے تاہم تائید کے لیے ضعیف حدیث بھی کافی ہے۔(۱)

(۱) أوزانِ شرعيه ،مسافت سفر كى تحقيق،الهداية مع فتح القدير،باب صلوة المسافر:۲/۲۔۵، بدائع الصنائع،كتاب الصلوة، فصل في بيان مايصيربه المقيم مسافر:۱/۴۷۴۔۴۷۶

مدتِ سفر سے متعلق ضروری اصول:

(۱) سفرِ شرعی کے لیے مقررہ مقدار کو اگر کوئی شخص مسلسل چلتے ہوئے ایک ہی دن میں یا سرعتِ رفتار اور جدید سہولیات کی وجہ سے اس سے کم وقت میں طے کرلے، تب بھی اس کے احکام مسافروں ہی کے ہوں گے۔

(۲) اگر ایک ہی مقام تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہوں، ایک طویل اور دوسرا مختصر، طویل راستہ مسافتِ سفر کو پورا کرتا ہو اور مختصر راستہ اس سے کم ہو تو جس راستے سے سفر کر رہا ہو اسی کا اعتبار ہوگا۔ یہی حکم اس صورت میں بھی ہے جب ایک ہی مقام تک پہنچنے کے لیے بحری راستہ دو دن کا ہو اور برّی راستہ تین دن کا (یا اس کے برعکس معاملہ ہو) تو ایسی صورت میں بھی اعتبار اسی راستے کا ہوگا جس سے سفر کر رہا ہو۔(۱)

شہر کی آبادی اور فنائے شہر سے مراد:

علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر شہر اور فنائے شہر کے درمیان کھیتوں یا باغات کا فاصلہ ہو تو ایسی صورت میں سفر شروع کرنے کے لیے محض شہر کی آبادی یا اس سے متعلقہ قبرستان وغیرہ سے نکل جانا کافی ہے۔ البتہ جہاں تک جمعہ کی بات ہے تو جمعہ چونکہ شہر کے مصالح میں سے ایک مصلحت ہے اور فنا بھی مصالح شہر میں سے ہے، اس لیے شہر اور فنائے شہر کے درمیان اس قدر دوری کے باوجود صحتِ جمعہ کے لیے ایسی فنا کا بھی اعتبار ہوگا۔ اس کے برعکس سفر کی صورت میں اگر فنائے شہر اور شہر کے درمیان کھیتوں یا باغات کا فاصلہ ہو یا تین چار سو قدم کی دوری ہو تو فنائے شہر سے نکلنا ضروری نہیں، اس لیے کہ سفر شہر کے مصالح میں سے نہیں ہے، البتہ اگر فنا شہر کی آبادی سے متصل ہو تو وہاں سے بھی نکلنا ضروری ہے۔(۲)

مسافر کب مقیم شمار ہوتا ہے؟

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: ''مسافر چار چیزوں کی وجہ سے مقیم بن سکتا ہے۔ (۱) اقامت کی نیت کرنا، تاہم یہ نیت پانچ چیزوں پر موقوف ہے، جن کو ہم شرائط بھی کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

(الف) مسافر شخص کسی جگہ ٹھہرنے کی پختہ نیت کرلے، لہٰذا اگر ٹھہرنے کی نیت نہ ہو بلکہ کوچ کر جانے کا ارادہ ہو، لیکن کسی کام کی وجہ سے ہر روز بلا نیت رک جاتا ہو تو کئی مہینوں اور سالوں تک بھی قصر کر سکتا ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بیان مایصیر به المقیم مسافر: ۱/۴۷۵، ۴۷۶، الفتاوی الهندیة. کتاب الصلوۃ، الباب الخامس عشر في صلوۃ المسافر: ۱/۱۳۸، ۱۳۹

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوۃ، الباب الخامس عشر في صلوۃ المسافر: ۱/۱۳۹، مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، باب صلوۃ المسافر، ص: ۴۲۴

(ب) کم از کم پندرہ دن رات اقامت کی نیت ہو۔ پندرہ دن سے کم مدت ٹھہرنے کی نیت سے آدمی مقیم نہیں بن سکتا۔

(ج) اتحادِ ارکان، یعنی ایک ہی جگہ پندرہ دن رات ٹھہرنے کی نیت ہو۔ دو شہروں میں (اگرچہ ایک دوسرے کے قریب ہوں) ایک ساتھ پندرہ دن رات کی نیت سے اقامت کا حکم نہیں لگے گا الا یہ کہ رات گزارنے کے لیے ایک شہر متعین کرلے۔

(د) جس جگہ اقامت کی نیت کی جارہی ہے وہ عرف وعادت میں اقامت کے قابل ہو، لہٰذا اگر کوئی لشکر یا قافلہ کسی صحرا، جزیرہ، کشتی اور جنگل وغیرہ میں اقامت کی نیت کرلے تو اس سے سفر باطل نہیں ہوگا، بلکہ وہ بدستور مسافر ہی رہے گا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ: "صحرا نشین اور خانہ بدوش لوگ اگر صحرا میں خیمے وغیرہ لگا کر پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت کرلیں تو وہ مقیم بن جائیں گے۔ عالمگیری میں اس قول کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔ عالمگیری میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر سفر شرعی کی مقدار مکمل ہونے سے پہلے پہلے کوئی شخص اقامت کی نیت کرتے ہوئے سفر ترک کردے تو وہ چاہے صحرا ہی کیوں نہ ہو، نیت اقامت معتبر ہوگی۔

(ہ) نیت اقامت کے ساتھ ساتھ سفر کرنا بھی موقوف کرے۔ اگر سفر جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو اقامت کی نیت ممکن ہی نہیں۔(۱)

(۲) تابع یعنی ماتحت شخص کا متبوع اقامت کی نیت کرلے تو اس کے ساتھ تابع بھی مقیم بن جاتا ہے اگرچہ ذاتی طور پر اس نے اقامت کی نیت نہ کی ہو، تاہم اگر تابع کو اپنے متبوع کی نیت کا علم نہ ہو تو وہ اس وقت تک مسافر رہے گا جب تک اس کو علم نہ ہوجائے۔(۲)

(۳) مسافر شخص واپس اپنے وطن لوٹ آئے تو اقامت کی نیت کے بغیر ہی وہ مقیم متصور ہوگا چاہے اس کی واپسی اقامت کی نیت سے ہو یا کسی غرض کے لیے عارضی طور پر ہو۔ معلوم ہوا کہ سفر کے لیے اپنے وطن سے نکلتے وقت نیت سفر ضروری ہے، لیکن واپسی کے وقت اقامت کے لیے کسی نیت کی ضرورت نہیں۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان مايصيربه المسافر مقيما: ١/ ٠٠ ـ ٤٨٥، الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ١/ ١٣٩

(٢) الدر المختار، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ٢/ ٦١٨

(٣) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان مايصيربه المسافر مقيما: ١/ ٤٩٦

(۴) سفرِ شرعی کے دوران مقدارِ سفر تک پہنچنے سے پہلے پہلے ترکِ سفر کی نیت کرنے سے آدمی فوراً مقیم بن جاتا ہے، تاہم اگر مقدارِ شرعی سے تجاوز کرنے کے بعد ترکِ سفر کی نیت کرلے تو اس سے اقامت کا حکم ثابت نہیں ہوگا۔(۱)

(۵) مسافر عورت اگر کسی جگہ شادی کرلے تو صرف شادی کرنے کی وجہ سے وہ مقیم بن جاتی ہے، اور یہ جگہ اس کے لیے وطن اصلی بن جاتی ہے، اگرچہ وہ اس جگہ کو اپنا وطن بنانے کی نیت نہ کرے۔ یہی حکم مرد کا بھی ہے۔ البتہ اگر وہاں مستقل رہنے کی نیت نہ ہو بلکہ اس جگہ کو ترک کرنے کی نیت کر کے وہاں سے کوچ کرلے تو یہ وطن اصلی باطل ہوجائے گا، پھر اس مقام پر آتے جاتے مقیم متصور نہ ہوگا بلکہ قصر کرے گا۔(۲)

چند متفرق ضروری مسائل:

(۱) سفر اور اقامت کی نماز میں آخر وقت کا اعتبار ہے۔ اگر ابتداء وقت میں مقیم تھا اور اخیر وقت میں مسافر ہوگیا اور اب تک نماز ادا نہ کی تھی تو قصر کرے گا اور اگر نماز فوت ہوگئی تو قضا بھی قصر کے ساتھ ہوگی۔ اور اگر ابتدا میں مسافر تھا اور اخیر میں مقیم ہوگیا اور نماز ابھی نہ پڑھی ہو تو اتمام کرے گا اور فوت ہوجائے تو قضا بھی مکمل نماز کی ادا کرنی ہوگی۔(۳)

(۲) مسافر شخص اگر وقت کے اندر اندر مقیم امام کی اقتدا کرے تو وہ بھی اپنے امام کی طرح نماز پوری کرے گا، یہاں تک کہ اخیر قعدہ میں بھی امام کو پالے تو نماز پوری کرے۔ وقت نکلنے کے بعد مقیم امام کی اقتدا مسافر کے لیے جائز نہیں۔

(۳) مقیم شخص مسافر کی اقتداء تمام نمازوں میں وقت کے اندر اور وقت نکلنے کے بعد ہر صورت میں کرسکتا ہے۔ تاہم چار رکعت والی نمازوں میں وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رکعتیں پوری کرے گا۔ امام کے لیے بھی ایسی صورت میں مستحب ہے کہ سلام پھیرتے ہی اعلان کردے کہ میں مسافر ہوں، لوگ اپنی نمازیں پوری کرلیں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے ہی لوگوں کو اس سے مطلع کردے۔ مسافر امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی بقیہ رکعتوں میں قرآن مجید نہ پڑھیں گے بلکہ یوں ہی خاموشی کے ساتھ قرأت کی بقدر کھڑے رہیں گے۔

(۴) سفر جاری رکھنے کا ارادہ ہو تو اقامت کی نیت ممکن ہی نہیں۔(۴)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بيان مايصيربه المسافر مقيما: ۱/ ۵۰۰

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ۲/ ۶۱۹

(۳) فتاوی قاضي خان علیٰ هامش الهندية، باب صلوة المسافر: ۱/ ۱۶۷، مراقي الفلاح، باب صلوة المسافر، ص: ۳۴۸

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في صلاة المسافر: ۱/ ٤٦٦، ٤٦٧، مراقي الفلاح، باب صلوة المسافر، ص: ۳٤٧، ۳٤٨، الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ۲/ ۶۱۰ـ۶۱۲

(۴) قصر صرف فرض نمازوں میں ہے، سنن، نوافل اور وتر میں نہیں، البتہ سنن سے متعلق مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ چلنے اور سفر جاری رہنے کی حالت میں سنن نہ پڑھنا مرخص ہے جبکہ حالتِ قرار و حالتِ امن وسکون میں پڑھنا افضل ہے۔(۱)

(۵) مسافر شخص جس طرح نماز سے باہر اقامت کی نیت کرنے سے مقیم ہوتا ہے اسی طرح نماز کے اندر اقامت کی نیت کرنے سے بھی مقیم بن سکتا ہے، لہٰذا اگر نماز کے اول، درمیان یا آخر میں کسی بھی وقت اقامت کی نیت کرلے تو نماز چار رکعت میں تبدیل ہوجائے گی، چاہے وہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد، اور چاہے تمام رکعتوں کو امام کے ساتھ پانے والا ہو یا مسبوق ہو۔(۲)

(۶) گاڑیوں اور ریل گاڑی میں نماز کا مسئلہ بقابلِ تفصیل ہے کہ اگر وہ کھڑی حالت میں ہو تو اس میں نماز پڑھنا زمین پر نماز پڑھنے کے حکم میں ہے یعنی قیام، رکوع اور سجدہ ضروری ہوگا (کہ نہ تو اشارہ سے نماز جائز ہے اور نہ ہی بیٹھ کر) اور اگر وہ (گاڑی) چل رہی ہو تو وہ چلتی ہوئی کشتی کے حکم میں ہے، اس لیے اس میں رکوع، سجدہ اور قعدہ ضروری ہے یعنی بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، اگر کسی نے اشارہ سے نماز پڑھی تو اس کا اعادہ کرے گا۔

(۷) ہوائی جہاز میں نماز کشتی میں نماز پڑھنے کے حکم میں ہے کہ اگر وہ زمین پر کھڑی ہوئی ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ اس سے اُتر کر نماز پڑھی جائے، تاہم اگر اس میں نماز پڑھنا پڑے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے اور بلا عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں اور اگر وہ ہوا میں ہو تو پھر چلتی ہوئی کشتی کی طرح اس میں بیٹھ کر نماز پڑھی جاسکتی ہے، البتہ اس میں بھی اگر سر چکرانے کا خوف نہ ہو تو پھر کھڑے ہو کر پڑھنا بہتر ہے۔(۳)

❁❁❁❁❁

---

(۱) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المسافر، ص:۳٤۳، الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر:۲/٦۱۳

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر:۱/۱٤۱، بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان المسافر مقيما:۱/٤۸٦

(۳) الشيخ مفتي فريد رروبوي، منهاج السنن شرح جامع السنن، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الصلاة على الدابة حيث توجهت به:۲/۲۳٤

باب صلوة المسافر

(مسافر کی نماز کے بیان میں)

سفر کا آغاز اور انتہا

سوال نمبر(35):

ایک شخص مسافر ہوکر گھر سے نکلتا ہے تو سفر کا آغاز کہاں سے معتبر ہوگا اور اسی طرح سفر کی انتہا کہاں ہوگی؟

بیّنوا توجروا

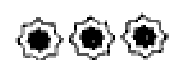
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو شخص سفر کی نیت کر کے گھر سے نکلے تو اپنے علاقہ اور شہر کی حدود سے نکلنے پر اس کی طرف سفر کے احکام متوجہ ہوں گے اور سفر کی انتہا بھی ان حدود میں داخل ہونے سے ہوگی، البتہ سفر کے اختتام کے لیے اپنی حدود میں داخل ہوتے وقت نیت اقامت کی ضرورت نہیں۔ گویا اپنے شہر کی حدود سے سفر کا آغاز ہوگا اور انہی حدود میں داخل ہونے سے سفر کی انتہا ہوگی۔ نیز حدود میں داخل ہونے تک یہ شخص تب تک مسافر رہے گا جب تک کسی علاقے میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے اور یہی سفر جاری رہے۔ کسی علاقے میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کر لینے سے کوئی شخص مسافر نہیں رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(من خرج من عمارة موضع إقامته قاصداًمسيرة ثلثةأيام ولياليها..........صلّى الفرض الرباعيّ ركعتين ......حتىٰ يدخل موضع مقامه)إن سارمدة السفروإلافيتم بمجردنية العود.(١)

ترجمہ: جو شخص تین دن اور تین راتیں سفر کی نیت سے اپنے وطنِ اقامت کی حدود سے نکلے ۔۔۔۔تو وہ چار رکعت والی فرض نمازوں کو دو رکعت پڑھے گا۔۔۔۔ یہاں تک کہ اپنے وطنِ اقامت میں داخل ہوجائے۔(وطن اقامت میں داخل ہونے سے سفر کا ختم ہونا تب ہوگا جب)اس نے پہلے سے سفر کی مقدار طے کی ہو ورنہ (سفر کی مقدار طے کرنے سے پہلے پہلے) محض واپس ہونے کی نیت سے یہ شخص (مقیم ہوکر) پوری نماز پڑھے گا۔



(١)الدرالمختارعلیٰ صدرردالمحتار،کتاب الصلوة،باب صلوةالمسافر:٢/٥٩٩۔٦٠٤

مسافر کا نماز میں قصر کی بجائے اتمام کرنا

سوال نمبر(36):

اگر مسافر حالتِ سفر میں رخصت چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرتے ہوئے، اپنی نماز پوری پڑھے اور قصر نہ کرے تو کیا اس کی نماز درست ہوگی؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سفر میں قصر نماز پڑھنا شرعاً واجب ہے۔اس میں اپنی طرف سے قصداً زیادتی کرنا موجبِ گناہ ہے،اس لیے جو شخص قصداً سفر میں پوری نماز پڑھے گا تو گنہگار ہوگا،جس سے توبہ کرنا لازم ہے۔علامہ ابن عابدینؒ کے قول کے مطابق اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔البتہ پوری نماز پڑھنے کی صورت میں اس کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے،بشرطیکہ وہ پہلے قعدہ میں بیٹھا ہو۔اگر پہلے قعدہ میں بیٹھا نہ ہو تو پھر ذمہ فارغ نہیں ہوگا اور نماز کا اعادہ کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(فلو أتم مسافر إن قعد في)القعدة(الأولیٰ تم فرضه و)لکنه (أساء) لو عامداً لتأخیر السلام ، وترك واجب القصر،وواجب تکبیرة افتتاح لنقل وخلط النفل بالفرض وهذا لایحل کماحرره القهستاني بعد أن فسّر(أساء)ب (أثم) واستحق النار.قال ابن عابدین تحت قوله أساء:فعلم أن الإساء ة هنا کراهة التحریم.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی مسافر بجائے قصر کے اتمام کردے تو اگر قعدہ اولی میں بیٹھا ہو تو اس کا فرض ادا ہو جائیگا،البتہ اگر قصداً ایسا کیا ہو تو سلام جو کہ واجب ہے اس میں تاخیر کی وجہ سے اور قصر جو کہ واجب ہے اس کے ترک کی وجہ سے اور تکبیر تحریمہ جو کہ واجب ہے اس کے ترک سے اور نفل کو فرض کے ساتھ خلط کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔اور یہ جائز نہیں، جیسا کہ قہستانیؒ نے اساء کی تفسیر اثم اور آگ کا مستحق ہونے کے ساتھ کیا ہے۔ابن عابدینؒ نے ماتن کے قول اساء کے تحت فرمایا ہے کہ اس سے یہاں پر مکروہ تحریمی ہونا مراد ہے۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ المسافر:۲/۶۰۹،۶۱۰

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا مسئلہ

سوال نمبر(37):

ایک ڈاکٹر یہاں پشاور میں ملازم ہے اور اپنے علاقہ کرک ہفتہ وار جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ صاحب یہاں پشاور میں قصر نماز پڑھے گا یا اتمام کرے گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو شخص شرعی سفر کی نیت سے سفر شروع کرے تو وہ اپنے شہر کی حدود سے نکلنے کے بعد مسافر متصور ہوگا اور جب تک کسی مقام پر پہنچ کر پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت نہ کرے مسافر ہی رہے گا۔

صورتِ مسئولہ میں ڈاکٹر نے جائے ملازمت یعنی پشاور میں جب تک پندرہ یا اس سے زیادہ دن کی اقامت کی نیت نہیں کی، بلکہ ہفتہ وار آنا جانا ہو تو پشاور میں مسافر کے حکم میں ہو کر قصر کرے گا، ہاں جب ایک دفعہ مقیم بن جائے تو پھر ہفتہ وار آنے جانے سے فرق نہیں پڑتا، جب تک ملازمت ہو تو پشاور میں مقیم متصور ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصداً مسيرة ثلاثة أيام و لياليها......صلى الفرض الرباعي ركعتين ......حتىٰ يدخل موضع مقامه أو ينوي إقامة نصف شهر.(۱)

ترجمہ:

جو شخص اقامت والے علاقے کی آبادی سے تین دن اور تین رات سفر کی نیت سے نکلے......تو وہ چار رکعات والی فرض نمازوں کو دو رکعات پڑھے گا......یہاں تک کہ اپنی اقامت کی جگہ میں داخل ہو جائے، یا پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے۔



(۱) تنویر الأبصار علیٰ صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ۲/ ۵۹۹۔ ۶۰۱،۶۰۴،۶۰۵

وطنِ اقامت میں پندرہ دن سے کم وقت گزارنا

سوال نمبر (38):

ایک طالب علم ہے اس کے گھر اور مدرسہ کے درمیان فاصلہ ۴۸ میل یا اس سے کچھ زیادہ ہے اور ایک بار اس نے مدرسہ کو وطنِ اقامت بنایا ہے (یعنی ایک مرتبہ اس نے مدرسہ میں پندرہ دن گزارے ہیں) اس کے بعد جب وہ مدرسہ میں پندرہ دن سے کم وقت گزارتا ہے تو مدرسہ میں (جو اس کا وطنِ اقامت ہے) اس کی نماز کی کیفیت کیا ہوگی، قصر نماز پڑھے گا یا پوری پڑھے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کسی جگہ پر کوئی آدمی پندرہ دن اقامت کی نیت کر کے وہاں اقامت اختیار کرے اور اس جگہ کو ایک مرتبہ وطنِ اقامت بنالے تو پھر بار بار آنے جانے سے وطنِ اقامت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لہٰذا اگر کوئی طالب علم کسی مدرسہ میں اقامت اختیار کرے اور ایک مرتبہ اقامت کی مدّت پوری کرے تو وہاں پوری نماز پڑھے گا، اگرچہ پندرہ دن سے کم وقت گزارے، کیونکہ وطنِ اقامت انشائے سفر سے اس وقت باطل ہوتا ہے، جب اس کو باقاعدہ چھوڑنے کا عزم کیا جائے، ورنہ جب تک اس کی تعلیم وہاں جاری ہو اور اقامت ترک کرنے کا عزم نہ کیا ہو تو صرف آنے جانے سے وہاں پر قصر نہیں کرے گا، بلکہ پوری نماز ادا کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وقیل: تبقیٰ وطناله؛ لأنها كانت وطناله بالأهل والدار جميعا، فزوال أحدهما لا يرتفع الوطن، كوطن الإقامة تبقى ببقاء الثقل وإن أقام بموضع آخر. (۱)

ترجمہ:

(اور اس وطنِ اقامت کے بارے میں کہا گیا ہے، جس میں اب مستقل طور پر مقیم نہیں ہے، البتہ ضروریات وہاں پر ہوں اور اہل وعیال کو وہاں سے منتقل کردے) تو یہ جگہ اس کا وطنِ اقامت باقی رہے گا، کیونکہ اس جگہ کا وطنِ اقامت ہونا دو وجہوں سے تھا۔ ایک اہل کا وہاں ٹھہرانا اور دوسرا جائیداد کا ہونا تو ایک کے زائل ہونے سے وطن

(۱) البحر الرائق، كتاب الصلوة، باب المسافر، قوله: (ويبطل الوطن الأصلي): ۲/۲۳۹

اقامت باطل نہ ہوگا۔جس طرح کہ وطنِ اقامت میں جب تک سامان پڑا ہوا ہوتو وہ وطنِ اقامت باقی رہتا ہے،اگر چہ وہ خوددوسری جگہ مقیم ہو۔

❁❁❁

وطنِ اقامت سے ۴۸میل دورجانا

سوال نمبر(39):

وطن اصلی سے تو ۴۸میل کے سفر پرانسان قصرنماز پڑھے گا،لیکن وطن اقامت سے مسافر بننے کے لیے کتنا فاصلہ شرعاً معتبر ہوگا اور آدمی کب قصر نماز پڑھے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی شخص کسی جگہ پر اقامت اختیار کرلے تو وہ وطن اقامت سے شرعی سفر سے کم مسافت طے کرنے کی صورت میں پوری نماز ادا کرے گا،تاہم جب وطنِ اقامت سے شرعی سفر(۴۸میل)کے فاصلہ پر سفر کرے تو پھر قصر کرنا واجب ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں وطنِ اقامت سے مسافر بننے اور قصرنماز کے وجوب کے لیے ۴۸میل کے فاصلے کا سفرکرنا شرعاً معتبر ہے۔اس سے کم سفرکرنے کی صورت میں پوری نماز پڑھنا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والحاصل:أن إنشاء السفر يبطل وطن الإقامة إذا كان منه،أما لو أنشأه من غيره فإن لم يكن فيه مرور علىٰ وطن الإقامة، أو كان ولكن بعد سير ثلاثة أيام فكذلك،ولو قبله لم يبطل الوطن بل يبطل السفر؛لأن قيام الوطن مانع من صحته.(۱)

ترجمہ:

اورخلاصہ یہ ہے کہ سفرکا شروع کرنا وطن اقامت کو باطل کرتا ہے،جب یہ سفراسی وطن اقامت سے شروع کیا جائے۔اگر وطن اقامت کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے سفر شروع کیا جائے تو اگر وطن اقامت پر گزر نہ ہو یا وطن

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر،مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة:۲/۶۱۵

اقامت پر گزرنا تین دن کی مقدار سفر کرنے کے بعد ہو تو پھر یہی حکم ہے (یعنی وطنِ اقامت کا باطل ہونا اور نماز میں قصر کرنا) اور اگر (تین دن سفر کی مقدار سے) پہلے پہلے اس پر گزر ہو تو یہ وطنِ اقامت کو باطل نہیں کرتا، بلکہ یہ سفر باطل ہوگا (کہ پوری نماز پڑھے گا) اس لیے کہ وطنِ اقامت میں قیام کرنا سفرِ شرعی کی صحت سے مانع ہے (آڑتالیس میل سے کم ہے)۔

❁❁❁

سفرِ شرعی پر مرتب ہونے والے احکام

سوال نمبر (40):

سفرِ شرعی پر کون کون سے احکامات مرتب ہوتے ہیں؟ تفصیل سے جواب دے کر مشکور فرماویں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سفرِ شرعی پر جو احکامات مرتب ہوتے ہیں، وہ درجہ ذیل ہیں:

(۱) چار رکعتوں والی فرض نمازوں میں قصر (چار کی بجائے دو رکعت پڑھنا)۔

(۲) اگر سفر رمضان میں ہو تو افطار کرنا جائز ہے۔

(۳) مقیم کے لیے موزوں پر مسح کی اجازت ایک دن ایک رات ہوتی ہے، جب کہ مسافر کے لیے تین دن تین رات تک بڑھ جاتی ہے۔

(۴) مسافر سے دورانِ سفر جمعہ وعیدین کی نماز کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

(۵) اگر مسافر ایسا ہو کہ اس پر دورانِ اقامت عید الاضحیٰ کی قربانی واجب ہو تو سفر سے اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

(۶) اگر مسافر عورت ہو، تو اس کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الأحكام التي تتغير بالسفر هي قصر الصلوة،وإباحة الفطر،وامتداد مدة المسح إلى ثلاثة أيام،وسقوط وجوب الجمعة،والعيدين،والأضحية، وحرمة الخروج على الحرة بغير محرم،كذا في العتابية.(۱)

(۱) الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس عشر في صلوة المسافر:۱/۱۳۸

ترجمہ:

وہ احکام جو سفر کی وجہ سے تبدیل ہو جاتے ہیں یہ ہیں: نماز میں قصر کرنا، فرض روزہ (دورانِ سفر) نہ رکھنے کی اجازت ہونا، موزوں کے مسح کی مدّت تین دن تک بڑھ جانا، جمعہ، عیدین وقربانی کا وجوب نہ رہنا اور آزاد عورت کا محرم کے بغیر باہر جانے کا منع ہونا۔

❁❁❁

جائے ملازمت میں قصر کرنا

سوال نمبر(41):

ایک شخص کسی ایسی جگہ ملازمت کرتا ہے جو اس کے علاقے سے سفرِ شرعی کی مسافت پر ہے۔اس جگہ پر ہفتہ یا چھ دن گزارتا ہے اور ہر ہفتہ گھر آتا ہے، چنانچہ صرف اقامت کی نیت کرکے وہاں مقیم شمار ہوگا یا پندرہ دن گزارنا ضروری ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ کوئی شخص جب سفر کی نیت سے گھر سے نکلتا ہے تو جب تک واپس وطن اصلی نہ لوٹے یا کسی علاقے میں پندرہ دن تک ٹھہرنے کی نیت نہ کرے، اس وقت تک مسافر رہے گا اور قصر نماز پڑھے گا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر پندرہ دن اقامت کی نیت نہ ہو تو قصر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔اور اگر پندرہ دن گزارنے کی نیت کی ہو تو مقیم شمار ہوگا خواہ اس سے کم دن ہی کیوں نہ گزارے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولایزال علیٰ حکمِ السفرحتیٰ ینوی الإقامة فی بلدة ،أوقریة خمسةعشر یوما أو أکثر.(۱)

ترجمہ:

اور وہ شخص اس وقت تک مسافر کے حکم میں رہے گا، جب تک کسی شہر یا گاؤں میں پندرہ دن یا زیادہ اقامت کی نیت نہ کرے۔

(۱)الهداية، کتاب الصلوة،باب صلوة المسافر:۱/۱۷٤

مسبوق مسافر کے لیے قرأت

سوال نمبر(42):

کسی مقیم امام کے پیچھے کوئی مسبوق مسافر نماز پڑھ رہا ہو تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ مسافر مقتدی اپنی بقیہ رکعتوں میں قرأت کرے گا یا نہیں؟ اسی طرح اگر امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم ہو تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ مقیم مقتدی اپنی بقیہ رکعتوں میں قرأت کرے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہی عبارات کی رو سے اگر مسافر کسی مقیم امام کی اقتدا کرے تو مسافر کو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ اسی طرح اگر مسافر مسبوق ہو تو وہ بقیہ رکعتوں میں قرأت کرے گا، کیونکہ وہ امام کی واجب قرأت میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اور اگر کوئی مقیم کسی مسافر کی اقتدا کرلے تو امام کے ساتھ دو رکعت پڑھنے کے بعد اس کا حکم لاحق جیسا ہوگا یعنی وہ بقیہ رکعتوں میں قرأت نہیں کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وإذا دخل المسافر في صلاة المقیم یلزمه الإتمام،سواء کان في أولها أوفي آخرها.(۱)

ترجمہ:

اور جب کوئی مسافر کسی مقیم امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوجائے تو اس پر پوری نماز لازم ہوجاتی ہے چاہے ابتدا نماز میں شریک ہو یا آخر میں۔

(وصح إقتداء المقیم بالمسافرفي الوقت وبعده،فإذا قام) المقیم (إلی الإتمام لا یقرأ) ولایسجد للسهو(في الأصح)؛لأنه کاللاحق .(۲)

ترجمہ:

اور مقیم کی اقتدا مسافر کے پیچھے جائز ہے، وقتی نماز میں بھی اور قضا میں بھی۔ اور جب مقیم مقتدی اپنی بقیہ نماز

(۱)الفتاوی التاتارخانیة،کتاب الصلوة،نوع آخرفي بیان مایصیرالمسافربه مقیمابدون نیة الإقامة:۲/۲۰

(۲)الدرالمختارعلیٰ صدرردالمحتار،کتاب الصلوة،باب صلوة المسافر:۲/۶۱۰،۶۱۱

پوری کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو صحیح قول کے مطابق قرأت اور سجدۂ سہو نہیں کرے گا، کیونکہ وہ لاحق کی طرح ہے۔

❁❁❁

اڑتالیس میل سے کم مسافت کی صورت میں نماز کا حکم

سوال نمبر(43):

ایک شخص مردان کا رہائشی ہے اور وہ اکثر پشاور آتا رہتا ہے۔ان دونوں شہروں کے مابین فاصلہ سفرِشرعی کی مسافت تک نہیں پہنچتا۔ایسی صورت میں دورانِ سفر راستہ پر قصر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

موجودہ دور میں سفرِشرعی کے لیے علماءِ کرام نے ۴۸ میل یا ۷۸ کلومیٹر کا اندازہ مقرر کیا ہے، لہٰذا اس سے کم مسافت کے ارادے سے سفر کے لیے نکلنے والا شخص شرعاً مسافر کے حکم میں شمار نہیں ہوگا، لہٰذا پوری نماز پڑھے گا۔

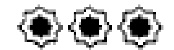
صورتِ مسئولہ میں مردان اور پشاور کے مابین فاصلہ مسافت سفرِشرعی کے برابر نہیں بنتا، لہٰذا مردان کا رہائشی پشاور آتے جاتے وقت پوری نماز پڑھے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصداًمسيرة ثلاثةأيام،ولياليهابالسيرالوسط مع الاستراحات المعتادة،صلى الفرض الرباعي ركعتين.(۱)

ترجمہ:

جو شخص اپنی اقامت کی جگہ کی آبادی سے درمیانی چال چلتے ہوئے حسبِ معمول راحت وآرام کی رعایت رکھتے ہوئے تین دن اور تین رات کی مسافت کی نیت سے نکلے تو چار رکعت فرض نماز میں قصر کرکے دو رکعت پڑھے گا۔



(۱) تنویر الأبصار علیٰ صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ۲/ ۵۹۹۔۶۰۳

سفر کی مقدار میں شہر کے حدود کا معتبر ہونا

سوال نمبر (44):

میں سدا بہار گجرات (ضلع مردان) کا رہنے والا ہوں اور کاروبار اسکیم چوک پشاور میں کرتا ہوں۔ اب ہمارے علاقے سے پشاور تک تقریباً ۷۶ کلومیٹر اور اسکیم چوک تک ۸۵ کلومیٹر بنتے ہیں، جہاں میں رہتا ہوں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں اسکیم چوک میں رہ کر قصر نماز پڑھوں گا یا پوری نماز پڑھوں گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کوئی شخص کم از کم تین دن اور تین راتیں درمیانی چال اور جگہ جگہ پر ضروری قیام کے ساتھ چلنے کا ارادہ کرے۔ تو ایسا شخص شرعی مسافر سمجھا جائے گا۔ موجودہ دور میں شرعی مسافر کے لیے علمانے اڑتالیس میل یا ۷۸ کلومیٹر کا فاصلہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا اس سے کم مقدار میں سفر کرنے والے کو شرعی مسافر نہیں کہا جائے گا۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر سائل اسکیم چوک پشاور میں کاروبار کرتا ہو اور اس کے علاقے (ضلع مردان) سے پشاور تک ۷۶ کلومیٹر بنتے ہوں تو اس صورت میں یہ شرعی مسافر نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ ہم نے سی، این، ڈبلیو والوں سے پشاور کے حدود اربعہ معلوم کرنے کے لیے رابطہ کیا تو ان کے قول کے مطابق نوشہرہ کی طرف آخری حد ترناب فارم، چارسدہ کی طرف آخری حد ناگمان، جمرود کی طرف آخری حد تختہ بیگ اور کوہاٹ کی طرف آخری حد سپینہ تھانہ ہے۔ اور اسکیم چوک چونکہ پشاور کی حدود کے اندر آتا ہے، اس لیے مذکورہ شخص جب نوشہرہ کی طرف سے پشاور میں داخل ہوگا اور جیسے ہی وہ ترناب پہنچے تو وہ پشاور کی حدود میں شمار ہوگا اور وہاں تک اس کی سفرِ شرعی کی مقدار پوری نہیں، اس لیے پشاور میں وہ شخص مقیم شمار ہو کر پوری نماز پڑھے گا، اگرچہ وہ پشاور کے دوسرے کونے میں مقیم ہو، کیونکہ شہر کے اندر مسافت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وأما بيان ما يصير به المقيم مسافرا......قال أصحابنا: مسيرة ثلثة أيام سير الإبل و مشي الأقدام. (۱)

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل فيما يصير به المقيم مسافرا: ۱/ ۶۷ ۴، ۶۸ ۴

ترجمہ:
اور جس مسافت کی وجہ سے مقیم شخص مسافر بن جاتا ہے۔۔۔۔۔احناف فرماتے ہیں کہ یہ اونٹ کے تین دنوں کے چلنے کی بقدر یا کسی آدمی کے تین دن پیدل چلنے کی بقدر کی مسافت ہے۔

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصداً مسيرة ثلاثة أيام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة، صلى الفرض الرباعي ركعتين.(۱)

ترجمہ:
جو شخص اقامت کی جگہ کی آبادی سے درمیانی چال چلتے ہوئے حسب معمول راحت وآرام کی رعایت رکھتے ہوئے تین دن اور تین رات کی مسافت کی نیت سے نکلے تو چار رکعت فرض نماز میں قصر کرکے دو رکعت پڑھے گا۔

❁❁❁

منزل کی طرف دو مختلف راستے ہوں تو نماز کا حکم

سوال نمبر(45):
اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ سفر پر جارہا ہو کہ جہاں جانے کے لیے دو راستے ہوں۔ایک طویل ہو کہ اس سے سفر شرعی کی مقدار پوری ہوتی ہو اور دوسرا راستہ مختصر ہو جس سے سفرِ شرعی کی مقدار پوری نہ ہوتی ہو تو اب یہ شخص جب اس مقام تک طویل یا مختصر راستے سے جائے گا تو اس کا حکم الگ الگ ہوگا یا دونوں کا حکم ایک ہوگا؟ وضاحت کریں۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:
جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے دو راستے ہوں ایک طویل ہو کہ اس کی مسافت سفر شرعی کی بقدر ہو، دوسرا راستہ سفرِ شرعی کی مقدار سے کم ہو تو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہے،لہٰذا جب یہ شخص اس طویل راستے سے جائے گا تو سفرِ شرعی کی مقدار پوری ہونے کی بنا پر قصر نماز پڑھے گا۔مختصر راستے سے جائے گا تو سفر شرعی کی مقدار پوری نہ ہونے کی وجہ سے اتمام کرے گا۔

(۱) تنویر الأبصار علیٰ صدر رد المحتار، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ المسافر:۲/۵۹۹۔۶۰۳

والدلیل علیٰ ذلك:

فإذا قصد بلدة،والیٰ مقصده طریقان:أحدهمامسیرة ثلثة أیام ولیالیها،والآخر دونها، فسلك الطریق الأبعد کان مسافراعندناهکذافي فتاویٰ قاضي خان،وإن سلك الأقصر یتم.(۱)

ترجمہ:

پس اگر کسی نے کسی شہر کا ارادہ کیا اور اس کی منزلِ مقصود کے دو راستے ہوں۔ان میں سے ایک راستہ تین دن اور تین رات پر مشتمل ہو اور دوسرا راستہ اس سے کم ہو اور وہ لمبے راستے سے گیا تو ہمارے ہاں مسافر قرار پائے گا اور اگر وہ قریبی راستہ سے گیا تو پوری نماز پڑھے گا۔

❁❁❁

مسلسل سفر میں رہنے والے ڈرائیور کا حکم

سوال نمبر(46):

ایک شخص ٹرک ڈرائیور ہے۔وہ ہمیشہ ٹرک میں ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا رہتا ہے۔اور کسی بھی جگہ ایک یا دو دن سے زیادہ قیام نہیں کرتا۔آیا یہ شخص پوری نماز پڑھے گا یا قصر کرے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ آدمی شرعاً مسافر اس وقت شمار ہوتا ہے، جب وہ اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ مسافت کا قصد کرے تو جیسے ہی وہ اپنی آبادی سے نکل جائے تو اس پر سفر کے احکام جاری ہوں گے۔

لہٰذا ٹرک ڈرائیور اگر اپنے وطنِ اصلی سے کم از کم اڑتالیس میل دور جانے کے ارادہ سے نکلے تو وہ مسافرِ شرعی ہے اور اس پر نماز میں قصر کرنا واجب ہو جاتا ہے، جب تک کہ واپس اپنے وطنِ اصلی نہ آجائے یا کسی جگہ پندرہ دن قیام کا ارادہ نہ کرے، اس وقت تک وہ مسافر کے حکم میں ہے، لہٰذا قصر کرے گا۔یعنی چار رکعت والی نمازوں میں تخفیف پر عمل کرتے ہوئے صرف دو رکعت پڑھے گا۔

---

(۱)الفتاویٰ الهندیة، کتاب الصلوٰة،الباب الخامس عشر في صلوٰة المسافر:۱/۱۳۸

والدلیل علیٰ ذلک:

ولایزال علیٰ حکم السفر حتیٰ ینوي الإقامة في بلدة ،أو قریة خمسة عشر یوما أو أکثر.(١)

ترجمہ: اور وہ شخص اس وقت تک مسافر کے حکم میں رہے گا، جب تک کہ وہ کسی گاؤں یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔

❁❁❁

مسافر ڈرائیور کا حکم

سوال نمبر (47):

جو شخص لاہور سے پشاور اور پشاور سے لاہور گاڑی چلاتا ہو، اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟ اگر لاہور میں اپنا کرہ ہو یا کرایہ پر لیا ہو ان صورتوں میں کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کوئی شخص تین دن اور تین راتیں درمیانی چال اور جگہ جگہ پر ضروری قیام کے ساتھ سفر (جس کی مقدار ۴۸ میل یا ۷۸ کلومیٹر مقرر کی گئی ہے) کا ارادہ کرلے تو ایسا شخص شرعی مسافر سمجھا جائے گا اور اس سے کم مسافت طے کرنے والے کو شرعی مسافر نہیں کہا جائے گا۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کوئی ڈرائیور پشاور تا لاہور اور لاہور تا پشاور گاڑی چلاتا ہو تو اس صورت میں مسافتِ شرعی پوری ہونے کی وجہ سے یہ شخص شرعی مسافر سمجھا جائے گا اور دورانِ سفر قصر نماز پڑھے گا، تاہم اگر لاہور میں اس کا اپنا کمرہ ہو یا کرایہ پر لیا ہو جس میں اس کا سامان وغیرہ ہو تو اگر اس نے وہاں پر اقامت کی نیت سے پندرہ دن یا اس سے زیادہ گذارے ہوں یا پندرہ دن اقامت کی نیت کی ہو تو پھر وہ شخص لاہور میں وطنِ اقامت ہونے کی بنا پر اتمام کرے گا، ورنہ قصر نماز پڑھے گا، تاہم لاہور سے پشاور آتے جاتے راستے میں قصر نماز ہی پڑھے گا۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولایزال علیٰ حکم السفر حتیٰ ینوي الإقامة في بلدة ،أو قریة خمسة عشر یوما أو أکثر.(٢)

(٢،١)الهداية، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ١/ ١٧٤

ترجمہ:

اور وہ شخص اس وقت تک مسافر کے حکم میں رہے گا، جب تک کہ وہ کسی گاؤں یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔

❁❁❁

تبلیغی جماعت کی پندرہ دن سے زائد کسی شہر میں تشکیل

سوال نمبر(48):

تبلیغی جماعتیں اللہ کے راستے میں نکلتی ہیں۔کبھی ان کی تشکیل کسی ایک شہر میں پندرہ یا اس سے زائد دنوں کی بھی ہو جاتی ہے تو کیا اس شہر میں یہ لوگ قصر نماز پڑھیں گے یا اتمام کریں گے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ دورانِ سفر اگر کوئی شخص کسی شہر میں پندرہ دن کی اقامت کی نیت کرے تو وہ شہر اس کا وطنِ اقامت شمار ہوگا اور اس شہر میں جہاں بھی شہری حدود کے اندر رہتے ہوئے جانا ہو اس پر پوری نماز واجب ہوگی۔شہری حدود کا تعین بلدیات والے کرتے ہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر تبلیغی جماعت کی تشکیل کسی شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ کی ہوئی ہو تو شہری حدود کے اندر جتنے بھی مقامات میں جماعت کا آنا جانا ہو ان میں پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولایزال علیٰ حکمِ السفرحتیٰ ینوی الإقامة في بلدة ،أوقریة خمسةعشر یوما أوأکثر.(۱)

ترجمہ:

اور وہ شخص اس وقت تک مسافر کے حکم میں رہے گا، جب تک کہ وہ کسی گاؤں یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔

❁❁❁

(۱)الهداية، كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر:۱/۱۱٤

سفرِ شرعی کی مقدار سے کم مسافت کی صورت میں نماز کا حکم

سوال نمبر (49):

میرا گھر کرک میں ہے جب کہ میں کوہاٹ کی ایک میڈیسن کمپنی میں ملازم ہوں۔ ہفتہ میں ایک بار گھر جاتا ہوں۔اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا میں کوہاٹ میں قصر نماز پڑھوں گا یا پوری نماز؟ وضاحت فرمایئے۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کوئی شخص جب سفر کی نیت کر کے گھر سے نکلتا ہے۔اور وہ سفر شرعی مسافت کے برابر ہو تو جب تک واپس وطن اصلی نہ لوٹے یا کسی علاقے میں پندرہ دن تک ٹھہرنے کی نیت نہ کرے، مسافر رہے گا اور قصر نماز پڑھے گا، تاہم جہاں پر سفرِ شرعی کی مقدار پوری نہ ہو تو وہاں پر ہر صورت میں پوری نماز ادا کرے گا۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق چونکہ کرک کا رہنے والا جب کوہاٹ کے سفر سے نکلتا ہے تو وہ شرعی مسافر متصور نہ ہوگا، کیونکہ کرک اور کوہاٹ کے درمیان فاصلہ سفرِ شرعی کی مقدار (۷۸ کلومیٹر) سے کم ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

السفر الذي يتغير به الأحكام أن يقصد مسيرة ثلثة أيام ولياليها بسير الإبل ومشي الأقدام.(۱)

ترجمہ:

وہ سفر جس کی وجہ سے احکام متغیر ہوتے ہیں وہ ہے کہ جب تین دن اور تین راتیں اونٹ کی رفتار یا پیدل چلنے کے برابر سفر کا ارادہ کرے۔

❀❀❀

وطن اصلی پر گزرنے کے بعد سفر کا حکم

سوال نمبر (50):

زید اٹک میں مقیم ہے (یعنی اٹک اس کا وطن اقامت ہے) اور اس کا وطن اصلی جہانگیرہ ہے۔اب زید جب

(۱) الهداية، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ۱/۱۷۳

کبھی اٹک سے پشاور آتا ہے تو وطن اصلی جہانگیرہ پر سے گذر کرتا ہے۔اٹک سے پشاور تک شرعی مسافت کا سفر بنتا ہے۔ جب کہ جہانگیرہ سے پشاور تک نہیں بنتا۔سوال یہ ہے کہ صرف اس گذرنے کی وجہ سے اس کے احکامِ سفر پر اثر پڑے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

جواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہاے کرام کی تصریحات کے مطابق وطن اصلی یا وطن اقامت پر گزرنے سے سفر کے احکامات باطل ہوجاتے ہیں،البتہ اگر گزرنے کے بعد آگے کا سفر مسافتِ شرعی کے برابر ہو تو گذر جانے کے بعد دوبارہ سفر کے احکام شروع ہوجاتے ہیں۔

مذکورہ صورت میں اٹک سے پشاور آتے ہوئے وطن اصلی جہانگیرہ پہنچنے پر احکام سفر ختم ہوجاتے ہیں،لہٰذا اس کے بعد جب پشاور پہنچ جائے تو یہ شخص شرعی مسافر شمار نہ ہوگا اور پوری نماز پڑھے گا،کیونکہ جہانگیرہ اور پشاور کے مابین کا فاصلہ سفر کی مقدار سے کم ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والحاصل:أن إنشاء السفر يبطل وطن الإقامة إذا كان منه،أما لو أنشأه من غيره فإن لم يكن فيه مرور على وطن الإقامة، أو كان ولكن بعد سيرثلاثة أيام فكذلك،ولو قبله لم يبطل الوطن بل يبطل السفر؛لأن قيام الوطن مانع من صحته.(۱)

ترجمہ:

اور خلاصہ یہ ہے کہ سفر کا شروع کرنا وطن اقامت کو باطل کرتا ہے۔جب یہ سفر اسی وطن اقامت سے شروع کیا جائے۔اگر وطن اقامت کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے سفر شروع کیا جائے تو اگر وطن اقامت پر گزرنا نہ ہو یا وطن اقامت پر گزرنا ہو،لیکن تین دن سفر کرنے کے بعد تو پھر یہی حکم ہے (یعنی وطن اقامت کا باطل ہونا) اور اگر (تین دن سفر کے برابر ہونے سے) پہلے پہلے اس وطن اقامت پر گزر ہو تو یہ وطنِ اقامت کو باطل نہیں کرتا، بلکہ یہ سفر باطل ہوگا،اس لیے کہ وطن اقامت میں قیام کرنے سے سفر شرعی کی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلوٰۃ،باب صلوٰۃ المسافر،مطلب فی الوطن الأصلي ووطن الإقامة:۲/۶۱۵

مقیم مقتدی کی بقیہ رکعتوں میں قرأت

سوال نمبر(51):

اگر امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم ہو، تو جب امام دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر لے تو مقتدی آخری دو رکعتوں میں قرأت کریں گے یا نہیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ امام مسافر نے دو رکعت پڑھ لی۔ اب امام جانا چاہتا ہے اور مقتدی جو مقیم ہیں، ان کی صف ایک دیوار سے دوسری دیوار تک مکمل کھڑی ہے اور مسجد میں آگے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ہے تو یہ امام اس صف سے کس طرح نکلے گا؟ اس کا طریقہ کیا ہے۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعت مطہرہ کی رو سے مسافر امام کا نماز سے فراغت کے بعد مقیم مقتدی کے لیے اپنے بقیہ نماز کا پورا کرنا ضروری ہے۔ چونکہ یہ مقتدی کے حکم میں ہے، اس لیے آخری رکعتوں میں قرأت کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ فاتحہ کی مقدار خاموش کھڑا ہو کر رکوع کرے گا۔

صورتِ مسئولہ میں جب امام اپنے دو رکعت نماز پڑھنے سے فارغ ہو جائے اور باہر جانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو انتظار کرے تاکہ لوگ نماز سے فارغ ہوں، تب وہاں سے باہر نکلے۔ تاہم شدید عذر یا سخت ضرورت کی بنا پر اگر امام صفوں کو چیر کر نکل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وصح إقتداء المقیم بالمسافر في الوقت و بعده،فإذا قام) المقیم (إلی الإتمام لا یقرأ) ولا یسجدللسھو(في الأصح)؛لأنہ کاللاحق.(۱)

ترجمہ:

اور مقیم کی اقتدا مسافر کے پیچھے وقتی نماز میں اور قضا دونوں میں جائز ہے۔ اور جب مقیم مقتدی اپنی بقیہ نماز کو پورا کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو صحیح قول کے مطابق قرأت اور سجدہ سہو نہیں کرے گا، کیونکہ وہ لاحق کی طرح ہے۔

❁❁❁

(۱) الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر:۲/ ۶۱۰،۶۱۱

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت میں نماز کا حکم

سوال نمبر(52):

اگر ایک شخص پشاور میں مستقل مقیم ہو،لیکن اس کا وطن اصلی دیر ہو اور وہاں پر اس کی جائیداد وغیرہ موجود ہو اور باقی سب کچھ یہاں پر ہو تو اس شخص کی نماز کا حکم سفر وحضر کے اعتبار سے کیا ہوگا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہی رو سے اگر کسی شخص کی پیدائش اپنے گاؤں سے دور دوسری جگہ ہوئی ہو اور اب وہ شخص اہل وعیال کے ساتھ اس دوسری جگہ میں مستقل سکونت پذیر ہو بایں طور کہ اس کی معیشت وجائیداد وغیرہ یہاں پر ہو،لیکن اس کے وطن اصلی میں اس کے رشتہ دار،زمین،جائیداد اور گھر وغیرہ موجود ہوں اور اس نے اس کو چھوڑنے کا عزم نہیں کیا ہو تو یہ دونوں جگہیں اس کے وطنِ اصلی شمار ہوں گے اور دونوں جگہوں میں پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا۔

مذکورہ شخص کے لیے پشاور اور دیر دونوں وطن اصلی شمار ہوں گے اور دونوں جگہوں میں پوری نماز ادا کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(ویبطل الوطن الأصلي بمثله ......)وفي المجتبیٰ: نقل القولین فیما إذانقل أهله ومتاعه، وبقي له دور وعقار،ثم قال:وهذا جواب واقعة ابتلینا بها وکثیرمن المسلمین المتوطنین في البلاد، ولهم دور،وعقار في القریٰ البعیدة،منها یصیفون بهابأهلهم ومتاعهم،فلا بد من حفظها أنهما وطنان له لا یبطل أحدهمابالآخر.(۱)

ترجمہ:

اور وطن اصلی دوسرے وطن اصلی کی وجہ سے باطل ہوتا ہے۔اور مجتبیٰ میں دو قول نقل کیے گیے ہیں۔اس صورت کے بارے میں کہ جب کوئی شخص اپنے وطن اصلی سے اپنا اہل وعیال اور ساز وسامان منتقل کرے اور اس کا گھر اور زمین وغیرہ وہیں پر باقی رہے۔پھر فرمایا ہے کہ یہ جواب ہے اس واقعہ کا جس میں ہم مبتلا ہیں اور بہت سے مسلمان لوگ جنہوں

(۱) البحرالرائق،کتاب الصلوۃ،باب المسافر:۲/۲۳۹

نے شہروں میں جا بجا مستقل سکونت اختیار کی ہو اور ان کے اپنے اپنے گاؤں میں گھر و جائیداد وغیرہ ہوں، جن میں یہ لوگ اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ گرمی کے ایام گذار لیتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان دونوں جگہوں کی حفاظت کے واسطے ہم یہ کہیں کہ یہ دونوں ان کے وطن اصلی ہیں اور ان میں ہر ایک دوسرے کی وجہ سے باطل نہیں ہوتا۔

❁❁❁

دورانِ سفر گاڑی میں نماز پڑھنا

سوال نمبر (53):

دوران سفر اگر کوئی گاڑی ایسی ہو کہ اپنے سٹاپ کے علاوہ دوسری جگہ نہیں رکتی اور نماز کا وقت ہو تو اس گاڑی کے اندر نماز کی ادائیگی درست ہے یا نہیں؟ اور کیا قیام وقبلہ رخ ہونا ضروری ہے؟ نیز یہ ممکن ہے کہ مرد گاڑی سے نیچے اتر آئیں، لیکن عورتیں نہیں اتر سکتیں تو ان کی نماز کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

گاڑیوں اور ریل گاڑی میں نماز کا مسئلہ قابلِ تفصیل ہے کہ اگر وہ کھڑی ہوئی ہو تو اس میں نماز پڑھنا زمین پر نماز پڑھنے کے حکم میں ہے یعنی قبلہ رُخ، قیام، رکوع اور سجدہ ضروری ہوگا (کہ نہ تو اشارہ سے نماز جائز ہے اور نہ ہی بیٹھ کر) اور اگر وہ (گاڑی) چل رہی ہو تو وہ چلتی ہوئی کشتی کے حکم ہے، اس لیے اس میں رکوع، سجدہ اور قعدہ ضروری ہے یعنی بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، اگر کسی نے اشارہ سے نماز پڑھی تو اس کا اعادہ کرے گا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر سواری ایسی ہو، جس میں فرض اور واجب نماز ادا کرتے وقت نماز کی تمام شرائط کے ساتھ قیام اور قبلہ رخ ہونے کی شرط بھی پوری کی جا سکے تو اس صورت میں نماز کی ادائیگی بلا شبہ درست ہے، مثلاً: ریل گاڑی وغیرہ، تاہم جس گاڑی میں قیام کی شرط پوری نہ ہوتی ہو تو ایسی صورت میں گاڑی کے اندر بیٹھ کر رکوع، سجدہ اور قعدہ کے ساتھ نماز پڑھنے کی گنجائش پائی جاتی ہے، لیکن پھر بھی ابتداً قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے۔ اگر گاڑی میں اشارہ سے نماز پڑھی تو بعد میں اس نماز کا دہرانا ضروری ہے۔

جہاں تک عورتوں کی نماز کا مسئلہ ہے تو چونکہ سفر کی وجہ سے نماز کی فرضیت ان سے بھی ساقط نہیں ہوتی، اس لیے پردہ کا اہتمام کرتے ہوئے نماز ادا کرنے کی کوشش کریں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها القيام في فرض) وملحق به كنذر وسنة فجر في الأصح (لقادر عليه). قال ابن عابدين: قوله: (لقادر عليه) فلو عجز حقيقة وهو ظاهر، أو حكما كما لو حصل له به ألم شديد، أو خاف زيادة المرض. (١)

ترجمہ:

شرائطِ نماز میں سے ایک شرط فرض نماز میں قیام ہے (اور صحیح قول کے مطابق ان نمازوں میں بھی قیام شرط ہے) جو فرض کے ساتھ ملحق ہیں، جیسا کہ نذر اور فجر کی سنتیں ہیں یہ اس شخص کے لیے جو قیام پر قادر ہو۔ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مصنفؒ کے قول "لقادر علیہ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر عاجز ہوگیا قیام کی ادائیگی سے حقیقۃً، جیسا کہ ظاہر ہے اور یا حکماً عاجز ہوگیا، جیسا کہ کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کو شدید درد پہنچتا ہو، یا مرض کی زیادتی کا خوف ہو (تو اس صورت میں اس سے قیام ساقط ہوگا اور باقی شرائط کی رعایت کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھے)۔

وأما الصلاة في السيارات البرية من القطارات ونحوها، فعند الوقوف حكمها كحكم الصلاة على الأرض، وعند السير حكمها كحكم الصلاة في السفينة السائرة، فمن صلى فيها قاعدا بركوع وسجود أجزأت، ومن صلى فيها بالإيماء للزحمة وضيق المحل فالظاهر من النظائر أن يعيد الصلاة. (٢)

ترجمہ:

اور خشکی پر چلنے والی گاڑیوں، جیسے ریل گاڑی وغیرہ، میں نماز (کا حکم یہ ہے) جب یہ کھڑی ہو تو اس میں نماز پڑھنا زمین پر نماز پڑھنے کے حکم میں ہے اور جب چل رہی ہو تو اس میں نماز پڑھنا چلتی کشتی میں نماز پڑھنے کے حکم میں ہے۔ پس جس نے اس میں بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ جائز ہے اور جس نے رش اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے اشارہ سے نماز پڑھی تو ظاہر یہ ہے کہ وہ نماز دہرائے گا۔

❁❁❁

(١) ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الصلوٰة، باب صفة الصلوٰة، مطلب: بحث القيام: ٢/١٣١

(٢) منهاج السنن، باب ماجاء في الصلاة على الدابة حيث توجهت: ٢/٢٣٤

وطنِ اصلی میں تعدد

سوال نمبر(54):

میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ شہر میں رہتا ہوں، لیکن میرا وطنِ اصلی اور آبائی گاؤں کہیں اور ہے، جس میں گھر اور جائیداد کے علاوہ دادا اور والدین کچھ عرصہ رہے ہیں، لیکن میں وہاں نہیں رہا، البتہ آئندہ رہنے کا ارادہ ہے اور ابھی تک اس کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اسی طرح ایک گاؤں ہے اس کی تفصیل بھی پہلے کی طرح ہے۔ اب پہلے یا دوسرے گاؤں میں پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں مجھے قصر نماز پڑھنی ہوگی یا پوری نماز پڑھنی ہوگی؟ جب کہ دونوں گاؤں میں آبائی رشتہ دار موجود ہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کسی آدمی کے کچھ آبائی رشتہ دار ایک علاقے میں ہوں اور کچھ دوسرے علاقے میں اور ہر علاقے میں رشتہ داروں کے علاوہ اس شخص کا ذاتی گھر اور جائیداد بھی موجود ہو اور اس علاقے کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہو تو یہ دونوں علاقے اس شخص کے متعدد وطنِ اصلی متصور ہوں گے اور یہ شخص جس علاقے میں بھی ٹھہرے گا اور جتنے عرصے کے لیے رہے گا، بہر صورت پوری نماز پڑھے گا، اس لیے کہ مذکورہ علاقے میں اس کے گھر اور جائیداد کا موجود ہونا اس کے وطنِ اصلی ہونے کے لیے کافی ہے، خصوصاً اس صورت میں جب اس شخص کا دوبارہ یہاں آباد ہونے کا ارادہ بھی ہو، لہٰذا مذکورہ شخص ان دونوں علاقوں میں پوری نماز پڑھے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ثم الوطن الأصلي يجوز أن يكون واحداأو أكثر من ذلك بأن كان له أهل، ودار في بلدتين أو أكثر ولـم يكن من نية أهله الخروج منها وإن كان هو ينتقل من أهل إلىٰ أهل في السنة حتىٰ إنه لو خرج مسافرا من بلدة فيها أهله ودخل في أي بلدة من البلاد التي فيها أهله فيصير مقيما من غير نية الإقامة.(١)

ترجمہ: وطنِ اصلی کا ایک یا متعدد ہونا بھی جائز ہے۔ اس طرح سے کہ اس کے گھر و اہل وعیال دو شہروں یا زائد میں ہوں اور اہل وعیال کی اس سے نکلنے کی نیت نہ ہو، اگرچہ وہ خود سال میں ایک اہل سے دوسرے اہل کی طرف منتقل ہوتا

(١) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان ما يصير به المسافر مقيماً: ١/٤٩٨

رہتا ہو، یہاں تک کہ اگر ایک ایسے شہر سے جس میں اس کے اہل وعیال ہوں، مسافر ہو کر نکلے اور کسی ایسے شہر میں داخل ہو جائے جہاں اس کے دوسرے اہل رہ رہے ہوں تو بغیر نیتِ اقامت کے مقیم متصور ہوگا۔

ولو كان له أهل بالكوفة وأهل بالبصرة فمات أهله بالبصرة وبقي له دور وعقار بالبصرة قيل: البصرة لاتبقىٰ وطناً له ؛لأنها إنما كانت وطناً بالأهل لا بالعقار،ألاترىٰ أنه لو تأهل ببلدة لم يكن فيها عقار ، صارت وطناله، وقيل:تبقىٰ وطناله؛لأنها كانت وطناله بالأهل والدار جميعاًفبزوال أحدهما لا يرتفع الوطن.(١)

ترجمہ:

اگر کسی شخص کے بیوی بچے کوفہ میں بھی ہوں اور بصرہ میں بھی اور بصرہ والی بیوی مر جائے اور وہاں اس کا گھر اور جائیداد رہ جائے تو ایک قول یہ ہے کہ بصرہ اس کے لیے اب وطنِ اصلی نہیں رہے گا، اس لیے کہ بصرہ اس کے لیے اہل وعیال بسانے کی وجہ سے وطنِ اصلی تھا نہ کہ جائیداد کی وجہ سے، (اس کی تائید میں) کیا آپ فقہائے کرام کا یہ قول نہیں دیکھتے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ میں اہل وعیال بسا دے، جہاں اس کی کوئی جائیداد نہ ہو تو پھر بھی یہ جگہ اس کے لیے وطن بن جاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بصرہ تب بھی اس کے لیے وطنِ اصلی ہی رہے گا، اس لیے کہ پہلے یہ مقام اہل وعیال اور جائیداد دونوں کی وجہ سے وطنِ اصلی تھا، لیکن اب ان میں سے ایک (سبب یعنی اہل وعیال) کے زوال سے اس کی وطنیت کا حکم ختم نہیں ہوگا۔ (بلکہ صرف جائیداد رہ جانے سے یہ پھر بھی وطنِ اصلی ہی رہے گا)۔

❁❁❁

قدیم محلے کا شہر سے الگ ہو جانا

سوال نمبر (55):

شہر کی حدود میں کمی واقع ہو اور پرانے شہر کا کوئی محلّہ نئے شہر سے الگ ہو جائے تو قصر کے لیے اس پرانے محلے کو عبور کرنا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر شہر کے پھیلاؤ میں اضافہ واقع ہو جائے اور شہر سے کافی دور کی وہ آبادیاں جو پہلے شہر کے تابع نہ تھیں بلکہ مستقل آبادیاں تھیں، مثلاً: الف، ب، ج، د، وغیرہ وہ آبادیاں ہیں جو پہلے مستقل تھیں اور شہر کے تابع نہ تھیں، لیکن اب شہر کے پھیلاؤ کی وجہ سے شہر میں داخل ہو گئی ہیں۔ نیا شہر تقریباً سات بڑے اضلاع پر مشتمل ہے، ہر

(١) البحر الرائق، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ٢/٢٣٩

ضلع کا بلدیاتی نظام دوسرے سے الگ ہے اور ہر ضلع میں بستیاں، کالونیاں اور محلے ہیں، قدیم شہر کا رہائشی کب مسافر شمار ہوگا؟ اپنے محلے سے نکلنے کے بعد، ضلع سے نکلنے کے بعد یا قدیم شہر سے نکلنے کے بعد؟

یاد رہے کہ شہر کی قدیم حدود اور جدید شہر کے درمیان پچاس کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ نیز مختلف اضلاع والے جب قدیم شہر جانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں: ہم شہر جارہے ہیں۔ ہم شہر سے آرہے ہیں۔ اسی طرح قدیم شہر اور الف، ب، ج، د کے درمیان بڑی ندیاں اور خالی زمینیں بھی تھیں جن پر پل بن گیں۔ ندیاں اور خالی زمینیں بھی شہر کی نئی اور جدید توسیع کے بعد شہر کے وسط کے قریب آگئی ہیں۔ شہر کا یہی پھیلاؤ جاری رہا اور ایک شہر دوسرے شہر کی آبادی سے مل گیا، روڈ کے اس طرف ایک شہر اور دوسری طرف دوسرا شہر ہے۔ ایسی صورت میں دونوں کو ایک ہی شہر کہا جائے گا یا دونوں الگ الگ شمار ہوں گے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مصر یا قریہ جس کو اردو میں گاؤں سے تعبیر کیا جاتا ہے، عرف کے حوالے سے اس کے لیے کوئی خاص تحدید نہیں اور نہ معاشرتی حوالے سے اس پر کوئی پابندی ہے کہ اتنی آبادی تک ایک شہر رہے گا اور اس سے زائد آبادی پر دوسرا شہر شمار ہوگا۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ رقبہ یا آبادی کے حوالے سے شہروں میں یکسانیت اور ہم آہنگی ضروری نہیں ہے، شہر کی حدود کی تعیین میں فعال کردار عرف کا ہے۔ بسا اوقات قریب کی آبادی علاقائی رسم و رواج اور معاشرتی حالات کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور ہر ایک حصہ مستقل نام اختیار کر کے دونوں الگ الگ شہر شمار ہوتے ہیں اور کبھی آبادی کے درمیاں خالی جگہوں اور بڑے بڑے پلاٹوں کی موجودگی کے باوجود ایک شہر کی حدود دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں مستقل منصوبہ بندی نہ ہو تو عرف کے حوالے سے یہ متعین ہوگا لیکن آج کل ترقی یافتہ دور میں جہاں شہر یا آبادی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، حکومتوں کو خود یہ مسئلہ درپیش ہے کہ دیہات کی بجائے لوگ شہر کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ آئے دن شہروں میں آبادی کے اضافہ کی وجہ سے آمد و رفت اور دوسرے انتظامی مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے حکومتیں خود شہر کے لیے حدود متعین کرنے پر مجبور ہوتی ہیں، چنانچہ حکومتی تحدید بھی بسا اوقات عرف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ راولپنڈی اور اسلام آباد دونوں کی اپنی اپنی آبادیاں لاکھوں کی تعداد میں ہے، بعض ضروریات، مثلاً ایئرپورٹ اور ریلوے سٹیشن میں شریک بھی ہیں لیکن بایں ہمہ دونوں الگ الگ شہر ہیں۔ اگر اس کا موازنہ کراچی سے کیا جائے تو کراچی کی آبادی جڑواں شہروں (راولپنڈی

اور اسلام آباد) کے رقبہ اور آبادی سے کئی گنا زیادہ ہے، علاوہ ازیں حدود کی تعیین میں بسا اوقات انتظامی مسائل کے علاوہ سیاسی مسائل بھی کارفرما ہوتے ہیں، کچھ لوگ انتخابی مواقع پر اپنے اپنے گاؤں کو بڑے شہر سے ملانے کے لیے اور شہری سہولیات سے استفادہ کے لیے متعلقہ شہر کی حدود کو وسعت دیتے ہیں، چنانچہ انتظامیہ اس کی تابع ہو کر شہر کے دائرے میں وسعت پر مجبور ہوتی ہے، اگرچہ ابتدائی ایام میں لوگوں کو غیر مانوس سا لگتا ہے لیکن رفتہ رفتہ عوامی ذہن بھی اس کو قبول کر لیتا ہے۔ان حالات کی روشنی میں ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شہر کی حدود کی تعیین میں ہم عرف پر اعتماد کریں جس کی پشت پر سرکاری حد بندی کارفرما ہوتی ہے، اس لیے سرکاری حد بندی بھی اس میں مدنظر رہے۔ ہاں اگر عرف ہو اور سرکاری حد بندی نہ ہو تو پھر بھی صرف عرف حد بندی کے لیے کافی متصور ہوگا اس لیے محررہ سوال میں شہر کی وسیع آبادی جب وسعت کی وجہ سے الف، ب، ج، د، وغیرہ سے متجاوز ہو کر ہ، و، ز تک پھیل جائے گی تو مؤخر الذکر آبادی اگرچہ پہلے شہر کی حدود کا حصہ نہیں تھی لیکن ابھی شہر کا حصہ شمار ہوگی اور سفر و اقامت کے احکامات موجودہ حدود کے مطابق ہی لاگو ہوں گے۔ یاد رہے کہ عرف کو مدار بنا کر آبادی کے درمیان خالی جگہوں اور نالی ندیوں کے ہونے کے باوجود شہر ایک ہی ہے اور ان ندی نالوں کی دونوں جانب کی آبادی ایک ہی شہر کی آبادی شمار ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

والصحیح ماذکرنا أنه یعتبر مجاوزة عمران المصر إلا إذا کان ثمة قریة أو قریً متصلة بربض المصر فحینئذ یعتبر مجاوزة القریٰ.(۱)

ترجمہ:

صحیح بات وہ ہے جو ہم نے ذکر کی کہ شہر کی آبادی سے گزرنے کا اعتبار کیا جائے گا، البتہ اگر پہلے وہاں بستی ہو یا بستیاں شہر کے اصطبل کے ساتھ متصل ہوں تو اس وقت ان بستیوں سے گزرنے کا اعتبار ہوگا۔

إن کان في الجانب الذي خرج منه محلة منفصلة عن المصر وفي القدیم کانت متصلة بالمصر لا یقصر حتیٰ یجاوز تلك المحلة.(۲)

---

(۱) محمود بن أحمد بن عبدالعزیز، عمر بن مازة البخاري، المحیط البرهاني، کتاب الصلوة، الفصل الثاني والعشرون في صلوة المسافر، نوع آخر في بیان المسافر متیٰ یقصر الصلوة: ۱۲۷/۲، المکتبة الغفاریة، کوئٹه

(۲) فتح القدیر، کتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ۸/۲

ترجمہ:

مسافر جس جانب سے شہر کی حدود سے نکلتا ہے، اگر اس جانب کوئی ایسا محلہ ہو جو فی الحال شہر کی آبادی سے جدا ہو، لیکن پہلے یہ شہر کے ساتھ ملا ہوا تھا تو یہ شخص اس وقت تک قصر نہیں کرے گا، جب تک اس محلہ سے نہ گزر جائے۔

❀❀❀

امام کے مسافر ہونے کا علم نہ ہونا

سوال نمبر(56):

ایک آدمی خود مقیم ہو اور وہ مسافر امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو، لیکن اس کو ابتدا میں امام کے مسافر ہونے کا علم نہ ہو تو کیا ایسے امام کے پیچھے اقتدا درست ہو جائے گی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مقتدی کے لیے امام کی حالت حضر وسفر سے باخبر ہونا ضروری ہے، اگر امام کی حالت کا علم نہ ہو تو اس کی اقتدا امام کے پیچھے درست نہیں ہوگی، کیوں کہ امام کی حالت کا جاننا اقتدا کی صحت کے لیے شرط ہے، تاہم ابتدا ہی سے اس کا جاننا ضروری نہیں بلکہ نماز کے درمیان یا امام کے سلام پھیرنے کے بعد امام کے اعلان سے حالت معلوم ہونے سے بھی یہ شرط پوری ہو جائے گی اور مقتدی کی نماز درست ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر امام کو سلام پھیرنے کے بعد بآوازِ بلند لوگوں کو اعلانیہ طور پر اپنے مسافر ہونے کی خبر دینا ضروری ہے، لیکن اگر مقتدی اپنی نماز کے اختتام تک امام کی حالت سے بے خبر رہا تو نماز فاسد ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذا اقتدیٰ بالإمام لایدري أمسافر هو أم مقیم لایصح؛ لأن العلم بحال الإمام شرط الأداء بجماعة، لأنه شرط في الابتداء.(۱)

ترجمہ:

امام کے پیچھے نماز پڑھے لیکن امام کے مسافر یا مقیم ہونے کی خبر نہ ہو تو یہ اقتدا درست نہیں، کیونکہ امام کی حالت کا

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوۃ، باب المسافر، تحت قوله:(وبعکسه صح فیهما): ۲/۲۳۸

جاننا جماعت کی نماز کی ادائیگی کے لیے شرط ہے، لیکن ایسا نہیں کہ ابتدا ہی سے جاننا شرط ہو۔

❁❁❁

سامانِ ضرورت باقی رہنے کی صورت میں وطنِ اقامت کی تبدیلی

سوال نمبر(57):

اگر ایک طالب علم ایک سال کے لیے داخلہ فارم پُر کر کے مدرسہ میں رہائش اختیار کرے اور پندرہ دن سے زائد عرصہ مدرسے میں متواتر گزارنے کے بعد وہ ایک تعلیمی سال مکمل کر کے گھر چلا جائے اور اس کے گھر اور مدرسے کے درمیان شرعی سفر کی مسافت کی مقدار کا فاصلہ ہو تو کیا یہ طالب علم آئندہ سال اس مدرسے میں دوبارہ آنے سے فوراً مقیم شمار ہوگا یا نہیں؟ اور چھٹیوں کے دوران کسی ضرورت کے لیے مدرسہ آنے پر وہ مقیم ہوگا یا مسافر؟ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مذکورہ طالبِ علم نے ایک سال مکمل ہونے کے بعد اس مدرسے سے نہ تو اپنا سامانِ ضرورت (بستر، بکس وغیرہ) منتقل کیا ہے اور نہ ہی اس نے اس مدرسے کو چھوڑنے کا باقاعدہ عزم کیا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی سفر کی مقدارِ مسافت طے کرنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی جگہ پندرہ دن سے زائد قیام کرلے تو وہ جگہ اس کے لیے وطنِ اقامت بن جاتا ہے۔ پھر مذکورہ جگہ کی وطنیت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک مذکورہ شخص اس جگہ کو باقاعدہ چھوڑنے کا عزم وارادہ کر کے یہاں سے اپنا سامان اور مال ومتاع نہ لے جائے۔ اگر اس شخص کا سامان اس جگہ موجود ہو اور وہ دوبارہ آنے کا ارادہ رکھتا ہو تو دوبارہ اس جگہ آنے کی صورت میں وہ فوراً مقیم شمار ہوگا جس کے لیے کسی جدید نیت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

مسئولہ صورت میں کسی طالب علم کی نیت اگر فی الحال مدرسہ چھوڑنے کی نہ ہو، بلکہ وہ صرف چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر چلا گیا ہو اور اس کا بستر اور بکس وغیرہ مدرسہ میں موجود ہوں تو وہ بدستور مقیم شمار ہوگا، لہٰذا چاہے وہ آئندہ سال آنا چاہے یا چھٹیوں میں کسی ضرورت کے لیے آئے، بہر صورت مقیم شمار ہوگا اور پوری نماز پڑھے گا۔

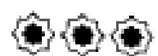
والدّلیل علیٰ ذلک:

کوطن الإقامة تبقی ببقاء الثقل وإن أقام بموضع آخر.(۱)

(۱) البحرالرائق، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ۲/ ۲۳۹

ترجمہ:

(وطن اصلی اہل وعیال کی منتقلی یا فوت ہو جانے سے باطل نہیں ہوتا، جب تک اس میں گھر یا جائیداد وغیرہ موجود رہے) جس طرح کہ وطن اقامت سامان ضرورت کے باقی رہنے سے باقی رہتا ہے اگرچہ (کوئی شخص) کسی اور جگہ اقامت اختیار کرلے۔



مسافر تبلیغی جماعت کی شہر کے مختلف حصوں میں نماز

سوال نمبر (58):

تبلیغی جماعت کی تشکیل کراچی ہوئی تو کراچی کے مختلف علاقوں میں کام کرتے وقت شرکاء جماعت پوری نماز پڑھیں گے یا قصر کریں گے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

تبلیغی جماعت یا کوئی فرد اگر ایسے علاقے میں پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کرے جو عرف میں ایک علاقہ سمجھا جاتا ہو اور نام بھی ایک ہو یا ایک ہی شہر کے اندر مختلف علاقوں اور مقامات میں ٹھہرنے کی ترتیب ہو تو پھر یہ جماعت یا فرد اتمام کرے گا، کیونکہ یہ علاقہ یا شہر اس کے لیے وطن اقامت کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ اگر علاقہ ایک نہ ہو بلکہ عرف میں ہر بستی دوسری بستی سے الگ سمجھی جاتی ہو اور ہر علاقے کا نام بھی الگ ہو تو پھر مسافر کے حکم میں شمار ہو کر جماعت یا فرد قصر کرے گا، دراصل جہاں کہیں سارے علاقے ایک ہی نام سے موسوم ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے تابع ہوا کرتے ہیں اور جہاں ہر علاقہ مستقل حیثیت رکھتا ہو اور مستقل نام ہو تو وہ کسی اور علاقے کا تابع نہیں ہوتا، کئی ساری بستیاں اور علاقے جو ایک دوسرے کے تابع ہوں، ایک ہی علاقہ شمار کیا جاتا ہے، چونکہ کراچی شہر کے تمام مقامات کراچی کے تابع ہیں تو پورا کراچی ایک ہی علاقہ شمار ہوگا، اس لیے تبلیغی جماعت کی تشکیل اگر پندرہ یوم یا اس سے زائد ہو تو وہ اتمام کریں گے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولو نوى الإقامة خمسة عشر يوما في موضعين، فإن كان كل منهما أصلا بنفسه، نحو مكة،

ومنی،والکوفة،والحیرة لا یصیر مقیماً،وإن کان إحداهما تبعاً للأخر،حتی تجب الجمعة علی سکانه یصیر مقیماً.(۱)

ترجمہ:

کسی نے اگر دو جگہوں میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی اگر ہر علاقہ اپنی جگہ پر مستقل علاقہ (شمار ہوتا) ہو،جیسے: مکہ،منی،کوفہ اور حیرہ تو مقیم نہیں ہوگا اس کے برعکس اگر ایک علاقہ دوسرے کا تابع ہو،اس کے باشندوں پر جمعہ بھی واجب ہو تو مقیم متصور ہوگا۔

❁❁❁

سفر میں سنت نماز

سوال نمبر(59):

اس مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے،بعض لوگ سفر میں سنتیں پڑھتے ہیں اور بعض لوگ چھوڑ دیتے ہیں۔شرعاً سفر میں سنت پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

سفر کی سنتوں کی بابت فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی سنتوں کے علاوہ سنتوں میں قدرے تفصیل ہے،اگر مسافر کا سفر جاری ہے اور مطلوبہ مقام کی مسافت طے کر رہا ہے تو پھر نہ پڑھنا مرخص ہے اور اگر سفر مکمل کرلیا ہے تو پھر پڑھنا افضل ہے،تاہم چونکہ سنت نمازِ سفر میں مطلقاً نوافل کے حکم میں ہیں،اس لیے مسافر سنت نماز اگر ترک کردے تو کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وتکلموافي الأفضل في السنن،فقیل:هومتروك ترخصاً،وقیل:هوالفعل تقرباً،وکان الشیخ أبوجعفریقول:بالفعل في حالة النزول والترك في حالة السیر.(۲)

---

(۱)الفتاوی الهندیة،کتاب الصلوة،الباب الخامس عشرفي صلوة المسافر:۱/۱٤۰

(۲)الفتاوی التاتارخانیة،کتاب الصلوة،الفصل الثاني والعشرون في صلوة المسافر:۲/٥

ترجمہ:

سفر کی سنتوں میں فقہائے کرام نے افضل واولیٰ ہونے میں کلام کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کا چھوڑنا مرخص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کا پڑھنا باعثِ اجر وثواب ہے۔ شیخ ابو جعفر نے کسی جگہ میں قیام کی حالت میں پڑھنے، جب کہ جاری سفر میں چھوڑنے کا قول کیا ہے۔

❁❁❁

مسافر کا سسرال میں نماز پڑھنا

سوال نمبر(60):

زید نے لاہور سے شادی کی اور اہل وعیال سمیت پشاور میں مقیم ہوگیا۔ جب کبھی اپنے سسرال کے گھر لاہور جانا ہو تو میاں بیوی کا لاہور میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق :

جب تک ایک شہر یا گاؤں میں مستقل رہائش اختیار نہ کی ہو، محض شادی کر لینے سے وہ جگہ وطن اصلی نہیں بن سکتی۔

لہٰذا سوال مذکور میں زید اور اس کی بیوی لاہور جا کر قصر کریں گے۔ بیوی کا وطن اصلی پشاور کے وطن اصلی بننے سے باطل ہوگیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بیوی سفر واقامت کے حکم میں خاوند کے تابع رہتی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وطن أصلي: وهو وطن الإنسان في بلدته، أو بلدة أخرىٰ اتخذها داراً وتوطن بهامع أهله وولده، وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها......فالوطن الأصلي ينتقض بمثله لاغير.(۱)

ترجمہ:

وطن اصلی انسان کا اپنے شہر میں یا کسی اور شہر میں وہ وطن ہوتا ہے، جہاں اس نے گھر بنایا ہوا اور یا وہاں اہل وعیال کے ساتھ مستقل طور پر رہ رہا ہو اور اس کا ارادہ یہاں سے کوچ کرنے کا نہ ہو، بلکہ رہنے کا ہو۔۔۔۔۔وطن اصلی اپنی

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بیان مایصیر به المسافر مقیما: ۴۹۷/۱، ۴۹۸

مثل کے ساتھ باطل ہوجاتا ہے، کسی اور چیز سے باطل نہیں ہوتا۔

❁❁❁

میکے میں خاتون کا نماز ادا کرنا

سوال نمبر(61):

پشاور کی رہائشی خاتون شادی کے بعد خاوند کے ہمراہ مستقل طور پر اسلام آباد میں رہنے لگی تو اب والدین کی ملاقات کے لیے جب پشاور آئے تو قصر کرے یا پوری نماز پڑھے؟ حالانکہ والدین کا علاقہ بھی تو اس کا آبائی علاقہ اور وطن اصلی ہے، کیونکہ یہاں پیدا ہوئی ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وطن اصلی اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں انسان پیدا ہوا ہو اور مستقل طور پر وہاں رہتا ہو یا کسی اور علاقے منتقل ہو کر اہل وعیال سمیت وہاں رہ رہا ہو۔ وطن اصلی اپنی مثل یعنی وطن اصلی کے ساتھ باطل ہوجاتا ہے، اس لیے کسی عورت کی شادی اگر کسی ایسی جگہ ہوجائے، جہاں کی مسافت شرعی مقدار کے برابر ہو تو وہ خاوند کی تابع ہو کر وہ جگہ اس کا وطنِ اصلی شمار ہوگا اور پہلا وطن اصلی اس وطن اصلی سے باطل ہوجائے گا، لہٰذا مذکورہ عورت اسلام آباد سے پشاور والدین کے گھر آنے کی صورت میں قصر کرے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(الوطن الأصلي)وهو موطن ولادته،أو تأهله،أو توطنه(يبطل بمثله)إذالم يبق له بالأول أهل،فلو بقي لم يبطل،بل يتم فيهما.(۱)

ترجمہ:

وطن اصلی پیدائش کی جگہ یا اہل وعیال کو بسانے کی جگہ یا وطن بنانے کی جگہ کو کہتے ہیں، وطن اصلی اپنی مثل کے ساتھ اس وقت باطل ہوتا ہے، جب پہلے میں اس کے اہل وعیال نہ رہے۔ اگر اہل باقی رہے تو پھر باطل نہیں ہوگا، بلکہ دونوں جگہ پوری نماز پڑھے گا۔

---

(۱)الدرالمختار علی صدرردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ المسافر:۲/۶۱۴

شکاری کے لیے جنگل میں نیتِ اقامت

سوال نمبر(62):

ہمارے علاقے میں بعض شکاری سفر کی مسافت کے برابر دور دراز ایسے جنگلات میں ایک ایک مہینہ گزارتے ہیں، جہاں زندگی گزارنے کی سہولیات موجود نہیں ہوتیں، یہاں تک کہ پانی بھی ناپید ہوتا ہے تو ان لوگوں کی وہاں نیتِ اقامت درست رہے گی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اقامت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس علاقہ میں اقامت کی نیت کی جارہی ہے، اس میں اقامت کی اہلیت موجود ہو، اس لیے کسی صحرا، بیابان یا جنگل میں صلاحیتِ اقامت مفقود ہونے کی وجہ سے نیتِ اقامت درست نہیں ہوگی، اگرچہ پندرہ دن یا اس سے زائد کا عرصہ گزارنے کی نیت کی ہو۔

لہٰذا سوال مذکور میں اگر یہ جنگل شکاریوں کے وطنِ اصلی یا وطنِ اقامت سے سفر کی مسافت کے برابر یا اس سے زیادہ فاصلے پر ہو تو ان پر سفر کی نماز پڑھنا واجب ہوگا اور پندرہ دن سے زائد عرصہ گزارنے کے باوجود بھی ان کی نیتِ اقامت درست نہیں ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وصلاحیة الموضع،حتیٰ لو نوی الإقامة في برأو بحر،أو جزیرة لم یصح...... وعسکر المسلمین إذا قصدوا موضعاً......فنزلوا مفازة في الطریق،ونصبوا الأخبیة......وعزموا فیها علیٰ إقامة خمسة عشر یوماً،لم یصیروا مقیمین؛لأنها حمولة ولیست بمساکن(۱)

ترجمہ: اور علاقہ با صلاحیت ہو (یعنی اس جگہ سہولیاتِ زندگی موجود ہوں) اس لیے اگر کسی نے بیابان، سمندر یا جزیرے میں ٹھہرنے کی نیت کی تو درست نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کا لشکر اگر کسی جنگل میں ٹھہرنے کا قصد کرلے، اور وہاں خیمے گاڑ دے، اور پندرہ دن کی اقامت کی نیت کرلے تو (لشکر والے) مقیم نہیں بنیں گے، کیونکہ وہ کوچ کرنے والے ہیں، رہائشی نہیں۔

(۱) الفتاویٰ الهندیة،کتاب الصلوٰة،الباب الخامس عشر في صلوٰة المسافر:۱/۱۳۹

مکہ میں مقیم حاجی کا منیٰ میں نماز

سوال نمبر(63):

اگر ایک شخص حج کے ایام میں مکہ میں اقامت کی نیت کرے تو وہ منیٰ میں قصر نماز پڑھے گا یا پوری نماز؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

حضورﷺ نے منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قصر نماز پڑھی تھی، اس لیے کہ آپﷺ مسافر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جب مدینے سے تشریف لائے تو سفری نماز پڑھی، البتہ مقیم لوگوں کو اتمام کا حکم دیا اور حضرت عثمانؓ نے اتمام کیا تھا، کیونکہ آپؓ نے مکہ میں اہل وعیال کو بسایا تھا، لہٰذا جمہور ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ منیٰ میں مسافر قصر اور مقیم پوری نماز پڑھے گا اور جو شخص مکہ میں اقامت کی نیت کرے تو وہ منیٰ میں بھی مقیم شمار ہوگا، کیونکہ مکہ اور منیٰ کے درمیان کا فاصلہ سفرِ شرعی سے کم ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

عن سالم بن عبدالله عن أبيه أن عمربن الخطاب رضى الله عنه كان إذا قدم مكة صلّى بهم ركعتين،ثم يقول:ياأهل مكة!أتمواصلاتكم فإنا قوم سفر.(١)

ترجمہ:

حضرت عمرؓ جب مکہ تشریف لاتے تو لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھاتے، جب سلام پھیرتے تو فرماتے:"اے اہل مکہ! تم اپنی نماز پوری کرلو، ہم مسافر ہیں"۔

وروي أن عثمان كان حاجاً،يصلي بعرفات أربعافاتبعوه،فاعتذر،وقال:إني تأهلت بمكة.(٢)

ترجمہ: اور حضرت عثمانؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ حج کے دوران عرفات میں نماز پڑھ رہے تھے تو چار رکعتیں پڑھیں اور لوگوں نے بھی ان کی اتباع کی تو آپؓ نے اپنا عذر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:"میں نے مکہ میں اہل وعیال کو بسایا ہے"۔

(١) الكاندهلوي،محمدزكريا،أوجز المسالك،صلوة المسافرإذاكان إماماأووراء إمام:٣/١١١

(٢)البحرالرائق،كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر:٢/٢٣٩

مسافرامام کا قصر کی بجائے اتمام کرنا

سوال نمبر(64):

اگر مسافر امام ظہر، عصر یا عشا کی نماز میں قصر کی بجائے اتمام کرے تو اس کی نماز اور مقیم مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کوئی مسافر شخص اگر قصر کی بجائے اتمام کرے اور اول دو رکعتوں کے بعد قعدہ کرے تو نماز درست ہو جائے گی، لیکن قصداً ایسا کرنے سے گناہ گار ہوگا اور اگر دو رکعت کے بعد قعدہ نہیں کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں اگر اقتدا کرنے والے مقیم ہوں تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی، اس لیے کہ مسافر امام کے اتمام کرنے (پوری نماز پڑھنے) سے اخیر کی دو رکعتیں نفل شمار ہوتی ہیں اور متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز درست نہیں ہوتی، لہٰذا وہ مقیم مقتدی اپنی نمازوں کا اعادہ کریں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فلو أتم المقیمون صلاتهم معه فسدت؛لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل.أي إذا قصدوا متابعته،أما لو نووا مفارقته ووافقوه صورة فلا فساد.(۱)

ترجمہ:

اگر مقیم حضرات نے (مسافر امام) کے ساتھ نماز پوری کی تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی، اس لیے کہ یہ فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتدا ہے۔ یہ تب ہے، جب انہوں نے اقتدا کی نیت کی ہو، اگر نیت الگ پڑھنے کی کر لی ہو اور صرف ظاہری موافقت پائی جائے تو فساد لازم نہیں آتا۔



(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر، تحت قوله:(لم یصر مقیما):۲/۶۱۲

اقامت میں باپ بیٹے کا حکم

سوال نمبر(65):

ہمارا وطنِ اصلی چارسدہ ہے۔ میرے والد صاحب کی تبدیلی تربیلہ سے ٹیکسلا ہوگئی ہے۔ اگر ٹیکسلا میں میرا قیام ہو تو قصر کروں گا یا پوری نماز پڑھوں گا؟ اور تربیلہ میں میرے والد صاحب قصر کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ جس طرح وطنِ اقامت وطنِ اصلی سے باطل ہوجاتا ہے، اسی طرح وطنِ اقامت سے بھی باطل ہوجاتا ہے۔ آپ کے والد صاحب تربیلہ سے تبدیلی پر جگہ چھوڑنے کا ارادہ کرکے نکلے تو تربیلہ کے وطنِ اقامت کی حیثیت ختم ہوگئی اور ٹیکسلا میں جب بھی پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہوگا، قصر کا پابند رہے گا، جہاں تک آپ کا ٹیکسلا میں قیام کا حکم ہے تو اس میں آپ اپنے والد کے تابع رہیں گے، چوں کہ ٹیکسلا آپ کے والد صاحب کا وطنِ اقامت ہے تو آپ کو بھی وہاں اتمام کرنا ہوگا، کیونکہ بیٹا سفر کے احکام میں باپ کا تابع ہوتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(والأصل أن الشيء يبطل بمثله) كما يبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي،ووطن الإقامة بوطن الإقامة......ووطن الإقامة بالوطن الأصلي......قوله:(تلميذ)أي إذا كان يرتزق من أستاذه......قلت:ومثله بالأولىٰ الابن البارّ البالغ مع أبيه.(١)

ترجمہ:

قاعدہ یہ ہے کہ ایک چیز اپنی مثل سے باطل ہوجاتی ہے، جیسے (ایک) وطنِ اصلی (دوسرے) وطنِ اصلی سے باطل ہوتا ہے اور (ایک) وطنِ اقامت (دوسرے) وطنِ اقامت سے ۔۔۔۔ اسی طرح وطنِ اقامت وطنِ اصلی سے باطل ہوگا ۔۔۔۔ شاگرد جب اپنے استاد کے زیرِ کفالت ہو (استاد کا تابع ہوگا) ۔۔۔ اسی طرح بالغ فرماں بردار بیٹا باپ کا بطریق اولیٰ تابع رہے گا۔



(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة: ٦١٥/٢ ..

دارالحرب میں قیدی کی نیتِ اقامت وسفر

سوال نمبر(66):

ایک سپاہی دارالحرب میں قیدی بنادیا گیا یا فرار ہوکر کسی غار یا صحرا میں پناہ حاصل کی اور پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کی تو اس کی نیتِ اقامت کا اعتبار ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی علاقے میں مسافر کی نیتِ اقامت اس وقت معتبر ہوگی، جب اس علاقے میں اقامت کی صلاحیت بھی موجود ہو۔اسی طرح لشکر یا فرد جو دارالحرب میں دشمن کے محاصرہ میں ہو یا کسی علاقے کا محاصرہ کرلے، دونوں صورتوں میں نیتِ اقامت کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ وہ قرار اور فرار (ٹھہرنے اور بھاگنے) کے کشمکش میں دن گزار رہا ہے،اس کی مثال اس مسافر کی طرح ہے جو بغیر نیتِ اقامت کے کسی جگہ لمبے عرصے تک قیام کرلے۔

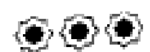
لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جو شخص دارالحرب میں دشمن کے محاصرہ میں ہو یا خلاصی پاکر کسی غار میں پناہ حاصل کرے تو پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کے باوجود قصر کرے گا،اس کی نیتِ اقامت معتبر نہیں ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وکذا الأسیر في دار الحرب إذا انفلت منهم،ووطن علی الإقامة خمسة عشر یوما في غار أو نحوه، لم یصر مقیماً.(۱)

ترجمہ:

اسی طرح قیدی دارالحرب میں جب حربیوں سے چھوٹ ہوجائے اور وہ پندرہ دن کے لیے اسی غار وغیرہ کو وطن اقامت بنائے تو وہ (وہاں پر) مقیم شمار نہیں ہوگا۔



(۱) البخاري،طاهر بن عبد الرشید، خلاصة الفتاوی، کتاب الصلوة،الفصل الثاني والعشرون في صلوة المسافر:۱/۱۹۹

قصرنماز کی ابتدا

سوال نمبر (67):

ایک شخص پی۔ٹی۔سی (P.T.C) اکوڑہ خٹک میں ملازم ہے اور نوشہرہ کا رہائشی ہے۔ اپنے گھر (نوشہرہ) سے تبلیغی اجتماع رائے ونڈ کی نیت سے نکلا۔ اب یہ شخص لاہور جانے سے پہلے اور لاہور سے واپسی پر PTC اکوڑہ خٹک میں پوری نماز پڑھے گا یا قصر کی سہولت سے فائدہ اُٹھائے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسافر جب شرعی سفر کی نیت سے اپنے گاؤں یا شہر کی حدود سے نکل جائے تو اس پر سفر کے تمام احکامات لاگو ہوں گے۔ سوال مذکور میں نوشہرہ اور اکوڑہ خٹک کے درمیان شرعی مسافت کی مقدار سے فاصلہ کم ہے، لیکن رائے ونڈ جانے کی نیت کرنے سے جس وقت یہ شخص نوشہرہ کی حدود سے نکل جائے تو اب نوشہرہ کی حدود میں دوبارہ داخل ہونے تک قصر کرتا رہے گا، جب تک کسی دوسری جگہ پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ملازمت کی جگہ اور وطنِ اصلی کے درمیان اگر فاصلہ شرعی سفر کی مقدار کے برابر ہو، مگر اس جگہ کو پہلے سے وطنِ اقامت بنایا گیا ہو تو پھر اپنے گھر سے سفر کی نیت کرنے کے باوجود ملازمت کی جگہ میں پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر راستہ میں واقع ہونے کی وجہ سے سفر کے خاتمہ کا اعتبار نوشہرہ کی آبادی پر ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الصحيح ماذكر أنه يعتبر مجاوزة عمران المصر لاغير إلا إذا كان ثمة قرية أو قرى متصلة بربض المصر، فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى......وكذا إذا عاد من سفره إلى مصره لم يتم، حتى يدخل العمران. (۱)

ترجمہ:

صحیح قول وہ ہے جو مذکور ہے کہ شہر کی آبادی سے نکلنے کا اعتبار ہوگا، اس کے علاوہ (مقامات سے نکلنے) کا اعتبار نہ ہوگا، مگر جب شہر کے گھوڑ دوڑ میدان (گراؤنڈ) کے ساتھ پیوست کوئی علاقہ ہو تو اس وقت ان علاقوں سے نکل جانے کا اعتبار ہوگا۔۔۔۔ اسی طرح جب سفر سے واپس اپنے شہر کو لوٹے تو آبادی میں داخل ہونے تک اتمام نہیں کرے گا۔

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ۱/۱۳۹

مضافاتِ شہر کی تعیین

سوال نمبر(68):

زید کا گاؤں شہر سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اکثر لوگوں کی آمد و رفت پیدل ہوا کرتی ہے۔ زید سفر سے واپسی پر شہر میں داخل ہونے سے مقیم شمار ہوگا یا گاؤں پہنچنے پر؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی گاؤں یا بستی شہر کے مضافات میں واقع ہو تو دیکھا جائے گا کہ عرف میں یہ علاقہ شہر کے تابع شمار ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر عرف میں شہر کا تابع ہو تو پھر دونوں کا حکم سفر کے اعتبار سے ایک ہوگا، لیکن عرف میں اگر شہر کا تابع نہ ہو تو پھر دونوں کا حکم الگ الگ ہوگا۔ فقہاے کرام نے لکھا ہے کہ: عرف میں کسی گاؤں کا شہر سے الگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شہر سے گاؤں تک عمارتوں کا سلسلہ نہ ہو یا درمیان میں زرعی اراضی ہوں تو یہ مستقل گاؤں شمار ہوگا۔

اس لیے سوال مذکور میں اگر زید کا علاقہ شہر کا تابع ہو تو پھر اس شہر کی حدود میں داخل ہونے سے مقیم سمجھا جائے گا اور اگر زید کا علاقہ شہر کا تابع نہ ہو، بلکہ مستقل حیثیت ہو تو پھر وہ شہر کے حدود میں داخل ہونے کے باوجود بھی مسافر کے حکم میں ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال ابن عابدین تحت قوله:(من خرج من عمارة موضع إقامته)أشارإلى أنه يشترط مفارقته ماكان من توابع موضع الإقامة، كربض المصر،وهوماحول المدينةمن بيوت ومساكن، فإنه في حكم المصر.(١)

ترجمہ:

علامہ ابن عابدین ماتنؒ کے اس قول (جو شخص موضعِ اقامت کی آبادی سے نکلے) کے تحت فرماتے ہیں کہ: ’’موضعِ اقامت کی آبادی اور اس کے مضافات سے مسافر کا نکلنا شرط ہے، جیسے شہر کی گھوڑ دوڑ کی جگہ اور شہر کے ارد گرد کے مکانات اور رہائش گاہیں، کیونکہ وہ شہر کے حکم میں ہیں‘‘۔

❁❁❁

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر: ٥٩٩/٢

وطنِ اصلی کی تبدیلی

سوال نمبر(69):

میرا چارسدہ میں ذاتی مستقل گھر ہے جوکہ کرایہ پر دیا ہے اور زمین بھی ہے۔ میں مستقل طور پر اسلام آباد اہل و عیال سمیت منتقل ہو گیا ہوں۔ میرا وطنِ اصلی اسلام آباد ہوگا یا چارسدہ؟ اور چارسدہ آکر اتمام کروں گا یا قصر؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ وطنِ اصلی انسان کا وہ مقام ہوتا ہے، جہاں وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل طور پر رہ رہا ہو۔ کسی جگہ محض مکان اور زمین کے رہ جانے سے وطنِ اصلی باقی نہیں رہتا۔

لہٰذا سوال مذکور میں چارسدہ سے اسلام آباد اہل وعیال کو مستقل طور پر منتقل کرنے سے چارسدہ کا وطنِ اصلی ہونا باطل ہو گیا اور اسلام آباد وطنِ اصلی شمار ہوگا۔ واضح رہے کہ وطنِ اصلی اپنے مثل، یعنی وطنِ اصلی سے باطل ہو جاتا ہے، لہٰذا چارسدہ آکر قصر کرنا لازم ہوگا، تاہم خیال رہے کہ وطن چھوڑنے کے لیے مستقل عزم کا ہونا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(الوطن الأصلي يبطل بمثله)إذالم يبق له بالأول أهل،فلوبقي لم يبطل،بل يتم فيهما.(١)

ترجمہ:

وطنِ اصلی اپنے مثل سے باطل ہو جاتا ہے، جب پہلے (وطنِ اصلی) میں اہل وعیال نہ رہیں۔ اگر رہیں تو باطل نہ ہوگا، بلکہ پوری نماز پڑھے گا۔

❁❁❁

قصر نماز اور طریقہ کار

سوال نمبر(70):

دورانِ سفر نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ نیز کس کس نماز میں قصر ہے؟

---

(١) الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ المسافر: ۲/ ٦١٤

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ مسلمان مردوعورت عاقل، بالغ پر پنجگانہ نماز فرض ہے، لیکن بعض اوقات اور بعض احوال، عوارض کی وجہ سے نمازوں کی کمیت اور کیفیت میں تعداد نماز تو برقرار رہتی ہے، لیکن تعداد رکعات میں کمی آجاتی ہے، چنانچہ عشا، ظہر اور عصر کی نماز سفر کی حالت میں دودو رکعتیں اور حضر کی حالت میں چار چار رکعتیں فرض ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی، پھر سفر کا حکم اپنی جگہ برقرار رہا اور حضر کے حکم میں اضافہ ہوا''۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن عائشةؓ قالت: فرضت الصلوة ركعتين ركعتين في الحضر والسفر، فأقرت صلوة السفر وزيد في صلوة الحضر. (١)

ترجمہ:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''نماز سفر وحضر میں دو دو رکعتیں فرض ہوئی، پھر سفر کی نماز برقرار رہی اور حضر کی نماز میں اضافہ ہوا''۔

❁❁❁

اقامت کے لیے نیت کی ضرورت

سوال نمبر(71):

ایک شخص ہری پور کا رہنے والا پشاور میں ملازمت کرتا ہے۔ ہر ہفتے گھر جاتا ہے، کبھی کبھار تین ہفتے بھی گزار لیتا ہے، لیکن آج تک اس نے اقامت کی نیت نہیں کی تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی علاقے میں مقیم بننے کے لیے جس طرح مدتِ اقامت تک ٹھہرنا ضروری ہے، اسی طرح

---

(١) سنن أبي داؤد، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ١/١٦٩

نیتِ اقامت بھی ضروری ہے۔ایک آدمی ایک علاقے میں کئی مہینوں سے رہ رہا ہو،لیکن اس نے نیتِ اقامت نہیں کی تو اس کو شرعاً مقیم کہنا صحیح نہیں،لہٰذا مذکورہ شخص مسافر کے حکم میں رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو بقي في المصر سنين علىٰ عزم أنه إذا قضى حاجته يخرج،ولم ينو الإقامة خمسة عشر يوماً قصر.(۱)

ترجمہ:

ایک آدمی کئی سالوں تک ایک شہر میں اس نیت سے ٹھہرا ہوا ہے کہ جب کام ہو جائے گا تو نکل جائے گا اور پندرہ دن تک ٹھہرنے کی نیت نہیں کی تو قصر نماز پڑھے گا۔

❁❁❁

کئی مہینے گزرنے کے باوجود اقامت کی نیت نہ کرنا

سوال نمبر(72):

پشاور کا باشندہ کاروبار کرنے کے لیے لاہور آتا جاتا ہے،لیکن ایک مرتبہ جب لاہور گیا تو آج جاؤں گا،کل جاؤں گا،میں کئی مہینے یا سال گزر گئے،اس کا کیا حکم ہے؟اگر مذکورہ شخص جان بوجھ کر اس طرح کرتا ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سفر کے احکام میں زیادہ تر دخل نیت کا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو شخص کسی علاقے میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے،مسافر کہلائے گا،اگرچہ اس شہر میں سال گزر جائے،لیکن یہ حکم اس شخص کے لیے ہے، جو حقیقت میں تذبذب اور اضطراب کا شکار ہو۔اگر کوئی ویسے ہی آج اور کل کے چکر میں صرف قصر کی سہولت کی خاطر نیتِ اقامت نہیں کر رہا تو یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے اور ناجائز ہے،اسی طرح نماز پڑھنے سے اس کا فریضہ نماز ساقط نہیں ہوگا۔

---

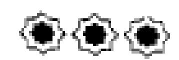
(۱)الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس عشر في صلوة المسافر:۱/۱۳۹

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو دخل مصراً علی عزم أن یخرج غدا،أو بعدغد،ولم ینو مدۃالإقامۃ،حتی بقي علی ذلك سنین قصر.(١)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص کسی شہر میں اس عزم کے ساتھ داخل ہوا کہ کل یا پرسو یہاں سے نکل جائے گا اور اقامت کی نیت نہیں کی، اسی حال میں سالوں تک رہا تو قصر کرے گا۔



سفر میں تابع کے احکامات

سوال نمبر(73):

ایک فوجی کی تقرری ابوظہبی میں ہوئی ہے،لیکن سرکار کے حکم سے ایک ہفتہ دوبئ میں گزارتا ہے اور ایک ہفتہ ابوظہبی میں،لہٰذا دوبئ میں نماز کا کیا حکم ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباالله التوفیق:

مسافر جب ایک مقام پر پندرہ دن گزار لیتا ہے تو یہ جگہ اس کا وطنِ اقامت بن جاتا ہے، جب تک اس کا سامان وغیرہ اس جگہ پڑا رہے گا، یہ اس کا وطنِ اقامت شمار ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص اپنے اختیار سے سفر وا قامت نہیں کر سکتا ہو، بلکہ کسی اور کا تابع ہو تو اس کی اپنی نیت معتبر نہیں ہوگی، بلکہ متبوع کی نیت موثر رہے گی۔

سوال مذکور میں موصوف چونکہ سرکار کا پابند ہے، اس لیے سرکار کا تابع رہے گا اور جس علاقے میں سرکار کی طرف سے پندرہ دن یا اس سے زیادہ تقرری ہو جائے گی، وہ علاقہ اس کا وطنِ اقامت بن جائے گا اور جس جگہ پندرہ دن سے کم قیام کرے گا، وہاں مسافر سمجھا جائے گا، لہٰذا ابوظہبی میں پوری نماز پڑھے گا اور دوسرے شہروں میں قصر کرے گا، اگرچہ پندرہ دن کی نیت کرے، کیونکہ اس کی نیت کا اعتبار نہیں۔

---

(١)الھدایۃ، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ المسافر:١/١٧٤

والدلیل علیٰ ذلک:

کل من کان تبعا لغیرہ یلزمہ طاعتہ یصیر مقیما باقامتہ و مسافرا بنیتہ و خروجہ إلی السفر.(۱)

ترجمہ:

ہر وہ شخص جو دوسرے کا تابع ہو، اس پر اس کی اطاعت لازم ہے، اس کی اقامت کی وجہ سے مقیم ہوگا اور اس کی نیت اور سفر کے لیے نکلنے کی وجہ سے مسافر ہوگا۔

❁❁❁

سفر میں ماتحت کی نیت

سوال نمبر(74):

ایک فوجی اپنے افسر کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ افسر نے شرعی مسافت کے برابر سفر کی نیت نہیں کی تو ایسی صورت میں فوجی کی سفر کی نیت مؤثر ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر فوجی نے سفر کی نیت کر کے قصر نماز پڑھی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سفر اور اقامت کی نیت میں متبوع کا اعتبار ہوگا، تابع کا نہیں۔ فوجی اپنے افسر کا تابع ہوتا ہے اور سفر میں نیت کا بڑا دخل ہے، یہاں تک کہ اگر ایک آدمی پوری دنیا کا چکر کاٹے، مگر نیت سفر کی نہ ہو تو مسافر کے حکم میں شمار نہیں ہوگا۔

سوال مذکور میں جب تک افسر سفر کی نیت نہیں کر پاتا، تب تک فوجی قصر نہیں کرے گا اور جتنی قصر نمازیں پڑھی ہیں، ان کا اعادہ واجب ہوگا۔

والدلیل علیٰ ذلک

کل من کان تبعا لغیرہ یلزمہ طاعتہ یصیر مقیما باقامتہ و مسافرا بنیتہ و خروجہ إلی السفر.(۲)

ترجمہ:

ہر وہ شخص جو دوسرے کا تابع ہو، اس پر اس کی اطاعت لازم ہے، اس کی اقامت کی وجہ سے مقیم ہوگا اور اس

---

(۱) الفتاوی الھندیۃ، کتاب الصلوۃ، الباب الخامس عشر فی صلوۃ المسافر: ۱/ ۱٤۱

(۲) الفتاوی الھندیۃ، کتاب الصلوۃ، الباب الخامس عشر فی صلوۃ المسافر: ۱/ ۱٤۱

کی نیت اور سفر کے لیے نکلنے کی وجہ سے مسافر ہوگا۔

وإن سار به أقل من مسيرة ثلثة أيام، أعاد كل صلوة صلاها ركعتين؛لأنه تبين أنه صلى صلوة المسافرين، وهو مقيم.(١)

ترجمہ:

اگر تین دن مسافت کی مقدار سے کم سفر کیا ہو تو جو بھی نماز اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں، ان کا اعادہ کرے گا، کیونکہ یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس نے مسافروں کی نماز پڑھی ہے، حالانکہ وہ مقیم ہے۔

❁❁❁

سفر میں وطنِ اقامت پر گزرنا

سوال نمبر(75):

میرے گھر سے مدرسے کی مسافت تیس کلومیٹر ہے اور میں نے وہاں اقامت اختیار کی ہے، جب کبھی سفرِ شرعی کی نیت سے گھر سے نکلنا ہو اور مدرسہ میں ٹھہر کر پھر سفر شروع کرنا ہو تو مدرسے میں قیام کے دوران قصر نماز پڑھوں گا یا پوری نماز؟ نیز اگر مدرسہ میرا وطنِ اقامت نہ ہو تو کیا حکم ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کوئی شخص وطنِ اصلی سے سفر شروع کرے اور درمیان میں وطنِ اقامت پر گزر ہو تو ان دونوں جگہ پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں آپ جب وطنِ اصلی سے سفر شروع کریں اور آپ کا گزر اس مدرسہ پر ہو جہاں آپ نے اقامت اختیار کی ہے تو آپ وہاں پر پوری نماز پڑھنے کے پابند ہوں گے اور اگر آپ نے مدرسہ میں اقامت اختیار نہ کی ہو تو پھر مدرسہ میں آپ سفر پر جاتے ہوئے اور واپسی میں مسافر شمار ہوں گے۔

والدّلیل علٰی ذلک:

والحاصل:أن إنشاء السفر يبطل وطن الإقامة إذا كان منه،أما لو أنشأه من غيره فإن لم يكن فيه

(١)البحر الرائق،كتاب الصلوة،باب المسافر،تحت قوله:(من جاوز بيوت مصره):٢٢٧/٢

مرور علیٰ وطن الإقامة، أو كان ولكن بعد سير ثلاثة أيام فكذلك،ولو قبله لم يبطل الوطن بل يبطل السفر؛لأن قيام الوطن مانع من صحته. (١)

ترجمہ: اور خلاصہ یہ ہے کہ سفر کا شروع کرنا وطنِ اقامت کو باطل کرتا ہے، جب یہ سفر اسی وطنِ اقامت سے شروع کیا جائے۔اگر وطنِ اقامت کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے سفر شروع کیا جائے تو اگر وطنِ اقامت پر گزر نہ ہو یا وطنِ اقامت پر گزرنا تین دن کی مقدار سفر کرنے کے بعد ہو،تو پھر یہی حکم ہے(یعنی وطنِ اقامت کا باطل ہونا اور نماز میں قصر کرنا)اور اگر(تین دن سفر کی مقدار سے) پہلے پہلے اس پر گزر ہو تو یہ وطنِ اقامت کو باطل نہیں کرتا، بلکہ یہ سفر باطل ہوگا(کہ پوری نماز پڑھے گا)اس لیے کہ وطنِ اقامت میں قیام کرنا سفرِ شرعی کی صحت سے مانع ہے(اڑتالیس میل سے کم ہے)۔

❁❁❁

افغان مہاجرین کا اپنے وطن میں نماز

سوال نمبر(76):

پاکستان میں افغان مہاجرین اپنے یا کرایہ کے گھروں میں رہتے ہیں، کبھی کبھار ایک دو دن کے لیے کسی ضرورت سے افغانستان جانا پڑتا ہے تو وہاں قصر کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

پاکستان افغان مہاجرین کا وطنِ اقامت ہے اور افغانستان وطنِ اصلی ہے، لہٰذا دونوں جگہ پوری نماز پڑھیں گے،البتہ راستے میں فاصلہ شرعی سفر کے برابر ہونے کی وجہ سے قصر نماز پڑھیں گے،لیکن جن افغان مہاجرین نے مستقل طور پر پاکستان کو وطنِ اصلی بنایا ہو تو وہ افغانستان میں پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کریں گے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

الوطن الأصلي:هو موطن ولادته،أو تأهله أو توطنه.قال ابن عابدين:أي عزم على القرار فيه وعدم الارتحال،وإن لم يتأهل. (٢)

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر،مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة:٢/٦١٥

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة ،باب صلوة المسافر:٢/٦١٤

ترجمہ: (وطنِ اصلی) وہ اس کی پیدائش کی جگہ ہے یا اہل وعیال کو مستقل بسایا ہو یا اس کو مستقل وطن بنایا ہو۔
علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: ’’مستقل ٹھہرنے کا عزم کیا ہو اور وہاں سے کوچ نہ کرنے کا ارادہ ہو، اگرچہ اہل وعیال نہ رہتے ہوں‘‘۔

❁❁❁

کسی شہر میں پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی صورت میں نماز

سوال نمبر (77):

لنڈی کوتل سے ایبٹ آباد جانے والا پشاور میں تین دن ٹھہرتا ہے تو پشاور میں قیام کے دوران قصر کرے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟　　بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

آدمی جب تین منزل تخمیناً ۷۸ کلومیٹر دور سفر کرنے کے ارادہ سے نکلتا ہے تو اپنے شہر یا بستی کی حدود سے نکلتے ہی اس پر قصر کرنا لازم ہوگا، اسی طرح واپسی میں بھی جب تک شہر یا بستی کی حدود تک نہیں پہنچ پاتا، قصر کرے گا۔
سوالِ مذکور میں یہ شخص پشاور میں تین دن قیام کے دوران مسافر کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قصر کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

أقل مسافة تتغیر فیھاالأحکام مسیرة ثلا ثةأیام......الأحکام التي تتغیر بالسفرھي قصر الصلوة.(۱)

ترجمہ: کم سے کم مسافت جس کے ساتھ احکام تبدیل ہو جاتے ہیں، تین دن چلنے کی ہے۔۔۔وہ احکام جو سفر کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں، ان میں سے نماز کا قصر بھی ہے۔

❁❁❁

مسافر کا قصر کی بجائے پوری نماز پڑھنا

سوال نمبر (78):

میں ملازمت کے سلسلے میں لاچی (کوہاٹ) جاتا ہوں۔ پشاور سے لاچی تک فاصلہ ۹۰ کلومیٹر ہے۔ تین چار

(۱)الفتاوی الھندیة،کتاب الصلوة،الباب الخامس عشرفي صلوة المسافر:۱/ ۱۳۸

دن ٹھہر کر واپس آتا ہوں۔ کسی نے بتایا کہ اس دوران لاچی میں آپ مسافر متصور ہوں گے۔ میں نے قصر کی بجائے پوری نمازیں پڑھی ہیں، اب شرعاً کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

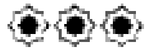
محررہ حالات کی روشنی میں مذکورہ شخص مسافر متصور ہوگا اور اس پر اس دوران نماز میں قصر کرنا واجب ہے۔ قصر کی بجائے پوری نماز پڑھ لینے کی صورت میں فریضہ تو ساقط ہو جائے گا، لیکن گناہ گار رہوگا۔ اس گناہ کی تلافی کے لیے توبہ واستغفار کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ قعدہ اولی میں بیٹھا ہو، کیونکہ یہ اس کا فرض قعدہ تھا اور دو رکعت اس کے نفل شمار ہوں گے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والقصر واجب عندنا، کذافي الخلاصة. فإن صلی أربعا، وقعد في الثانية قدرالتشهد أجزأته، والأخريان نافلة، ويصير مسيئالتأخير السلام.(١)

ترجمہ:

اور ہمارے ہاں (مسافر کے لیے) قصر کرنا واجب ہے۔ اگر چار رکعتیں پڑھے اور قعدہ اولی میں تشہد کے بقدر بیٹھے تو نماز جائز ہوگی اور آخر والی دو رکعتیں نفل شمار ہوں گے، البتہ سلام میں تاخیر کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔



باپ کا بیٹے کے گھر قیام کرنا

سوال نمبر(79):

ایک شخص کا بیٹا اس کے وطن سے سفر شرعی کی مسافت پر ملازمت کے سلسلہ میں مقیم ہے۔ باپ بیٹے کی ملاقات کے لیے اس علاقے میں اگر پندرہ دن سے کم قیام کرے تو بیٹے کا تابع بن کر مقیم شمار ہوگا یا مسافر کے حکم میں ہوگا؟

بیّنوا توجروا

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ١/١٣٩

الجواب وباللہ التوفیق:

سفراوراقامت کی نیت میں اگرچہ اصل کا اعتبار ہوتا ہے، تابع کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، لیکن جہاں کہیں شرعی طور پر تابع ومتبوع کا تعلق نہ ہوتو فقط قرابت اور رشتہ داری کی بنا پر کسی کو دوسرے کا تابع بنانا مشکل ہے، چونکہ باپ بیٹے کا ایسا تعلق نہیں کہ باپ بیٹے کا تابع بن جائے، اس لیے بیٹے کا کسی جگہ رہائش اختیار کرنے سے باپ کو اس کا تابع نہیں بنایا جاسکتا اور فقہائے کرام کی عبارات کی رُو سے بھی باپ بیٹے کے توابع میں سے نہیں ہے، لہٰذا سوال میں مذکورہ باپ اگر مذکورہ علاقہ میں پندرہ دن سے کم کی نیت کرے تو وہ مسافر شمار ہو کر قصر کرے گا اور اگر پندرہ دن کی نیت کرے تو پھر پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

أما إذا كانت أرزاقهم من أموال أنفسهم، فالعبرة لنيتهم، كذا في الظهيرية. (١)

ترجمہ: جب کوئی اپنا نفقہ اپنے مال سے پورا کرتا ہو (کسی کا تابع نہ ہو) تو (سفر اور اقامت میں) ان کی اپنی نیتوں کا اعتبار ہوگا۔



کمپنی کے ملازم کا مختلف شہروں میں رہنا



سوال نمبر (80):

ایک آدمی دو سال گزارنے کے ارادے سے سعودی عرب جاتا ہے۔ وہ جس کمپنی میں کام کرتا ہے، اس کا نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے، کبھی ایک جگہ میں تین دن، پانچ دن اور کبھی مہینہ گزارنے کا اتفاق بھی ہوجاتا ہے۔ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ قصر نماز پڑھیں، کیوں کہ آپ مسافر کے حکم میں ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ پوری نماز پڑھیں، اس سلسلے میں آپ رہنمائی فرمائیں؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رو سے تابع کی اقامت اور سفر کی نیت متبوع کی نیت پر موقوف ہے۔ اگر متبوع اقامت کی

---

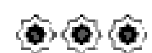
(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ١/ ١٤١

نیت کرے اور تابع کو علم نہ ہو تو وہ مسافر متصور ہوگا، صورتِ مسؤلہ میں مذکورہ شخص کمپنی کا تابع ہے، لہٰذا کمپنی کا شیڈول جاننے سے پہلے مسافر رہے گا، تاہم اس پر لازم ہے کہ کمپنی کے ناظمین سے شیڈول کے بارے میں معلومات حاصل کرے، پھر شیڈول کے مطابق اگر اس کے لیے کسی بھی جگہ مدتِ اقامت کی بقدر رہنا متعین نہ ہو تو مسافر شمار ہوگا، ورنہ (اگر متعین ہو تو) جہاں مدتِ اقامت گذارے وہ اس کے لیے وطنِ اقامت ہوگا، وہاں پوری نماز پڑھے گا، وہاں سے پھر اگر مسافت کی بقدر سفر کرے تو قصر کرے گا، البتہ دورانِ سفر وطنِ اقامت آئے یا وہاں سے گزرے تو اقامت کی نیت نہ ہونے کے باوجود بھی پوری نماز پڑھے گا، لیکن اگر وطنِ اقامت پر گزر کر ۷۸ کلومیٹر سفر طے کرنے کا ارادہ ہو تو پھر قصر کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولابد من علم التابع بنية المتبوع، فلو نوى المتبوع الاقامة، ولم يعلم التابع فهو مسافر حتى يعلم على الأصح. (١)

ترجمہ: تابع کے لیے متبوع کی نیت کا جاننا ضروری ہے، پس اگر متبوع نے اقامت کی نیت کر لی اور تابع کو علم نہ ہو تو اصح قول کے مطابق علم نہ ہونے تک وہ مسافر شمار ہوگا۔



ڈیوٹی کی جگہ پر پندرہ دن سے کم قیام کرنا

سوال نمبر (81):

حکومت نے میری ڈیوٹی مالاکنڈ ڈویژن میں لگائی ہے، اور حکومت کی طرف سے اس بات پر مامور ہوں کہ جس علاقے میں جس وقت ضرورت پڑے گی، وہاں پہنچنا ہوگا اس لیے میں کسی ایک جگہ پندرہ دن قیام نہیں کر سکتا، تو ایسی حالت میں مقیم کے حکم میں ہوں گا یا مسافر رہوں گا؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو شخص شرعی سفر کی نیت سے سفر شروع کرے، وہ اپنے شہر کی حدود سے خارج ہونے کے بعد مسافر متصور ہوگا اور جب تک کسی مقام پر پہنچ کر پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی قطعی نیت نہ کرے، مسافر ہی رہے گا۔ سوالِ مذکور میں

(١) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ المسافر: ۲/ ۱۳٤

اگر موصوف کو سرکار کے حکم پر مختلف علاقوں کے اسفار کی وجہ سے پندرہ دن یا اس سے زیادہ کی جگہ ٹھہرنے کی نیت کرنے کا موقع نہیں ملتا تو موصوف شرعاً مسافر ہی رہے گا۔

والدّليل على ذلك:

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصداً مسيرة ثلاثة أيام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلّى الفرض الرّباعي ركعتين.....حتىٰ يدخل موضع مقامه أو ينوي إقامة نصف شهر.(١)

ترجمہ: جو شخص اقامت والے علاقے کی آبادی سے نکل جائے، اس حال میں کہ اس کا قصد و ارادہ متوسط رفتار کے ساتھ اور حسب عادت آرام کے لیے ٹھہرنے کے ساتھ تین دن اور رات چلنے کی مسافت تک جانا ہو تو ایسا شخص فرض نمازوں کی چار رکعتوں کی بجائے دو رکعتیں پڑھے گا۔۔۔ یہاں تک کہ اپنی اقامت کی جگہ میں داخل ہو جائے یا پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے۔

قصر کی بجائے اتمام کرنا

سوال نمبر(82):

مسافر نے دو رکعت کی بجائے چار رکعت نماز پڑھ لی، کیا شرعی طور پر یہ نماز درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہ حنفی کی رو سے مسافر کا ظہر، عصر اور عشا کی نماز میں قصر کرنا واجب ہے اور پوری نماز پڑھ لینے سے گناہ گار تو ہوگا، لیکن دو رکعت کے بعد قدر تشہد بیٹھ جانے کی وجہ سے فرض مکمل ہو جانے کی بنا پر فریضہ ساقط ہو جائے گا، تاہم اگر دو رکعت کے بعد نہیں بیٹھا تو نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ اس نے فرض قعدہ (دو رکعت کے بعد) نہیں کیا۔

والدّليل على ذلك:

(فلو أتم مسافر إن قعد في) القعدة (الأولى تم فرضه و) لكنه (أساء) لو عامداً لتأخير السلام، وترك واجب القصر وواجب تكبيرة الافتتاح للنفل وخلط النفل بالفرض وهذا لا يحل.(٢)

---

(١) تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ٢/٥٩٩-٦٠٥

(٢) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر: ٢/٦٠٩-٦١٠

ترجمہ:

اگر مسافر نے اتمام کیا اور پہلے قعدہ میں بیٹھ گیا تو فرض نماز مکمل ہو جائے گی، لیکن جان بوجھ کر ایسا کیا ہو تو گناہ گار ہوگا، سلام کی تاخیر، قصر (جو کہ) واجب ہے کو ترک کرنے، نفل نماز کی تکبیر تحریمہ کو ترک کرنے اور نفل نماز کو فرض کے ساتھ خلط کرنے کی وجہ سے اور یہ (سب) ناجائز ہیں۔

❁❁❁

سفر کی وجہ سے دو نمازوں کا ایک ساتھ پڑھنا

سوال نمبر (83):

کیا مسافر ایک وقت میں دو نمازیں پڑھ سکتا ہے، مثلاً ظہر اور عصر کو یکجا کر کے پڑھ لے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہ حنفی کے رو سے دو نمازوں کو ایک وقت میں پڑھنا عرفات اور مزدلفہ میں دورانِ حج جائز ہے۔ اس کے علاوہ ہر نماز کا اپنے وقت میں پڑھنا ضروری ہے، البتہ عذر کی وجہ سے دو نمازوں کو اس طرح جمع کرنا کہ بظاہر جمع ہوں، لیکن حقیقت میں ہر نماز اپنے اپنے وقت میں ہو، صورت اس کی یہ ہے، مثلاً ظہر کی نماز کو آخری وقت میں اور عصر کو پہلے وقت میں پڑھ لے، تو اس طریقے سے جمع کرنا کسی عذر کی بنا پر درست رہے گا۔ اس طرح نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جمع صوری کہلاتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولایجمع بین صلاتین في وقت واحد في حضر، ولاسفر) ما خلا عرفة ومزدلفة.(۱)

ترجمہ:

ایک وقت میں دو نمازوں کو یکجا کر کے نہیں پڑھے گا، سفر میں اور نہ حضر میں، سوائے عرفہ اور مزدلفہ کے۔

❁❁❁

(۱) السرخسي، شمس الدین، المبسوط، کتاب الصلوۃ، باب مواقیت الصلوۃ: ۱/۱۴۹

مقیم کا مسافر کے پیچھے اتمام کرنا

سوال نمبر(84):

ایک مسافر کے پیچھے مقیم مقتدیوں نے عشا کی نماز میں آخر تک اس طرح اقتدا کی کہ امام نے دو رکعت کے بعد سلام پھیرنے کی بجائے نماز جاری رکھی اور چار رکعت نماز پوری کی ، کیا مسافر امام کے پیچھے مقیم کا اس طرح نماز پڑھنا درست ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ مسافر ظہر ،عصر اور عشا کی نماز چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھے گا۔ اگر کہیں قصر کی بجائے اتمام کیا تو دو رکعت نفل نماز شمار ہوں گے ،اور نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتدا درست نہیں ،اس لیے کہ فرض نفل سے اقویٰ ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں امام کی اخیر دو رکعتیں نفل تھیں اور پیچھے اقتدا کرنے والے فرض نماز پڑھ رہے تھے، لہٰذا مقیمین کی نماز مذکورہ امام کے پیچھے فاسد ہوگئی ہے اور دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال في الظهيرية: تلوه حتىٰ لو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت صلوتهم؛لأن هذا اقتداء المفترض بالمتنفل ولايصح.(۱)

ترجمہ:

اگر مقیمین اپنی نماز مسافر امام کے ساتھ پوری کرلیں (یعنی مسافر امام نے غلطی سے دو کی بجائے چار رکعتیں پڑھ لی اور مقیمین نے بھی اس کی اقتدا کرتے ہوئے چار رکعتیں اس کے پیچھے پوری پڑھ لی) تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی ، کیونکہ یہ فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتدا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔

❁❁❁

(۱) ابن عابدين ،محمد أمين منحة الخالق على البحر الرائق، كتاب الصلوة، باب المسافر، تحت قوله: (لايصير مقيما): ۲/۲۳۸

وطنِ اقامت میں نیت کا اعتبار

سوال نمبر(85):

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ فوج کی ایک یونٹ جو کم از کم تین سو افراد پر مشتمل ہو، ایک بڑی چھاؤنی میں قیام پذیر ہے، لیکن منفی حالات کے پیش نظر کبھی ان کی تبدیلی کسی دوسری ایسی چھاؤنی کی جاتی ہے جو ملکی سرحدات کے قریب ہوتی ہے کہ بوقتِ ضرورت سرحدات پہنچنے میں آسانی رہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی چھاؤنیوں میں قیام ہوتا ہے، لیکن دفاعی حکمتِ عملی کی بنا پر افسر بالا باقاعدہ یہ نہیں بتاتے کہ ہمیں کتنے دنوں کے لیے یہاں رہنا ہے۔ان حالات کے پیشِ نظر ہمیں نماز کے قصر یا اتمام کے بارے میں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

(۱) اگر یہ یونٹ کسی صحرا میں جا کر خیمہ زن ہو، وہاں پر جنگی حالات کا سامنا ہو، رہائشی سہولیات نہ ہوں، خیمہ لگا کر یہ یونٹ چند دن گزارے؛ کیا اسی صحرا میں ان کی اقامت کی نیت معتبر ہے یا نہیں؟

(۲) سرحدات کے قریب چھاؤنی میں رہنے کے بارے میں نماز کا کیا حکم ہے؟ جس کے بارے میں افسرانِ بالا اقامت کے بارے میں بتلانے سے قاصر ہوتے ہیں، لیکن کچھ ایسے منصوبے جاری ہوتے ہیں یا اسکیمیں شروع کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پر قیام مہینوں تک ہو سکتا ہے، بسا اوقات نجی محفلوں میں بعض ذمہ دار حضرات کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں جو طویل اقامت پر دلالت کرتی ہیں۔

(۳) اگر اس یونٹ کے بعض حضرات کے بچے مرکزی چھاؤنی میں ہوں تو دو تین دنوں کے لیے بچوں کے پاس آنے سے یہ آدمی قصر نماز پڑھے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟

(۴) اگر مسافر دو رکعتوں کی بجائے چار رکعتیں پڑھے تو اس سے ذمہ فارغ ہوتا ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱)......جنگی حالات کے پیش نظر اگر کسی یونٹ کی تقرری غیر آباد علاقہ میں ہو، جہاں سہولیات کے فقدان کے علاوہ مستقل رہائش کا کوئی بندوبست نہ ہو اور ہنگامی حالات کے پیش نظر کسی وقت یہ یونٹ ادھر اُدھر بھیجی جا سکتی ہو تو ان کے لیے قصر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

والدلیل علیٰ ذلک:

قال شمس الأئمة الحلواني:عسكر المسلمين إذا قصدوا موضعاً،ومعهم أخبيتهم، وخيامهم،وفساطيطهم،فنزلوا مفازة في الطريق،ونصبوا الأخبية،والفساطيط،وعزموا فيها على إقامة خمسة عشر يوماً لم يصيروا مقيمين؛لأنها حمولة وليست بمساكن.(۱)

ترجمہ: شمس الائمہ کا کہنا ہے کہ :مسلمان فوج جب کسی مقام کا قصد کریں،ان کے پاس جب اپنے خیمے ہوں اور راستہ میں کسی صحرا میں خیمہ زن ہوکر پندرہ دن کی اقامت کی نیت کریں تو ایسی صورت میں نیت کے باوجود یہ لوگ مقیم نہیں بن سکتے،کیونکہ رہائشی نہیں،بلکہ کوچ کرنے والے ہیں۔

(۲)...... جہاں کہیں یونٹ اپنے مرکز سے کسی دوسری ایسی چھاؤنی بھیجی جائے جو سرحد کے قریب واقع ہوتا کہ بوقتِ ضرورت فوج کی ترسیل میں آسانی رہے اور کسی شہری آبادی میں جانے کے بعد اس کو جملہ سہولیاتِ زندگی میسر ہوں تو ایسی جگہ میں اقامت کی نیت معتبر ہے،کیونکہ جہاں مستقل رہائش کی جگہ ہو،وہاں اقامت کی نیت درست ہے،لیکن اس میں ضروری ہے کہ افسرِ مجاز نے نیت کی ہو،ماتحت عملہ کا اقامت کی نیت کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔افسرِ مجاز کی نیتِ اقامت کے لیے اعلان کرنا یا اعتماد ذریعہ ہے،لیکن جہاں کہیں دفائی حکمت عملی کے تحت عمومی اعلان مشکل ہو،لیکن حالات اور قرائن سے اتنا معلوم ہوتا ہو کہ یونٹ کی اقامت پندرہ دن سے متجاوز ہے یا افسران بالا کوئی ایسے منصوبے اور سکیمیں شروع کروائیں جو مدتِ اقامت پر مشتمل ہوں تو ایسی صورت میں قرائن نیتِ اقامت کی آ گاہی کے لیے کافی ثبوت ہیں،جن کے ہوتے ہوئے نماز پوری پڑھی جائے گی۔

مزید برآں ایامِ جنگ کے علاوہ عام دنوں میں یونٹ کی تبدیلی کی مدت پندرہ دن سے متجاوز ہوتی ہے،اس لیے ایسی صورت میں احوال اور قرائن سے استفادہ کرکے اقامت کی نیت معلوم کی جاسکتی ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

إن الحجاج إذا وصلوا إلى بغداد شهر رمضان،ولم ينووا الإقامة،صلوا بصلوة المقيمين؛لأنه من عرفهم أن لا يخرجوا إلامع القافلة،ومن هذا الوقت إلى وقت خروج القافلة أكثر من خمسة عشر يوماً،فكأنهم،نووا الإقامة أكثر من خمسة عشر يوماً،فيلزمهم صلوة المقيمين.(۲)

(۱) الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس عشر في صلوة المسافر:۱/۱۳۹

(۲) الفتاوىٰ التاتارخانية،كتاب الصلوة،نوع آخر في بيان من لا يصير مقيما:۲/۱۳

ترجمہ: حجاجِ کرام جب رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچیں اور اقامت کی نیت نہ کریں تو پوری نماز پڑھیں گے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ان کا نکلنا قافلہ کے بغیر ممکن نہیں اور اس وقت سے لے کر قافلہ کے نکلنے تک پندرہ دن سے زیادہ مدت بنتی ہے گویا انہوں نے عملی طور پر پندرہ دن کی اقامت کی نیت کی ہے، اس لیے مقیم کی طرح نماز پڑھنا ضروری ہے۔

(۳)...... جہاں یونٹ کا اپنا مرکز ہو اور وہاں ہی یونٹ والوں کی مستقل تقرری ہو، بچے اور سامان بھی مرکز میں ہوں تو چند دنوں کے لیے نکلنے سے یہ اقامت متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ وطنِ اقامت سفر سے اس وقت متاثر ہوتا ہے جب وہاں سے باقاعدہ جانے کا عزم ہو، تاہم اس میں ضروری ہے کہ یہاں پر اقامت کی نیت کر کے وطنِ اقامت بنایا ہو، لہٰذا یونٹ والے جب مرکزی چھاؤنی میں اپنے گھر آئیں تو دوبارہ اقامت کی نیت ضروری نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

کوطن الإقامة تبقی ببقاء الثقل،وإن أقام بموضع اٰخر.(۱)

ترجمہ:

جیسا کہ وطنِ اقامت ہے کہ سامان پڑے رہنے سے (وطنِ اقامت کے حکم میں) باقی رہتا ہے، اگرچہ دوسری جگہ رہائش اختیار کرلے۔

(۴)......فقہ حنفی کی رو سے مسافر چار رکعتوں کی بجائے دو رکعتیں پڑھے گا، اس کے باوجود اگر چار رکعتیں پڑھ کر قعدہ اولیٰ کیا ہو تو ذمہ فارغ ہوگا جن میں دو رکعت فرض اور باقی رکعتیں نفل متصور ہوں گی، البتہ گناہ گار ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

فإن صلی أربعاً وقعد في الثانیة قدر التشهد أجزأته،والأخریان نافلة،ویصیر مسیئاً لتأخیر السلام.(۲)

ترجمہ:

اگر (مسافر) چار رکعتیں پڑھے اور دوسری رکعت میں تشہد کی مقدار بیٹھا ہو تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اخیر والی دو رکعتیں نفل ہوں گی اور سلام کی تاخیر کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔

---

(۱) البحرالرائق،کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ المسافر،تحت قوله:(ویبطل الوطن الأصلي):۲/۲۳۹

(۲)الفتاوی الهندیة،کتاب الصلوۃ،الباب الخامس في صلوۃ المسافر:۱/۱۳۹

خاوند کے سفر کا بیوی پر اثر انداز ہونا

سوال نمبر(86):

میں حکومت کا ملازم ہوں اور مسلسل سفر میں رہتا ہوں، جبکہ میری بیوی ایک ہی جگہ مقیم ہے تو کیا میرے سفر کے احکام میرے گھر والوں پر اثر انداز ہوں گے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی جب خاوند کے ہمراہ سفر کر رہی ہو تو خاوند کے تابع ہوتی ہے اور یہ سفر کا قاعدہ ہے کہ متبوع کی نیت تابع پر اثر انداز ہوتی ہے اور تابع کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لیے اگر متبوع تابع کو کسی جگہ ٹھہرا کر اس کی اقامت کی نیت کر لیتا ہے تو تابع کی اقامت ثابت ہو جاتی ہے، اگرچہ متبوع نے خود اقامت کی نیت نہ کی ہو۔

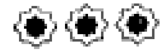
سوالِ مذکور میں موصوف کی زوجہ اس کے تابع ہوگی، اس کی نیتِ اقامت سے مقیم اور نیتِ سفر سے مسافر رہے گی، بشرطیکہ بیوی کو خاوند کی نیت کا علم ہو، لہٰذا ایک ہی جگہ ٹھہرانے سے اگر خاوند بیوی کی نیتِ اقامت کرے گا تو مقیم شمار ہوگی، اگرچہ خاوند بدستور مسافر ہو۔

والدلیل علیٰ ذلک:

كل من كان تبعاً لغيره يلزمه طاعته، يصير مقيماً بإقامته، و مسافراً بنيته، و خروجه إلى السفر.(۱)

ترجمہ:

ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کا تابع ہو، اس پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس کی نیتِ اقامت سے مقیم اور نیتِ سفر سے مسافر شمار ہوگا اور سفر کے لیے نکلنے پر بھی (مسافر شمار ہوگا)۔



(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس في صلوة المسافر: ۱/ ۱۴۱

مسافر کی اقتدا میں مقیم کی نماز

سوال نمبر (87):

اگر مسافر نماز پڑھا رہا ہو اور اقتدا کرنے والے مقیم ہوں تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقیم اپنی نماز انفرادی طور پر کس طرح پڑھے گا یعنی قرأت کرے گا یا بغیر قرأت کیے اپنی نماز پوری کرے گا، وضاحت فرمائیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر مقیم چار رکعت والی نماز میں مسافر امام کی اقتدا کرتا ہو تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی بقیہ دو رکعت مسبوق کی طرح پڑھے گا، لیکن ان دو رکعتوں میں قرأت پڑھنا ضروری نہیں، اس لیے کہ یہ لاحق کے حکم میں ہے اور لاحق پر قرأت لازم نہیں ہوتی، لہٰذا مقیم مقررہ اندازے کے مطابق خاموشی اختیار کرتے ہوئے کھڑا رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وإن صلى المسافر بالمقيمين ركعتين ،سلم،وأتم المقيمون صلاتهم......وصاروا منفردين، كالمسبوق إلا أنهم لايقرؤون في الأصح.(۱)

ترجمہ:

اگر مسافر مقیم لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائے اور امام سلام پھیرے تو مقیم لوگ نماز پوری کر لیں ۔۔۔۔ یہ لوگ مسبوق کی طرح انفرادی نماز پڑھنے والے ہوں گے، مگر صحیح قول کے مطابق قرأت نہیں پڑھیں گے۔

❁❁❁

مسافر بننے کے لیے راستوں میں تفاوت

سوال نمبر (88):

میں جہاں ملازمت کرتا ہوں، وہاں سے ہر ہفتے گھر آنا جانا ہوتا ہے۔ ابھی تک پندرہ دن گزارنے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لیے جائے ملازمت قصر کرتا ہوں اور راستے میں بھی، لیکن بعض موقعوں پر بارش یا کسی اور وجہ سے

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس في صلوة المسافر: ۱/ ۱۴۲

ایسا راستہ اختیار کرتا ہوں جس کی مسافت شرعی مقدارِ سفر کے برابر نہیں تو کم مسافت والے راستے کو اختیار کرتے ہوئے میرے لیے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ شرعی سفر کی مقدار اٹھتر ۸ ۷ کلومیٹر یا اس سے زائد فاصلہ ہے، البتہ اگر ایسی صورت ہو کہ منزلِ مقصود کی طرف جانے والے دو راستے ہوں، ایک راستہ کی مقدار شرعی سفر کے برابر ہو اور دوسرے کی مقدار کم ہو تو جس راستے کی مسافت مقدارِ سفر کے برابر ہو، اس راستے پر چلتے ہوئے قصر اور دوسرے راستے پر چلتے ہوئے اتمام کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فإذا قصد بلدة وإلیٰ مقصده طریقان، أحدهما مسیرة ثلثة أیام ولیالیها، والآخر دونها، فسلك الطریق الأبعد کان مسافرا، وإن سلك الأقصر یتم.(۱)

ترجمہ: کسی شہر کا قصد کیا اور منزل کی طرف دو راستے جاتے ہوں، ایک کی مسافت تین دن اور رات کے برابر ہو، جبکہ دوسرا اس سے کم ہو، اگر دور والے راستہ کو اختیار کیا تو قصر کرے گا اور اگر مختصر راستہ اختیار کیا تو اتمام کرے گا۔

❁❁❁

احکامِ سفر کا تعلق وطنِ اقامت یا وطنِ اصلی سے جوڑنا

سوال نمبر(89):

ایک شخص کا وطنِ اصلی صوابی ہے اور وطنِ اقامت پشاور ہے تو پشاور سے چارسدہ جانے کی صورت میں وطنِ اصلی صوابی کا اعتبار کرتے ہوئے قصر کرے گا یا وطنِ اقامت پشاور کا اعتبار کرتے ہوئے اتمام کرے گا۔ نیز صوابی اور چارسدہ کے درمیان مسافت، شرعی سفر کی مقدار سے زیادہ جبکہ پشاور اور چارسدہ کے درمیان مسافت شرعی سفر کی مقدار سے کم ہے۔

بینوا توجروا

(۱) الفتاویٰ الهندیة، کتاب الصلوٰة، الباب الخامس في صلوٰة المسافر: ۱/ ۱۳۸

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ صوابی اور چارسدہ کے درمیان مسافت احکامات پر اثر انداز ہو سکتی ہے، لیکن یہ حکم تب ہے، جب کوئی شخص صوابی سے چارسدہ کا سفر شروع کرے، لیکن جب یہ شخص پشاور یعنی وطنِ اقامت سے سفر شروع کر کے چارسدہ گیا تو اس صورت میں مسافت کم ہونے کی وجہ سے اتمام کرے گا اور سفر کے احکام کا تعلق اس جگہ سے ہے جہاں سے سفر شروع کیا ہے، لہٰذا یہ شخص چارسدہ میں پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا اگرچہ چارسدہ اور اس کے وطنِ اصلی صوابی کے مابین مسافت، شرعی سفر کی مقدار سے زیادہ ہے، کیونکہ اس نے سفر پشاور سے شروع کیا ہے، اس لیے پشاور کا اعتبار کیا جائے گا۔

والدلیل علیٰ ذلک:

السفر الذي يتغير به الأحكام:أن يقصدالإنسان مسيرة ثلثة أيام ولياليها.قال صاحب فتح القدير: وليس كل قطع يتغير به الأحكام.(۱)

ترجمہ:

وہ سفر جس کے ساتھ احکامات میں تبدیلی آتی ہے (وہ یہ ہے) کہ انسان تین دن اور راتیں چلنے کا ارادہ کرے۔ صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ ہر مسافت کاٹنے سے احکامات نہیں بدلتے۔

❁❁❁

وطنِ اصلی کے ختم کرنے کے بعد وہاں نماز

سوال نمبر(90):

ہمارے علاقے (مہمند ایجنسی) کے بعض لوگ کاروبار کے سلسلے میں راولپنڈی میں گھر خرید کر اہل وعیال سمیت رہتے ہیں، لیکن ان کی جائیداد، زمین اور مقبرہ بدستور ایجنسی میں ہوتے ہیں، کبھی کبھار تین دن عید گزارنے یا کسی جنازے میں شرکت کرنے یا اپنے بھائیوں سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ اب ایجنسی میں یہ لوگ اتمام کریں گے یا قصر پڑھیں گے

بیّنوا توجروا

(۱) فتح القدير، كتاب الصلوة، باب صلوة المسافر:۲/۲

الجواب وباللہ التوفیق:

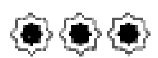
اگر مذکورہ لوگوں نے راولپنڈی کو اپنا مستقل وطن قرار دیا ہو، یعنی اپنا گھر خرید کر اہل وعیال کو ہمیشہ کے لیے یہاں بسانے کا مصمم ارادہ کیا ہو اور ایجنسی والے گھر کو چھوڑنے کا مستقل عزم کیا ہو تو پھر راولپنڈی ان کا وطنِ اصلی قرار پائے گا اور مہمند ایجنسی جو کہ ان کا وطنِ اصلی تھا، نئے وطنِ اصلی کے قیام سے باطل ہو جائے گا، لہٰذا ایجنسی میں قصر نماز پڑھیں گے، جب تک پندرہ دن سے کم قیام کی نیت ہو، کیونکہ یہ لوگ مسافر کے حکم میں شمار ہوں گے۔اس کے برعکس اگر راولپنڈی میں عارضی قیام کا ارادہ کیا ہو اور مہمند ایجنسی کو مکمل چھوڑنے کا عزم نہ ہو تو پھر راولپنڈی وطنِ اقامت کے حکم میں ہوگا اور دونوں علاقوں میں پوری نماز پڑھنے کا اہتمام کریں گے، اس لیے کہ وطنِ اصلی، وطنِ اقامت سے باطل نہیں ہوتا۔ نیز یہ بھی جائز ہے کہ دونوں جگہوں کو وطنِ اصلی بنانے کی نیت کریں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(الوطن الأصلي)هو موطن ولادته،أو تأهله أو توطنه(يبطل بمثله)إذالم يبق له بالأول أهل، فلو بقي لم يبطل،بل يتم فيهما......ويبطل(وطن الإقامة بمثله و)بالوطن(الأصلي و)بانشاء (السفر).(۱)

ترجمہ:

وطنِ اصلی جائے پیدائش ہے یا جہاں اہل وعیال ٹھہرائے ہوں یا وطن بنایا ہو، اپنی مثل سے باطل ہو جاتا ہے، یہ تب جب اول وطن میں اہل نہ رہے، اگر باقی رہے تو پھر باطل نہیں ہوتا، بلکہ دونوں میں اتمام کرے گا۔۔۔۔اور وطن اقامت اپنی مثل سے باطل ہو جاتا ہے، اسی طرح وطنِ اصلی اور انشا سفر سے بھی باطل ہو جاتا ہے۔



وطنِ اقامت سے مسافتِ شرعی سے کم سفر

سوال نمبر(91):

ایک شخص پشاور سے اسلام آباد جاتے ہوئے ترنول سے فتح جنگ گیا، وہاں سے اسلام آباد روانہ ہوا تو فتح جنگ میں قیام کے دوران یہ شخص مسافر ہوگا یا نہیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ شخص اسلام آباد سے پشاور روانہ ہوا، ترنول پھاٹک سے فتح جنگ گیا پھر ترنول

(۱)الدرالمختارعلی صدرردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر:۲/۶۱٤

بھانک سے ہوتا ہوا پشاور گیا تو کیا یہ شخص فتح جنگ میں مسافر شمار ہوگا یا نہیں؟

تیسری صورت یہ ہے کہ اسلام آباد میں مستقل رہنے والا روزانہ ملازمت کے سلسلے میں فتح جنگ جاتا ہے تو کیا یہ شخص فتح جنگ میں مسافر ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو شخص شرعی سفر یعنی ۴۸ میل یا ۸۱ کلومیٹر سے زیادہ مسافت کی نیت کرے تو علاقے کی حدود سے نکلنے کے بعد مسافر کے حکم میں شمار ہوکر قصر کرے گا۔ اگر حدود کے اندر رہے تو پوری نماز پڑھے گا۔

لہٰذا پہلی صورت میں پشاور سے اسلام آباد جاتے ہوئے اگر اسلام آباد میں اس شخص کا ارادہ پندرہ (۱۵) دن سے کم رہنے کا ہو تو یہ شخص اسلام آباد اور فتح جنگ میں مسافر شمار ہوگا، لیکن اگر اس کا ارادہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کا ہو تو پھر اسلام آباد میں تو مقیم شمار ہوگا، لیکن اسلام آباد جاتے ہوئے فتح جنگ میں مسافر ہوگا، کیونکہ یہ اسلام آباد کی حدود سے باہر مستقل جگہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر وہ اسلام آباد سے فتح جنگ چلا جائے، پھر ترنول واپس آکر پشاور روانہ ہو جائے تو فتح جنگ میں مسافر متصور ہوگا، کیونکہ اسلام آباد کی حدود سے نکلتے ہی یہ مسافر ہوگا۔ اسلام آباد اور پشاور کے درمیان مسافت سفر شرعی کے حکم میں ہے۔

تیسری صورت میں اسلام آباد اور فتح جنگ کے مابین مسافت شرعی سفر سے کم ہونے کی وجہ سے یہ شخص مسافر نہیں ہوگا، بشرطیکہ اس کی آمد و رفت اسلام آباد سے صرف فتح جنگ تک ہو۔

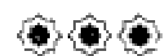
والدّليل علىٰ ذلك:

يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر......وعليه الفتوى......الصحيح ماذكر أنه يعتبر مجاوزة عمران المصر، لاغير، إلا إذا كان ثمة قرية أو قرى متصلة بربض المصر، فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى بخلاف القرية التي تكون متصلة بفناء المصر فإنه يقصر الصلوة، وإن لم يجاوز تلك القرية، وكذا إذا عاد من سفره إلىٰ مصره لم يتم حتىٰ يدخل العمران ولا يصير مسافراً بالنية حتىٰ يخرج ويصير مقيماً بمجرد النيّة (۱)

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس في صلوة المسافر: ۱/۱۳۹

ترجمہ:

شہر سے نکلنے اور مکانات کو پیچھے چھوڑ جانے کے بعد قصر کرے گا۔۔۔اسی پر فتویٰ ہے۔۔۔درست قول بھی یہی ہے، جو مذکور ہے کہ شہر کی آبادی سے گزر جانے کے بعد ہی (سفر کا) اعتبار ہوگا، مگر اس صورت میں شہر کے ساتھ کوئی متصل گاؤں ہو یا شہر کے میدان کے ساتھ پیوست گھوڑ دوڑ کے میدان ہوں تو ان علاقوں سے گزر جانے کا اعتبار ہوگا۔ اس کے برعکس وہ گاؤں یا علاقہ جو شہر کی فنا سے پیوست ہو، شہر سے نکلنے سے ہی قصر نماز پڑھے گا، اگرچہ شہر کی فنا کے ساتھ پیوست گاؤں سے تجاوز نہ کیا ہو اور اسی طرح جب سفر سے اپنے شہر واپس آئے تو جب تک آبادی میں داخل نہ ہو، پوری نماز نہیں پڑھے گا اور صرف نیت کرنے سے مسافر شمار نہیں، یہاں تک کہ آبادی سے نکل جائے، البتہ اقامت کی صورت میں صرف نیت کرنے سے مقیم شمار ہوگا۔



وطنِ اصلی کا باطل ہونا

سوال نمبر (92):

ایک آدمی جس کا آبائی علاقہ کرک ہے، لیکن اب پشاور میں گھر بنا کر اہل وعیال سمیت مستقل رہ رہا ہے۔اس کی جائیداد، گھر اور رشتہ دار وغیرہ کرک میں موجود ہیں۔کبھی کبھار کرک جانے کی صورت میں یہ شخص مقیم کے حکم میں ہوگا یا مسافر؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کوئی شخص وطن اصلی سے اہل وعیال سمیت کسی دوسری جگہ منتقل ہو کر مستقل سکونت اختیار کرتا ہے اور آئندہ اس علاقے میں نہ رہنے کا عزم کر لیتا ہے تو جائیداد اور رشتہ داروں کے باوجود اس کا وطنِ اصلی باطل ہوگا اور یہ دوسرا علاقہ اس کا وطنِ اصلی کہلائے گا، لہٰذا اگر کہیں کسی کام سے یا تعزیت وغیرہ کے سلسلے میں علاقہ جائے گا تو پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی صورت میں مسافر کے حکم میں شمار ہو کر قصر کرے گا، بشرطیکہ دونوں علاقوں کا درمیانی فاصلہ سفرِ شرعی کے برابر ہو، اگر دونوں علاقوں کا درمیانی فاصلہ سفرِ شرعی سے کم ہو تو پھر دونوں علاقوں میں اتمام کا پابند ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی کرک کے رہائشی نے پشاور میں مستقل سکونت اختیار کر کے آئندہ کرک، یعنی

اپنے آبائی علاقے میں نہ رہنے کا عزم کرلیا ہو تو پھر جائیداد اور گھر وغیرہ کی موجودگی سے وطنِ اصلی کا بطلان متاثر نہیں ہوگا، کیونکہ پشاور اب اس کا وطنِ اصلی بن گیا اور وطنِ اصلی دوسرے وطنِ اصلی یعنی اپنی مثل سے باطل ہوتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(الوطن الأصلي)هوموطن ولادته،أو تأهله أو نوطنه(يبطل بمثله).(۱)

ترجمہ: وطنِ اصلی جائے پیدائش ہوتا ہے یا وہ علاقہ جہاں اہل وعیال کو مستقل طور پر بسایا ہو یا وہ علاقہ جسے مستقل وطن رہائش بنایا ہو، یہ اپنے مثل (وطنِ اصلی) سے باطل ہوجاتا ہے۔

❁❁❁

وطنِ اقامت سے سفر کرنا

سوال نمبر(93):

میرا ویزہ قطر کا ہے اور براستہ سعودی عرب قطر جاؤں گا، لیکن قطر میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد پھر سعودی عرب جاؤں گا، لہٰذا قطر میں رہائش کے دوران میں مقیم کے حکم میں رہوں گا یا مسافر کے حکم میں؟ یہاں کے علماء کرام فرماتے ہیں کہ آپ قطر میں بھی مسافر کے حکم میں ہوں گے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص اپنے علاقے سے سفرِ شرعی کی مسافت کے برابر سفر کے ارادے سے نکلتا ہے تو اس وقت تک مسافر کے حکم میں رہے گا۔ جب تک اپنے علاقے لوٹ کر نہیں آتا یا کسی اور جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا۔ اگر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرنے سے پہلے ہی کسی کام کے لیے وہاں سے چلا جائے اور دوبارہ واپس آکر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرلے تو پوری نماز پڑھے گا۔

مذکورہ شخص محض ویزہ لگنے سے قطر میں مقیم شمار نہیں ہوگا، جب تک پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا، لہٰذا اگر قطر میں پندرہ دن کی نیت کرکے ٹھہرے تو وہاں پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا، ورنہ قصر کرے گا اور یہی حکم سعودی عرب کا بھی ہے۔

---

(۱) الدرالمختارعلی صدرردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر: ۶۱۴/۲

والدّليل على ذلك:

ولا يزال على حكم السفر، حتى ينوي الإقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر.(١)

ترجمہ: اور مسافر اس وقت تک سفر کے حکم میں رہے گا، جب تک کسی شہر یا گاؤں میں پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا۔

❁❁❁

پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں نماز کا حکم

سوال نمبر(94):

ایک شخص صوابی کا رہنے والا پشاور میں ملازمت کے دوران ہر اتوار کو گھر جاتا ہے، اگر اس کا قیام پشاور میں سات دن سے زیادہ نہ ہو، ایسی صورت میں پشاور میں قیام کے دوران یہ شخص قصر کرے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر پشاور میں باقاعدہ ایک دفعہ پندرہ دن کی اقامت کی نیت کر کے رہنے کا موقع ملے تو مقیم کے حکم میں شمار ہوگا، جب تک پشاور میں کاروبار اور ملازمت کرے گا، پوری نماز پڑھے گا اور ہفتہ وار جانے سے اقامت متاثر نہیں ہوگی لیکن اگر پشاور میں قیام کے دوران ایک بار بھی پندرہ دن گزارنے کا موقع نہ ملے اور نہ ہی پندرہ دن اقامت کی نیت کی ہو تو پھر مسافر کے حکم میں رہتے ہوئے سفر کی نماز پڑھے گا، اگرچہ کاروبار یا ملازمت مدتوں تک جاری رہے۔

والدّليل على ذلك:

ولا يزال على حكم السفر، حتى ينوي الإقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر.(٢)

ترجمہ:

اور مسافر اس وقت تک سفر کے حکم میں رہے گا، جب تک کسی شہر یا گاؤں میں پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت نہیں کرتا۔

❁❁❁

(٢،١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ١٣٩/١

وطنِ اقامت کے پاس سے گزرنا

سوال نمبر(95):

ایک شخص وطنِ اصلی (الف) سے وطنِ اقامت (ب) جانا چاہتا ہے۔دونوں کے درمیان فاصلہ سفرِ شرعی کے برابر ہے،لیکن پہلے ایک ایسی جگہ (ج) جانا چاہتا ہے جو کہ وطنِ اقامت سے تو مسافتِ قصر پر نہیں،البتہ وطنِ اصلی سے مسافتِ قصر پر واقع ہے۔اب سوال یہ ہے کہ راستے میں وطنِ اقامت (ب) پر سے گزرتا ہوا قصر کرے گا یا اتمام، حالانکہ انشائے سفر سے وطنِ اقامت باطل ہوجاتا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص وطنِ اصلی سے شرعی سفر کے ارادے سے نکلے اور اتفاق سے کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں جانے کے لیے وطنِ اقامت سے گزرے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتو چاہے اس جگہ اور وطنِ اقامت کے درمیان مسافتِ قصر ہو یا نہ ہو،ہر صورت میں وطنِ اقامت میں اتمام کرے گا،قصر نہیں کرے گا،کیوں کہ وطنِ اقامت ابھی باطل نہیں ہوا، بلکہ باقی ہے۔وطنِ اقامت انشائے سفر سے تب باطل ہوگا، جب وہاں سے مکمل طور پر اعراض کرے اور آئندہ یہاں رہنے کا ارادہ نہ ہو،اگر کہیں اس کا سامان موجود ہو اور دوبارہ رہنے کا ارادہ بھی ہو تو پھر وطنِ اقامت قائم رہے گا،لہٰذا جب بھی وطنِ اقامت میں داخل ہوگا یا اس کے پاس سے گزرے گا تو اتمام کا پابند رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

کوطن الإقامة تبقی ببقاء الثقل،وإن أقام بموضع آخر.(۱)

ترجمہ:

وطنِ اقامت سامان پڑے رہنے سے باقی رہتا ہے،اگر چہ دوسری جگہ رہائش اختیار کرے۔

❁❁❁

(۱) البحر الرائق،کتاب الصلوة،باب المسافر،تحت قوله :ویبطل الوطن الاصلی :۲/۲۳۹

دورانِ سفر اپنے شہر میں قیام کرنا

سوال نمبر(96):

ایک آدمی کی دس دن تشکیل گوجرانوالہ ہوئی۔ رائے ونڈ سے گوجرانوالہ جاتے ہوئے لاہور میں ایک رات قیام کرنا پڑا، حالانکہ یہ شخص لاہور کا رہنے والا بھی ہے، تو لاہور میں قیام کے دوران یہ شخص قصر کرے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس شہر میں کسی شخص کے اہل وعیال کا مستقل قیام ہو، چاہے ذاتی مکان ہو یا کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہوں تو وہاں سے گزرتے ہوئے قصر کی بجائے پوری نماز پڑھے گا، اگرچہ وہ مسافر ہو، کیونکہ وہ اس شہر میں مقیم کے حکم میں شمار ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر لاہور والے ساتھی کی لاہور میں مستقل رہائش ہو تو لاہور اس کا وطن اصلی ہے، لہٰذا لاہور میں قیام کے دوران یا لاہور پر سے گزرتے ہوئے وہ پوری نماز پڑھے گا، کیوں کہ لاہور اس کا وطن اصلی ہے اور وطن اصلی سفر سے باطل نہیں ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وإذا دخل المسافر مصره أتم الصلوة وإن لم ينوالإقامة فيه ،سواء دخله بنية الإختيار، أو دخله لقضاء الحاجة.(۱)

ترجمہ:

جب مسافر اپنے شہر میں داخل ہوجائے تو پوری نماز پڑھے گا، اگرچہ اس شہر میں اقامت کی نیت نہ کی ہو، چاہے اپنے اختیار سے داخل ہوا ہو یا کسی ضرورت سے داخل ہوا ہو۔

❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس عشر في صلوة المسافر: ۱۴۲/۱

انشائے سفر سے وطنِ اقامت کے بطلان کا مطلب

سوال نمبر(97):

کسی شہر یا بستی کو وطنِ اقامت بنالینے کے بعد اگر یہ شخص شرعی سفر کی نیت سے اس علاقے سے باہر چلا جائے، اور پندرہ دن گزار لینے سے پہلے پہلے وطنِ اقامت واپس آئے تو یہ شخص دوبارہ وطنِ اقامت بنائے گا یا سابقہ وطنِ اقامت برقرار رہے گا۔ فقہ کی کتابوں میں انشا سفر سے وطنِ اقامت کے باطل ہونے کا لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو وطنِ اقامت کے بطلان کی وجہ سے دوبارہ نیت کی ضرورت ہے۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے جب ایک شخص مسافتِ سفر ۴۸ میل، یعنی ۷۸ کلومیٹر کی نیت سے نکلتا ہے تو اپنے شہر کی حدود سے نکل کر مسافر شمار ہوگا اور اس وقت تک مسافر متصور ہوگا، جب تک شہر کی حدود میں لوٹ کر داخل نہ ہو جائے یا کسی دوسرے شہر یا بستی میں پندرہ دن یا زائد ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔ ٹھہرنے کی یہ دوسری جگہ وطنِ اقامت کہلاتی ہے اور وطنِ اقامت وطنِ اصلی، وطنِ اقامت اور انشائے سفر تینوں سے باطل ہو جاتا ہے، جیسا کہ فقہ کے متون اور دوسری کتب میں مذکور ہے، لیکن وطنِ اقامت کے بطلان کے صحیح اسباب معلوم کرنے کے لیے فقہائے کرام کی عبارتوں کا سہارا لینا ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان اسباب سے وطنِ اقامت کے بطلان کی اصل منشا کیا ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: ''وطنِ اقامت کے بطلان کے اسباب اس وقت مؤثر رہیں گے، جب اس بات کی دلالت پائی جائے کہ وطنِ اقامت میں ٹھہرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور جس حاجت کے لیے ٹھہرا تھا، وہ پوری ہوگئی''۔ اس لیے وطنِ اقامت والا آدمی اگر کسی ضروری کام کو نبھانے کے لیے وطنِ اصلی یا کہیں اور سفرِ شرعی کی نیت سے دو چار دن لگا کر واپس وطنِ اقامت لوٹ آئے تو اس سے وطنِ اقامت باطل نہ ہوگا، اسی علت کی بنا پر جب تک ایک شخص کا سامان وغیرہ وطنِ اقامت میں پڑا ہے تو وہ جب بھی آئے گا، مقیم متصور ہوگا۔

مذکورہ وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ فقہا کی عبارات میں انشائے سفر سے مراد وطنِ اقامت سے مکمل اعراض ہے، یعنی جب تک انشائے سفر کی نیت سے اس علاقے کو مکمل طور پر چھوڑنے کا عزم نہ ہو، اس وقت تک کسی انشائے سفر سے وطنِ اقامت باطل نہ ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وطن الإقامة ينتقض بالوطن الأصلي......وينتقض بالسفر أيضا؛لأن توطنه في هذا المقام ليس للقرار،ولكن لحاجة،فإذا سافر منه يستدل به على قضاء حاجته،فصار معرضا عن التوطن به، فصار ناقضا له دلالة.(١)

ترجمہ:

وطنِ اقامت وطنِ اصلی سے باطل ہو جاتا ہے۔۔۔۔اور سفر کے ساتھ بھی باطل ہو جاتا ہے،کیونکہ اس علاقے میں مستقل رہنے کے لیے نہیں، بلکہ کسی حاجت سے ٹھہرا تھا،اب جب یہاں سے سفر کر رہا ہے تو یہ اس کی حاجت پوری ہونے پر دلالت کر رہا ہے،گویا اسے وطنِ اقامت بنانے سے اعراض کر رہا ہے تو یہ (وطنِ اقامت) کے توڑنے پر دلالت کرتا ہے۔

❁❁❁

وطنِ اقامت میں سامان کی موجودگی

سوال نمبر(98):

میرا تعلق آزاد کشمیر سے ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں دو سال کے لیے داخلہ ملا ہے، ہر ہفتے گھر جایا کرتا ہوں۔ایک مرتبہ پندرہ دن سے زائد وقت گزار چکا ہوں، جب بھی گھر جاتا ہوں تو میرا سامان پڑا رہتا ہے۔یونیورسٹی میں پندرہ دن سے کم وقت گزارنے کی صورت میں سفر کی نماز پڑھوں گا یا پوری نماز پڑھوں گا؟ وضاحت فرمائیں۔

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کوئی شخص جب اپنے علاقے سے شرعی مسافت کی مقدار سفر کرنے کا ارادہ کر کے نکلتا ہے تو جب تک اپنے علاقے کی طرف واپس نہیں لوٹتا یا کسی علاقے میں پندرہ دن اقامت کی نیت نہیں کرتا، مسافر کے حکم میں رہے گا، البتہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کے ساتھ کسی جگہ قیام کرنے سے وہ جگہ وطنِ اقامت بن جائے گی۔اب جب تک اس کا سامان وغیرہ پڑا ہو اور مستقل طور پر یہ علاقہ چھوڑنے کی نیت نہ کی ہو تو یہ جگہ اس کا وطنِ اقامت شمار ہوگا۔

(١) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة،فصل في بيان مايصيربه المسافرمقيما:١/٤٩٨

اپنے علاقے تک آمدورفت سے وطنِ اقامت پر اثر نہیں پڑے گا، لہٰذا موصوف پشاور یونیورسٹی میں قیام کے دوران پوری نماز پڑھے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وقیل:تبقیٰ وطنا؛لأنھا کانت وطناله بالأھل والدار جمیعا،فبزوال أحد ھمالا یرتفع الوطن، کوطن الإقامة تبقیٰ ببقاء الثقل،وإن أقام بموضع آخر.(۱)

ترجمہ:

کہا گیا ہے کہ وطنِ اصلی باقی رہتا ہے، اس لیے کہ وطنِ اصلی اہل اور گھر دونوں کی وجہ سے کہلاتا ہے تو کسی ایک کے زائل ہونے سے وطنِ اصلی باطل نہیں ہوتا، جیسا کہ وطنِ اقامت سامان کے پڑے رہنے سے باقی رہتا ہے، اگرچہ قیام کسی اور جگہ ہو۔



ایک شہر میں مختلف مقامات پر ٹھہرنا

سوال نمبر(99):

میرا وطنِ اصلی بنوں ہے۔ گھر پشاور میں ہے اور پشاور کے ایک مدرسہ میں مقیم ہوں، چودہ دن کے بعد گھر جاتا ہوں تو مدرسہ میں پندرہ دن پورے نہ ہونے کی وجہ سے میری نماز کا کیا حکم ہوگا؟ اگر کوئی شخص دیہات کی مختلف بستیوں میں پندرہ دن سے زائد ٹھہرے گا تو اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ایک ہی شہر کے مختلف مقامات پر پندرہ دن ٹھہرنے سے اقامت ثابت ہوجاتی ہے، لہٰذا مذکورہ طالب العلم کا گھر بھی پشاور میں ہے تو گھر اور مدرسہ دونوں مقامات پر ٹھہرنے کی مدت ایک شمار ہوگی، اس لیے مدرسہ میں پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا۔ اگر دیہات کی مختلف بستیوں میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی ہو تو اس کی دو صورتیں بنتی ہیں۔ اگر ہر بستی ایک مستقل موضع اور الگ نام کے ساتھ موسوم ہو تو ایسی صورت میں مسافر رہے گا، اس کے برعکس اگر ہر بستی دوسری بستی کی تابع ہو اور الگ نام سے موسوم نہ ہو تو پھر مقیم رہے گا، جبکہ شہر کے مختلف مقامات مؤخر الذکر کے حکم میں ہیں۔

(۱) البحر الرائق، کتاب الصلوۃ، باب المسافر، تحت قوله:(ویبطل الوطن الأصلي):۲/۲۳۹

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو نوی الإقامة خمسة عشر یوما في موضعین،فإن کان کل منهما أصلا بنفسه نحو مکة ومنیٰ والکوفة والحیرة لا یصیر مقیما،وإن کان إحداهما تبعاً للاٰخر حتی تجب الجمعة علی سکانه یصیر مقیما(۱)

ترجمہ: اگر دو مختلف مقامات میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی ہو اور ہر مقام اپنی جگہ پر مستقل ہو، جیسے مکہ، منیٰ، کوفہ اور حیرہ تو مقیم نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک دوسرے کے تابع ہوں، یہاں تک کہ اس کے مکینوں پر جمعہ بھی واجب ہوتا ہو تو مقیم ٹھہرے گا۔

❁❁❁

مسافر امام کا مسافر مقتدیوں کو پوری نماز پڑھانا

سوال نمبر(100):

امام مسافر ہے اور اقتدا کرنے والے بھی مسافر ہیں۔اب اگر امام قصر کی بجائے پوری نماز پڑھ لیتا ہے تو نماز پر کیا اثر پڑے گا۔ چار رکعتیں پڑھنے کی صورت میں اگر دو رکعت پر قعدہ نہیں کیا تو پھر کیا حکم ہوگا؟ وضاحت کریں۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

امام مقیم اور اقتدا کرنے والا مسافر ہو تو پھر امام کے تابع ہونے کی وجہ سے مسافر مقتدی پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا اور دو رکعت نماز نفل شمار ہوگی۔اس صورت کے علاوہ مسافر چاہے امام ہو یا مقتدی اس پر قصر نماز پڑھنا واجب ہے اور پوری نماز پڑھ لینے سے گناہ گار ہوگا، تاہم اگر دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھا ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر قعدۂ اولیٰ میں بیٹھا نہ ہو تو نماز فاسد ہوگی، کیوں کہ یہ قعدہ مسافر کے حق میں فرض ہے اور فرض چھوٹنے کی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فرض المسافر في الرباعي رکعتان، کذا في الهدایة،والقصر واجب عندنا،فإن صلیٰ أربعاً وقعد في

(۱)الفتاویٰ الهندیة،کتاب الصلوة،الباب الخامس في صلوة المسافر:۱/۱۴۰

الثانية قدر التشهد أجزأته، والأخريان نافلة، ويصير مسيئا لتأخير السلام، وإن لم يقعد في الثانية قدرها بطلت. (۱)

ترجمہ: چار رکعتوں والی فرض نمازوں میں مسافر کے لیے دو رکعتیں پڑھنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہدایہ میں مذکور ہے۔ ہمارے نزدیک قصر کرنا واجب ہے، اگر چار رکعتیں پڑھ لے اور پہلے قعدہ میں دو رکعتوں کے بعد تشہد کی مقدار بیٹھ گیا تو نماز درست ہوجائے گی اور باقی دو رکعتیں نفل شمار ہوں گی، لیکن سلام کی تاخیر کی وجہ سے گناہ گار ہوگا اور اگر دو رکعت کے بعد تشہد کے برابر نہیں بیٹھا تو نماز ہی باطل ہوجائے گی۔

❁❁❁

باپ بیٹے کا ایک دوسرے کے وطنِ اقامت میں نماز

سوال نمبر (101):

ہمارا آبائی وطن سرائے نورنگ ہے۔ ہماری جائیداد اور گھر وغیرہ بھی نورنگ میں ہیں، جبکہ میں اولاد سمیت نورنگ سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر واقع بنوں شہر میں رہتا ہوں اور میرے والدین ڈی۔آئی۔خان میں مقیم ہیں۔ اب اگر میں ڈی۔آئی۔خان جاؤں یا میرے والدین میرے ہاں بنوں تشریف لائیں تو میری اور میرے والدین کی نمازوں کا حکم کیا ہوگا؟ یعنی قصر کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟ نیز ہم نے نورنگ، یعنی اپنا آبائی علاقہ عارضی طور پر ترک کیا ہے، مستقل طور پر دوبارہ وہاں رہنے کا ارادہ ہے؟

بينوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

سوال مذکور میں بیٹا ڈی۔آئی۔خان جانے کی صورت میں والدین کا تابع ہونے کی وجہ سے پوری نماز پڑھے گا، کیونکہ اولاد والدین کی نیت کے تابع ہوتے ہیں، لیکن والدین اگر ڈی۔آئی۔خان سے بنوں آئیں گے تو پوری نماز پڑھیں گے، کیونکہ بنوں سے پہلے وہ سرائے نورنگ (وطن اصلی) میں داخل ہوں گے۔ سرائے نورنگ سے بنوں تک مسافت طے کرنے سے وہ مسافر شمار نہیں ہوں گے، اس لیے کہ یہ مسافت شرعی مسافت کے برابر نہیں، لہٰذا بنوں میں بیٹا اور والدین سب مقیم کے حکم میں ہونے کی بنا پر پوری نماز پڑھیں گے۔

---

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس في صلوة المسافر: ۱۳۹/۱

والدّلیل علیٰ ذلک:

قولہ:(والأصل أن الشيء يبطل بمثله) كما يبطل وطن الأصلي بالوطن الأصلي، ووطن الإقامة بوطن الإقامة......ووطن الإقامة بالوطن الأصلي......قوله:(تلميذ)أي إذا كان يرتزق من أستاذه ......قلت:ومثله بالأولى،الابن البارّ البالغ مع أبيه.(۱)

ترجمہ: قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ایک چیز اپنی مثل سے باطل ہوتی ہے، جیسے وطنِ اصلی وطن اصلی سے باطل ہوتا ہے اور وطنِ اقامت (دوسرے) وطن اقامت سے (باطل ہوتا ہے)۔۔۔اسی طرح وطنِ اقامت وطنِ اصلی سے باطل ہوتا ہے۔۔ شاگرد جب اپنے استاذ کی زیر کفالت ہو (استاذ کا تابع ہوگا)۔۔۔اسی طرح بالغ فرماں بردار بیٹا باپ کا بطریق اولیٰ تابع رہے گا۔

❁❁❁

روزانہ گھر سے سفر کی مسافت پر نکلنا

سوال نمبر(102):

ایک تاجر روزانہ سینکڑوں میل کی مسافت کاٹنے کے بعد گھر لوٹ کر آتا ہے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا۔یعنی قصر کرے گا یا پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مذکورہ تاجر اپنے شہر کی حدود سے نکلنے کے بعد واپس اپنے شہر کی حدود میں داخل ہونے تک مسافر کے حکم میں رہے گا،اس لیے اپنے علاقے سے باہر روزانہ جتنی نمازیں پڑھے گا قصر کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(إذا فارق المسافر بيوت المصر،صلّى ركعتين)لأن الإقامة تتعلق بدخولها فيتعلق السفر بالخروج عنها.(۲)

---

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر،مطلب في الوطن الأصلي ووطن الاقامة:۲/۶۱۵

(۲)الهداية،كتاب الصلوة،باب صلوة المسافر:۱/۱۷۴

ترجمہ: جب مسافر اپنے شہر کی آبادی سے گزر جائے تو دو رکعت نماز پڑھے گا، اس لیے کہ اقامت کا حکم آبادی میں داخل ہونے سے نافذ ہوگا تو سفر کا حکم (اس سے) نکلنے پر نافذ ہوگا۔

❁❁❁

وطنِ اصلی قدیم میں صرف ایک بیوی کا رہ جانا

سوال نمبر (103):

ایک آدمی نے وطنِ اصلی سے اہل کو منتقل کرکے دوسری جگہ وطنِ اصلی بنالیا۔ پہلے وطن میں اس کی دوسری بیوی موجود ہے تو ایسی صورت میں وطنِ اصلی قدیم جا کر قصر کرے گا یا اتمام؟ نیز اگر پہلے وطنِ اصلی میں اس کی بیوی بچے نہ ہوں تو پھر کیا حکم ہوگا؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ وطنِ اصلی جدید وطنِ اصلی قدیم کو باطل کر دیتا ہے۔ وطنِ اصلی جدید کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے سے اہل وعیال کو دوسری جگہ منتقل کرکے مکمل سکونت اختیار کرے اور پہلا علاقہ اس طرح چھوڑ دے کہ آئندہ وہاں نہ رہنے کا عزم ہو تو ایسی صورت میں وطنِ اصلی جدید وطنِ قدیم کو باطل کر دیتا ہے۔ اب اگر یہ شخص وطنِ اول (قدیم) جا کر پندرہ دن سے کم ٹھہرتا ہے اور مسافت بھی شرعی سفر کے برابر ہو تو قصر کرے گا۔ اہل وعیال سمیت مستقل طور پر منتقل ہونے کے بعد وطنِ اصلی قدیم میں محض جائیداد کی موجودگی قصر سے مانع نہیں۔ اس کے برعکس اگر قدیم اور جدید دونوں میں اہل وعیال موجود ہوں تو پھر یہ دونوں علاقے اس کے وطنِ اصلی کہلائے گے اور یہ شخص ان دونوں علاقوں میں جب بھی جائے گا اور جتنے وقت کے لیے جائے گا، مقیم کے حکم میں شمار ہوکر پوری نماز پڑھنے کا پابند ہوگا۔

نیز وطنِ اصلی کی بقا اور ختم ہونے کے حکم میں بنیادی طور پر اہل وعیال کی علت کارفرما رہتی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي، إذاانتقل عن الأول بأهله، وأما إذالم ینتقل بأهله، ولکنه استحدث أهلاً ببلدة أخری، فلایبطل وطنه الأول، ویتم فیها. (١)

(١) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوة، الباب الخامس في صلوة المسافر: ١/ ١٤٢

ترجمہ: وطن اصلی، وطن اصلی کو باطل کر دیتا ہے، بشرطیکہ پہلے وطن سے اہل وعیال سمیت منتقل ہوا ہو، اگر اہل وعیال کو منتقل نہ کیا ہو، بلکہ محض بعض اہل کو دوسرے شہر میں بسایا ہو تو پہلا وطن باطل نہیں ہوگا، بلکہ وہاں بھی اتمام کرے گا

❁❁❁

وطنِ اصلی کا باطل ہونا

سوال نمبر(104):

کوئی شخص اپنے ملک سے چلا جائے، کسی اور ملک میں اقامت اختیار کرے اور پہلے ملک کی جائیداد بھی وہاں منتقل کروے۔اب یہاں سے سابقہ ملک عارضی طور پر جانے کی صورت میں قصر نماز پڑھے گا یا پوری نماز پڑھے گا؟
بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مختلف روایات اور فقہی عبارات کی رُو سے وطنِ اصلی کے معتبر ہونے میں اہل وعیال کی سکونت کو بڑا دخل ہے،اس لیے اگر کوئی شخص اہل وعیال سمیت مکمل طورا پنے آبائی مقام سے کسی دوسرے مقام کی طرف منتقل ہوجائے اور مستقل طور پر اہل وعیال سمیت رہائش پذیر ہوجائے تو یہ مقام اس کے لیے بمنزلہ وطنِ اصلی کے ہوگا،لہٰذا اگر کوئی شخص اہل وعیال کو منتقل کرنے کے بعد کسی کام کی غرض سے اپنے آبائی مقام چلا جائے اور وہاں اس نے اقامت کی نیت نہیں کی ہو تو جب تک وہاں رہے گا،مسافر کے زمرے میں شمار ہوگا،اس لیے قصر کرے گا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ کی رُو سے جب مذکورہ شخص نے دوسری جگہ میں سکونت اختیار کی ہے اور اہل وعیال کو بھی منتقل کرلیا ہے تو اب یہ ملک اس کے لیے بمنزلہ وطنِ اصلی کے ہے اور سابق ملک کا علاقہ اس کا وطنِ اصلی نہیں رہا،اگرچہ اس کی جائیداد دوسرے ملک میں موجود ہو،اس لیے سابقہ علاقے جانے کی صورت میں قصر نماز پڑھے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته،أو بلدة أخرى اتخذها دارا،و توطن بها مع أهله وولده،وليس من قصده الارتحال عنها،بل التعيش بها...فالوطن الأصلي ينتقض بمثله لاغير،وهو أن الانسان يتوطن في بلدة أخرى وينقل الأهل إليها من بلدته،فيخرج الأول من أن يكون وطنا أصلياً،حتىٰ لو دخل فيه مسافراً لاتصير صلاته أربعاً.(١)

(١) بدائع الصنائع،كتاب الصلوة،فصل في بيان مايصير به المسافر مقيماً:١/٤٩٧-٤٩٨

ترجمہ: وطنِ اصلی انسان کا وہ وطن ہے جو اس کے شہر میں ہو یا دوسرے شہر میں جہاں اس نے گھر بنایا ہوا اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس کو وطن بنایا ہوا اور یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی نیت نہ ہو، بلکہ رہنے کا ارادہ ہو پس وطنِ اصلی اپنی مثل کے ساتھ باطل ہوگا کسی اور سے (باطل) نہ ہوگا اور وہ اس طرح ہے کہ دوسرے شہر کو وطن بنائے اور اہل وعیال وہاں منتقل کرے تو اول وطنِ اصلی ہونے سے نکل جائے گا، اگر وہاں مسافر ہو کر داخل ہوگا تو اتمام نہیں کرے گا۔

❁❁❁

سلام پھیرنے کے بعد امام کا مسافر ہونے کا اعلان

سوال نمبر (105):

اگر امام مسافر ہو اور مقتدیوں میں کچھ مقیمین بھی ہوں تو امام کا ان کو سلام پھیرنے کے بعد یہ کہنا کہ "میں مسافر ہوں، اپنی نماز پوری کرو" ازروئے شریعت کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ مسافر اگر کسی ایسی جگہ امامت کرے، جہاں اس کے پیچھے مقیمین بھی نماز پڑھ رہے ہوں اور ان کو امام کی حالتِ سفر کا علم نہ ہو تو سلام پھیرنے کے بعد لوگوں کو بلند آواز سے کہے، کہ "نماز مکمل کرلو، میں مسافر ہوں، یہ عمل نہ صرف جائز ہے، بلکہ مستحب بھی ہے، تاکہ نماز پڑھنے والے مقیمین نماز کے منافی کسی عمل میں پڑ جانے سے پہلے ہی بقیہ دو رکعت نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ویستحب للإمام إذا سلم أن یقول:أتموا صلاتکم،فإنا قوم سفر)لأنه علیه السلام قاله حین صلی بأهل مکة وهو مسافر.(۱)

ترجمہ: امام کے لیے مستحب ہے کہ جب سلام پھیرے تو یوں کہے کہ "تم اپنی نماز پوری کرلو، ہم مسافر قوم ہیں" کیونکہ نبی پاک ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا، جب اہل مکہ کو نماز پڑھائی اور وہ مسافر تھے۔

❁❁❁❁❁

(۱) الهدایة، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ المسافر: ۱/ ۱۷۵، ۱۷۶

باب صلوۃ المریض

(مباحث ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

بہترین جسمانی قالب اور عقل ودانائی سے نوازے جانے کے باوجود انسان عوارض سے خالی نہیں۔اسلام کا یہ تصور ہے کہ بیماری اور شفا اللہ کی طرف سے ہے،جس میں فرماں بردار اور نافرماں کی کوئی تخصیص نہیں اور نہ ہی بیماری کسی انسان کے گناہ گار ہونے کی دلیل ہے۔دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام نے مرض کے سلسلے میں جو تصور دیا ہے، اس سے مریض کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات ابھرتے ہیں۔مرض اور بیماری کے دوران شریعتِ مطہرہ نے انسان کو فالتو پرزہ قرار دینے کی بجائے اس کو دوسرے انسانوں کی طرح مکلف بنادیا ہے،تاکہ نفسیاتی طور پر وہ محرومی اور کمتری کے اس احساس سے بچ سکے کہ ''میں اب کسی دنیوی یا اخروی کام کے قابل نہ رہا'' بلکہ اس کے لیے شریعت کے تمام احکام میں سہولت اور آسانی پیدا کرکے حکم دیا گیا کہ اپنے اندر جتنی طاقت دیکھو اسی کی بقدر احکاماتِ شرعیہ کی پابندی کرلو۔

ان سہولتوں میں سے ایک بڑی سہولت نماز کے احکام میں تخفیف ہے جس سے احکاماتِ شرعیہ کے اعتدال کے ساتھ ساتھ نماز کی انتہائی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔(۱)

مرض کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

مرض کا لغوی معنی ہے ''فساد المزاج'' جب کہ اصطلاح میں مرض انسانی بدن کو عارض ہونے والی اس حالت کا نام ہے، جو بدن کو حدِ اعتدال سے نکال دے۔''صلاۃ المریض'' میں صلاۃ کی اضافت مریض کی طرف ''اضافۃ الفعل الی فاعلہ'' کے قبیل سے ہے۔(۲)

صلاۃ المریض کی مشروعیت:

مریض کے لیے نماز میں تخفیف کی مشروعیت نبی کریم ﷺ کے قول وفعل ہر ایک سے ثابت ہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ،صلاۃ المعذورین:۲/۲۲،قاموس الفقہ ،مادۃ مرض:۵/۷۵،۷۶

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ ،مادۃ صلاۃ المریض :۲۷/۲۵۹،مراقی الفلاح،باب صلاۃ المریض،ص:۳۵۰

حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ: ”مجھے بواسیر کی شکایت تھی تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر اس پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو، اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو“۔(۱)

اسی طرح قرآن کریم کی آیت ”لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا“ (البقرۃ:۲۸۶) اور شرعی اصول کو مدِنظر رکھ کر مریض کی نماز میں تخفیف پر تمام فقہاے کرام کا اجماع واتفاق ہے۔(۲)

مرض کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم:

قیام یعنی کھڑے ہونے سے عاجز ہونا:

عجز عن القیام کی دو صورتیں ہیں: (۱) عجز حقیقی (۲) عجز حکمی

(۱) عجز حقیقی: اس سے مراد یہ ہے کہ مریض کھڑے ہونے پر بالکل قادر ہی نہ ہو، یعنی ایسا بیمار ہو کہ کھڑا ہو جائے تو فوراً گر جائے یا کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کو ضرر لاحق ہو جائے۔

(۲) عجز حکمی: اس میں قدرے تفصیل ہے کہ:

(الف) کھڑے ہونے میں ناقابل برداشت تکلیف کا سامنا کرنا پڑے، جیسے سر چکرا کر گر جانا، دانت یا آنکھ میں سخت درد ہونا یا درد سر میں مبتلا ہونا یا اُلٹیاں آنا وغیرہ۔

(ب) اپنے سابقہ تجربات ومشاہدات یا اپنے حالات سے آگاہی یا کسی ہوشیار اور مسلمان طبیب کے مشورے کی روشنی میں اپنے مرض کی شدت کا خطرہ ہو۔

(ج) مذکورہ ذرائع سے معلوم ہو جائے کہ کھڑے ہونے کی وجہ سے بیماری طول پکڑ جائے گی۔

(د) کھڑے ہونے کی وجہ سے کمزوری اتنی بڑھ سکتی ہو جس سے روزہ رکھنے یا نماز کے دوسرے ارکان کی ادائیگی سے عاجز ہونے کا ڈر ہو۔

(ھ) کھڑے ہونے کی وجہ سے کسی درندے یا دشمن سے جانی نقصان یا مالی ضرر پہنچ جانے کا خدشہ ہو۔

(و) نمازی ایسے تنگ خیمے میں ہو جس میں کھڑا ہونا ممکن نہ ہو اور باہر سخت بارش اور کیچڑ ہو۔

---

(۱) الصحیح للبخاري، أبواب تقصیر الصلوۃ، باب إذا لم یطق قاعدا صلی علی جنب: ۱/۱۵۰

(۲) الموسوعۃ الفقهیۃ، مادۃ صلاۃ المریض: ۲۷/۲۵۹

(ز) کھڑے ہونے کی وجہ سے پیشاب جاری ہونے یا زخم سے خون نکلنے کا خطرہ ہو۔

عجزِ حقیقی اور عجزِ حکمی کی ان تمام صورتوں میں بیٹھ کر رکوع وسجدے کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے، چاہے یہ اعذار نماز سے پہلے ہی موجود ہو جائیں یا نماز کے دوران پائے جائیں، البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ مذکورہ صورتوں کے علاوہ معمولی تکلیف کی وجہ سے فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں۔ اسی طرح لاٹھی، دیوار یا ستون وغیرہ سے ٹیک لگا کر فرض نماز پڑھ سکتا ہو تو اس کے لیے بھی بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ وہ شخص جس کے لیے پوری نماز میں قیام دشوار ہو لیکن کچھ دیر کھڑا رہ سکتا ہو (مثلاً تحریمہ کے بقدر) تو طاقت کی بقدر کھڑا ہونا اس پر فرض ہے۔ عالمگیری میں شمس الائمہ حلوائی سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ شخص تحریمہ کے لیے کھڑا نہ ہوا تو اس کی نماز کے عدم جواز کا خوف ہے۔

بیٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے کوئی ہیئت متعین نہیں، جس طرح بیٹھنے میں سہولت ہو اسی طرح بیٹھ کر نماز ادا کرے تاہم اگر سہولت اور آسانی کے اعتبار سے تمام ہیئات برابر ہوں تو تشہد کی طرح بیٹھ جانا افضل ہے۔ (۱)

رکوع وسجدے یا صرف سجدے سے عاجز ہونے کا حکم:

اگر کوئی شخص مرض کی وجہ سے رکوع وسجدے یا صرف سجدے پر قادر نہ ہو، لیکن ٹیک لگا کر یا ٹیک لگائے بغیر بیٹھنے پر قادر ہو تو ایسا شخص بیٹھ کر سر کے اشارے سے رکوع اور سجدہ کرے، تاہم سجدہ کے اشارہ کو بمقابلہ رکوع کے زیادہ پست رکھے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر کوئی شخص قیام اور رکوع پر تو قادر ہو لیکن سجدہ پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے کھڑے ہو کر قراءت کرنا اور رکوع کرنا بھی جائز ہے تاہم سجدہ کرنے کے لیے وہ بیٹھ کر اشارہ کرے گا۔ علامہ شرنبلالیؒ نے ایسا کرنے کو زیادہ بہتر کہا ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں قدرت کے ہوتے ہوئے قیام پر بھی عمل ہو جاتا ہے، البتہ علامہ حصکفی وشامیؒ اور اکثر فقہاء نے بیٹھ کر رکوع کے لیے اشارہ کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔

علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر کسی شخص کی ناک یا پیشانی میں سے کسی ایک پر زخم ہو تو ان میں سے صحیح عضو پر سجدہ کرنا فرض ہے بشرطیکہ سجدہ کرنے سے تکلیف بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو''۔

رکوع وسجدہ کے لیے اشارہ کرتے وقت اگر کسی شخص نے خود یا کسی کی مدد سے لکڑی یا تکیہ وغیرہ اٹھا کر اس پر سجدہ کیا تو اس کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہے۔ ایسی صورت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ لکڑی یا تکیہ پر سر رکھتے وقت اگر نمازی نے اپنے پشت اور سر کو رکوع سے زیادہ نیچا کیا ہو تو نماز جائز ہوگی، بصورتِ دیگر نماز جائز ہی نہیں رہے گی اس لیے کہ

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، باب صلاة المريض: ۲/ ۵٦٤ـ ۵٦۷، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المريض، ص: ۳۵۰، ۳۵۱، الفتاوى الهندية، الباب الرابع عشر في صلاة المريض: ۱/ ۱۳٦

ایسا کرنا نہ تو سجدہ ہے اور نہ سجدہ کے لیے اشارہ کرنا۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر مریض کسی قدر سجدہ کرنے پر قادر ہو تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ پہلے سے زمین پر کوئی پاک اور سخت چیز رکھ دے جو دو اینٹوں کی مقدار سے زیادہ اونچی نہ ہو اور پھر اس پر سجدہ کیا کرے''۔ ایسا کرنے کی صورت میں یہ نمازی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھنے والا شمار ہوگا، لہٰذا قیام پر قادر شخص اس کی اقتداء کر سکتا ہے اور دوران نماز بذاتِ خود قیام پر قادر ہونے کی صورت میں کھڑا ہو کر اسی نماز کو پورا کر سکتا ہے، تاہم اگر رکھی ہوئی چیز سجدہ کے قابل نہ ہو یا بہت زیادہ اونچی ہو تو اس پر سر رکھنے کے باوجود یہ شخص اشارہ کرنے والا شمار ہوگا جس کے پیچھے کھڑے ہونے والی کی اقتداء جائز نہیں اور نہ ہی قیام پر قدرت پانے کی صورت میں اس نماز کو پورا کر سکتا ہے، بلکہ نماز کا از سرِ نو اعادہ واجب رہے گا۔(۱)

بیٹھ کر یا سر سے اشارہ کے ذریعے نماز پڑھنے سے عاجز ہونے کا حکم:

اگر بغیر کسی سہارے کے بیٹھنا مشکل ہو تو ٹیک لگا کر بیٹھ جائے اور نماز پڑھ لے، تاہم اگر سہارے کے ساتھ بیٹھ کر بھی نماز پڑھنے پر قدرت نہ ہو تو لیٹ کر نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ لیٹ کر نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہو: یا تو بالکل چت لیٹ جائے اور پاؤں قبلہ کی طرف رکھے اور رکوع وسجدہ کے لیے سر سے اشارہ کرے، البتہ اس صورت میں دو باتوں کا خیال رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ اول یہ کہ سر کے نیچے تکیہ وغیرہ رکھ لے تاکہ چہرہ بھی قبلہ کی طرف ہو سکے اور رکوع وسجدہ کے لیے اشارہ کرنا بھی آسان ہو جائے۔ دوسری بات یہ کہ اگر مریض کے لیے ممکن ہو تو وہ اپنے گھٹنوں کو اوپر اٹھا لے تاکہ پاؤں کا رخ قبلہ کی بجائے زمین کی طرف ہو جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دائیں کروٹ پر اس طرح لیٹے کہ چہرہ قبلہ کی طرف ہو۔ اگر دائیں کروٹ میں تکلیف ہو تو بائیں کروٹ پر لیٹ جائے، تاہم دونوں صورتوں میں سے چت لیٹنا زیادہ بہتر ہے۔(۲)

اگر لیٹ کر بھی سر سے اشارہ ممکن نہ ہو تو محض آنکھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے نماز کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ یہی حنفیہ کے ہاں مفتیٰ بہ قول ہے، اس لیے کہ سجدہ سر کا عمل ہے نہ کہ اعضاء کا، لہٰذا ایسی صورت میں نماز حالتِ صحت تک

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، باب صلاة المریض: ۲/۵۶۷-۵۶۹، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المریض، ص: ۳۵۱، ۳۵۲، الفتاوی الهندية، الباب الرابع عشر في صلاة المریض: ۱/۱۳۶

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، باب صلاة المریض: ۲/۵۶۹، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب صلوة المریض، ص: ۳۵۲، الفتاوی الهندية، الباب الرابع عشر في صلاة المریض: ۱/۱۳۶، ۱۳۷

مؤخر کی جائے گی۔(۱)

دورانِ مرض فوت شدہ نمازوں کا حکم:

اس پر فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے ہوش وحواس کام چھوڑ دے اور یہ حالت پانچ نمازوں کے اوقات سے زیادہ برقرار رہے تو اس دوران فریضۂ نماز ساقط ہوجائے گا اور اس کی قضا واجب نہ ہوگی۔اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر معذوری اور بیماری اتنی طویل ہوگئی کہ اسی دوران ہی وفات ہوگئی تو ایسی صورت میں اس پر ان نمازوں کی بابت فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرنا واجب نہیں اور نہ ہی وہ گناہ گار ہوگا۔اگر چہ یہ نمازیں پانچ سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر مریض کا ہوش وحواس تو بحال ہو لیکن وہ سر سے اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہو اور یہ حالت اس پر پانچ نمازوں کے اوقات سے زیادہ دیر تک رہی اور اس کے بعد وہ بیماری سے شفایاب ہو کر نماز ادا کرنے پر قادر ہوجائے تو حنفیہ کے مفتیٰ بہ اور راجح قول کے مطابق اس سے نمازیں ساقط ہوجائیں گی اور ان کی قضا واجب نہ ہوگی۔اکثر مشائخ اور اکابر کا مختار اور پسندیدہ قول یہی ہے،تاہم اگر بیماری کی یہ حالت پانچ نمازوں سے کم ہو تو ان نمازوں کی قضا واجب ہوگی۔(۲)

چند متفرق مسائل:

(۱)صحت کی حالت میں نماز شروع کرنے کے بعد اگر بیماری پیش آجائے تو حسبِ طاقت بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ یا لیٹ کر اشارہ کے ساتھ نماز پڑھ لے۔

(۲)بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھنے والا شخص اگر دوران نماز کھڑے ہونے پر قادر ہوجائے تو اسی نماز کو کھڑا ہو کر پوری کرے اور اگر نماز اشارہ کے ساتھ پڑھ رہا تھا پھر رکوع وسجدہ پر قادر ہوگیا تو نماز کو ازسرِ نو لوٹائے گا۔

(۳)اگر مریض کا رخ قبلہ کی جانب نہ ہو اور وہ خود قبلہ کی طرف رخ کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی دوسرے شخص کے ذریعے اپنا رخ قبلہ کی طرف پھیر لے،تاہم اگر ایسا کوئی شخص نہ ملے تو یوں ہی نماز ادا کرے،بعد میں اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔(۳)

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار،باب صلاۃ المریض:۲/ ۵۷۰،مراقي الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوي،باب صلوۃ المریض، ص: ۳۵۳،۳۵۲،الفتاوی الهندیۃ،الباب الرابع عشر في صلاۃ المریض:۱/ ۱۳۷

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار،باب صلاۃ المریض:۲/ ۵۷۰،مراقي الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوي،باب صلوۃ المریض، ص: ۳۵۳،۳۵۲،الفتاوی الهندیۃ،الباب الرابع عشر في صلاۃ المریض:۱/ ۱۳۷

(۳) الفتاوی الهندیۃ،الباب الرابع عشر في صلاۃ المریض:۱/ ۱۳۷

باب صلوة المريض

(مریض کی نماز کا بیان)

شدید بیمار کی نماز

سوال نمبر(106):

ایک آدمی اتنا شدید بیمار ہے کہ نہ اٹھ سکتا ہے اور نہ بیٹھ سکتا ہے، یہاں تک کہ سر سے اشارہ کرنے سے بھی قاصر ہے تو ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے؟ یعنی ایسی صورت میں نماز ساقط ہوگی یا آنکھ کے اشارے سے پڑھنی ہوگی؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

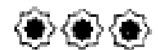
اگر مریض اس قدر شدید بیمار ہو کہ سر کے اشارے سے بھی نماز نہیں پڑھ سکتا تو اس سے نماز کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ پھر اگر اسی حالت میں دن رات سے زیادہ رہا تو نمازوں کی قضا واجب نہیں۔ اگر مذکورہ حالت دن رات سے کم ہو تو پھر ان نمازوں کی قضا لازم ہوگی۔

والدّليل علىٰ ذٰلك:

وإذا عجزالمريض عن الإيماء بالرأس في ظاهرالرواية يسقط عنه فرض الصلوة.(١)

ترجمہ:

اگر جب مریض سر کے اشارے سے بھی (نماز پڑھنے سے) عاجز ہو تو ظاہر روایت کے مطابق اس شخص سے نماز کا فریضہ ساقط ہوگا۔



(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الرابع عشر في صلاة المريض: ١/١٣٧

ہاتھ پاؤں سے مکمل معذور کی نماز

سوال نمبر(107):

جس شخص کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے ہوں یا ہاتھ پاؤں حرکت نہ کرسکتے ہوں اور باقی جسم درست ہو تو ایسے شخص کی نماز کا کیا حکم ہے؟ ہمارے ہاں ایک شخص کی حالت ایسی ہے، اس کی والدہ بڑی مشکل سے اس کو وضو کراتی ہے۔ فریضہ نماز اس سے ساقط ہوگا یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسا شخص جس کے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے، یہاں تک کہ وضو بھی نہیں کرسکتا تو کسی اور سے وضو کرائے۔ اگر بآسانی وضو کرانے کی سہولت میسر نہ ہو تو پھر تیمم کر کے نماز پڑھے۔ اگر تیمم کرنے سے بھی معذور ہو تو اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت زمین کے ساتھ مسح کرے اور چہرہ کسی دیوار کے ساتھ مسح کر کے نماز پڑھے۔ اگر ہاتھ سے زمین پر مسح کرنے پر بھی قادر نہ ہو تو بغیر وضو کے نماز پڑھے گا، اس لیے کہ فریضہ نماز کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا۔ یہی حکم اس شخص کا بھی ہے، جس کے ہاتھ پاؤں کٹ گیے ہوں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(مقطوع الیدین والرجلین إذا کان بوجهه جراحة یصلي بغیر طهارة)، ولا یتیمم (ولا یعید الصلوٰة علی الأصح).(۱)

ترجمہ:

جس شخص کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے ہوں اور چہرے پر زخم ہو تو بغیر وضو کے نماز پڑھے اور تیمم نہ کرے اور صحیح قول کے مطابق نماز کا اعادہ بھی نہ کرے۔

وإن شلت یداه، وعجز عن الوضوء والتیمم یمسح ذراعیه مع المرفقین علی الأرض، ووجهه علی الحائط، ولا یدع الصلوٰة.(۲)

(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الطهارة، باب التیمم: ۱/۲۳۲

(۲) الفتاوی الخانیة علی هامش الفتاوی الهندیة، کتاب الطهارة، باب الوضوء والغسل، فصل في صفة الوضوء: ۱/۳۲

ترجمہ:

اگر کسی کے ہاتھ شل ہوگئے ہوں اور وضو اور تیمم کرنے سے عاجز ہو تو دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت زمین کے ساتھ اور چہرے کو کسی دیوار کے ساتھ مل لے، لیکن نماز نہ چھوڑے۔

❁❁❁

دماغی توازن کھو جانے کے بعد نماز اور فدیہ کا حکم

سوال نمبر(108):

میری والدہ فالج کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھی ہے، یہاں تک کہ وہ نماز، روزہ وغیرہ تک نہیں جانتی۔ ایسی حالت میں جو نمازیں اور روزے اس سے فوت ہوئے ہیں، ان کا فدیہ دینا لازم ہے یا نہیں؟ کیا اس کی موت کے بعد اس کے ورثا پر مذکورہ نمازوں اور روزوں کا فدیہ دینا واجب ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی تندرست آدمی دماغی توازن کھو بیٹھے، یہاں تک کہ نماز وغیرہ کی تمیز بھی نہ کر سکے اور فوت شدہ نمازوں کی تعداد پانچ سے بڑھ جائے اور جنون بدستور جاری رہے تو اس شخص کے ذمہ سے نماز کا فریضہ ساقط ہوگا۔

مذکورہ حالات کی روشنی میں اس مریض پر سرے سے ان نمازوں کی قضا ہی نہیں، اس لیے فدیہ بھی لازم نہ ہوگا، کیونکہ فدیہ کا وجوب وہاں آتا ہے، جہاں قضا لازم ہونے کے بعد ادائیگی نہ ہو سکے اور مذکورہ صورت میں چونکہ مریض مسلسل دماغی طور پر مفلوج رہا، اس لیے قضا بھی ساقط ہے اور فدیہ بھی ساقط ہے، لہٰذا ایسی حالت میں قضا شدہ نمازوں اور روزوں کا فدیہ ورثا کے ذمے لازم نہیں، البتہ صحت کی حالت میں جو نمازیں یا روزے فوت ہوئے ہیں یا صحت یاب ہونے کے بعد کوئی روزہ یا نماز چھوٹ گئی ہو تو اس کی قضا لانا یا پھر موت کی صورت میں فدیہ کی وصیت کرنا لازمی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(أفاقا)أي في آخر الوقت ولو بقدر مایسع التحریمة عند علمائنا الثلاثة......فیجب علیهما القضاء

......وعلم منه أنه لو أفاقا في الوقت مایسع أكثر من التحریمة تجب علیهما صلاته بالأولیٰ، وأنه لو لم یبق

منه مایسع التحریمة لم تجب علیهما صلوته......وهذا إذا زاد الجنون والإغماء علی خمس صلوات.(۱)

ترجمہ:

آخری وقت میں بے ہوش اور مجنون کو اتنا افاقہ ہو جائے، جس میں تکبیر تحریمہ پڑھنے کی گنجائش ہو تو ہمارے تینوں ائمہ کے نزدیک ان دونوں پر قضا لازم ہے۔۔۔اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر ان کو افاقہ ہوا اور وقت میں تحریمہ سے زیادہ کی گنجائش ہو تو ان پر اس وقت کی نماز بطریقہ اولیٰ واجب ہے۔۔۔اور اگر تحریمہ باندھنے کے برابر وقت نہیں ملا تو اس وقت کی نماز ان پر واجب نہیں۔۔۔۔اور یہ تب ہے جب جنون اور بے ہوشی پانچ نمازوں سے تجاوز کر جائے۔

وإذا عجز المریض عن الإیماء بالرأس في ظاهر الروایة یسقط عنه فرض الصلوة......وإن مات من ذلك المرض لاشيء علیه ولا یلزمه فدیة.(۲)

ترجمہ:

جب مریض سر سے اشارہ کرنے سے بھی عاجز ہو جائے تو ظاہر الروایۃ کے مطابق اس سے نماز کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔۔۔۔اور اگر وہ اسی مرض کے دوران فوت ہو گیا تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں، نہ ہی اس پر فدیہ ہے۔

ومن أغمي علیه خمس صلوات قضی ولو أکثر لا یقضي والجنون کالإغماء وهو الصحیح.(۳)

ترجمہ:

جس شخص پر پانچ نمازوں کے بقدر بے ہوشی طاری رہی تو وہ قضا لائے گا اور جس پر پانچ نمازوں سے زیادہ ہو، وہ قضا نہیں لائے گا۔صحیح قول کے مطابق پاگل پن بے ہوشی کی طرح ہے۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلوۃ، مطلب فیما یصیر الکافر به مسلما من الأفعال: ۲/ ۱۱

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوۃ، الباب الرابع عشر في صلوۃ المریض: ۱/ ۱۳۷

(۳) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوۃ، الباب الرابع عشر في صلوۃ المریض: ۱/ ۱۳۷

شدید مرض کی حالت میں نماز کا حکم

سوال نمبر(109):

میرے والد صاحب نماز پڑھنے پر قادر نہیں، یہاں تک کہ ارکان نماز کو بھی نہیں پہچانتا تو کیا اس سے فریضہ ساقط ہے یا فدیہ دے کر ذمہ فارغ ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نماز اہم ترین عبادت ہے، اس لیے جب بندہ اس کے پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو کسی بھی حال میں بغیر ادائیگی کے فریضہ ساقط نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، اگر بیٹھ کر پڑھنے پر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے پڑھے اور لیٹ کر اشارے پر بھی قادر نہ ہو تو اگر قضا شدہ نمازوں کی تعداد پانچ سے زیادہ ہوگئی ہو تو پھر فریضہ ساقط ہوگا اور اگر نمازیں پانچ سے کم ہوں تو فریضہ ساقط نہیں ہوگا، بلکہ اس کی قضا لانا واجب ہے۔

صورتِ مسؤلہ میں اگر واقعی یہ مریض اس قدر شدید بیمار ہو کہ اشارے سے بھی نماز نہیں پڑھ سکتا اور ارکانِ نماز کی تمیز نہیں کرسکتا تو پھر نمازیں ساقط ہوں گی اور فدیہ اس پر لازم نہیں، البتہ حالتِ قدرت میں جو نمازیں قضا ہوگئی ہیں اور ان کی قضا نہیں لائی گئی تو ان کے بدلے فدیہ دینا لازم ہوگا۔

والدلیل علی ذلک:

وإذا عجز المریض عن الإیماء بالرأس في ظاهر الروایة یسقط عنه فرض الصلوة ولا یعتبر الإیماء بالعینین والحاجبین، ثم إذا خف مرضه هل یلزمه القضاء؟ اختلفوا فیه، قال بعضهم: إن زاد عجزه علی یوم ولیلة لا یلزمه القضاء، وإن کان دون ذلك یلزمه وهو الأصح، والفتوی علیه.......وإن مات من ذلك المرض لاشيء علیه ولا یلزمه فدیة.(۱)

ترجمہ: جب کوئی مریض سر سے اشارہ کرنے سے بھی عاجز ہو جائے تو ظاہر روایت کے مطابق اس سے نماز کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ (اس صورت میں) آنکھوں اور پلکوں سے اشارہ کرنے کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ پھر (مذکورہ

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوة، الباب الرابع عشر في صلوة المریض: ۱۳۷/۱

صورت میں) جب اس کی بیماری میں کمی ہو جائے تو کیا اس پر ان نمازوں کی قضا لازم ہے؟ (جس دوران سر سے اشارہ کرنے سے بھی عاجز رہا) تو اس میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اگر اس کا عجز ایک دن رات سے زیادہ ہو تو اس پر (اس دوران کی نمازوں کی) قضا لازم نہ ہوگی اور اگر اس کا وہ عجز دن رات سے کم ہو تو اس پر (اس دوران کی نمازوں کی) قضا لازم ہوگی، جیسا کہ بے ہوش ہونے کی صورت میں حکم ہے اور یہی حکم زیادہ صحیح ہے۔

❁❁❁

طاقت نہ ہونے کی وجہ سے نماز روزہ فوت ہو جانا

سوال نمبر(110):

ایک عورت ۱۹۹۸ء سے فالج، شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ اس کے روزوں اور نمازوں کے بارے میں جو کہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے فوت ہوئی ہیں، کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ وہ خاتون اب فوت ہو چکی ہے۔

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعت کی رو سے فرائض کی ادائیگی کسی بھی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ اگر کسی شخص سے نماز یا روزہ فوت ہو جائے تو اس پر اس کی قضا لانا لازم ہے، اگر قضا نہ لائے اور اس حال میں مر جائے تو اگر اس نے وصیت کی ہو تو اس کے مال سے فدیہ ادا کیا جائے گا اور اگر وصیت نہیں کی اور ورثا نے فدیہ ادا کیا تو یہ ان کی طرف سے احسان ہوگا، تاہم اگر مریض کی حالت ایسی ہو کہ وہ کسی طرح بھی نماز پر قادر نہیں اور اسی مرض میں مر جائے، جس کی وجہ سے اس سے نمازیں قضا ہوئی ہیں تو پھر اس پر فدیہ لازم نہیں ہے۔

صورتِ مذکورہ کے مطابق ۱۹۹۸ء سے لے کر فوت ہونے تک جتنی نمازیں اور روزے اس عورت سے رہ گئے ہوں، اگر اس عرصہ میں وہ ان نمازوں اور روزوں پر قادر ہو چکی ہو تو اس کی بقدر فدیہ دینا ضروری ہے اور ان سب کو جمع کر کے ہر نماز اور ہر روزے کے بدلہ صدقہ فطر کی مقدار کے برابر فدیہ دے دیں۔ صدقہ فطر کی تفصیل یہ ہے کہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت دینا ضروری ہے۔ بشرطیکہ میت نے اس کی وصیت کی ہو۔ تاہم وصیت نہ ہونے کی صورت میں ان نمازوں کے فدیہ کی ادائیگی ورثا کی طرف سے میت کے ساتھ ایک احسان سمجھا جائے گا۔ یہ یاد رہے کہ وتر مستقل نماز گنی جائے گی۔ گویا دن رات کی چھ نمازیں شمار کی جائیں گی۔ اور اگر یہ خاتون اس مرض کی حالت میں کسی طرح بھی

نماز نہ پڑھ سکتی تھی اور پھر اسی مرض میں وفات پاچکی ہو تو اس پر فدیہ لازم نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

إذا مات الرجل وعليه صلوات فائتة،فأوصىٰ بأن تعطي كفارة صلواته يعطي لكل صلوة نصف صاع من بر،وللوتر نصف صاع،ولصوم يوم نصف صاع من ثلث ماله......وإن لم يوص لورثته،وتبرع بعض الورثة يجوز.(١)

ترجمہ:

کوئی شخص فوت ہوگیا اور اس کے ذمے کئی فوت شدہ نمازیں تھیں،اگر اس نے وصیت کی ہو کہ اس کی نمازوں کا کفارہ دیا جائے تو (اس صورت میں) ہر فرض نماز اور وتر اور ہر روزہ کے لیے ایک تہائی ترکہ سے نصف صاع گیہوں کا دیا جائے گا۔۔۔۔اور اگر اس نے اپنے وارثوں کو (فوت شدہ نمازوں کا کفارہ ادا کرنے کی) وصیت نہیں کی اور وارثوں میں سے بعض نے احسان کردیا تو جائز ہوگا۔

وإن مات من ذلك المرض لاشيء عليه،ولايلزمه فدية،كذافي المحيط.(٢)

ترجمہ: اور اگر (کوئی مریض) اسی مرض کی وجہ سے مرجائے (جس کی وجہ سے اس سے نمازیں فوت ہوئی ہیں) تو اس پر کوئی چیز (یعنی قضا) لازم نہیں اور نہ ہی فدیہ لازم ہے۔



شیخ فانی کا حالتِ مرض کی نمازوں کا حکم

سوال نمبر(111):

ایک شخص بسترِ مرگ پر پڑا ہے،اُٹھنے بیٹھنے سے قاصر ہے،حتیٰ کہ ہوش وحواس سے بے خبر اور پہچان سے قاصر ہے۔قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی قضا نمازوں کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

---

(١)الفتاوی الهندية،كتاب الصلوة،الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت،مسائل متفرقة:١/١٢٥

(٢)الفتاوی الهندية،كتاب الصلوة،الباب الرابع عشرفي صلوة المريض:١/١٣٧

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں نماز اہم ترین عبادت ہے۔ انسان کسی حال میں بھی بغیر ادائیگی کے اس فریضہ سے سبکدوش نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اشارے سے بھی نماز کی ادائیگی پر قادر ہو تو وہ اشارے سے نماز پڑھے گا اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو اور پانچ نمازوں سے زیادہ نمازیں قضا ہوگئیں تو اس کے ذمہ قضا لازم نہیں ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مریض کی واقعی یہ کیفیت ہو کہ ہوش وحواس سے بے خبر اور پہچان سے قاصر ہو تو ایسا شخص غیر مکلف متصور ہوگا اور اس دوران جتنی نمازیں قضا ہوں، ان کا فدیہ دینا اس پر لازم نہیں۔

والدلیل علیٰ ذلک:

وإذا عجز المريض عن الإيماء بالرأس في ظاهر الرواية يسقط عنه فرض الصلوة، ولا يعتبر الإيماء بالعينين والحاجبين، ثم إذا خف مرضه هل يلزمه القضاء ؟ اختلفوا فيه قال بعضهم: إن زاد عجزه على يوم وليلة لا يلزمه القضاء وإن كان دون ذلك يلزمه كما في الإغماء، وهو الأصح، وعليه الفتوى.(۱)

ترجمہ:

جب کوئی مریض سر سے اشارہ کرنے سے بھی عاجز ہوجائے تو ظاہر روایت کے مطابق اس سے نماز کی فرضیت ساقط ہوجاتی ہے۔ (اس صورت میں) آنکھوں اور پلکوں سے اشارہ کرنے کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ پھر (مذکورہ صورت میں) جب اس کی بیماری میں کمی ہوجائے تو کیا اس پر ان نمازوں کی قضا لازم ہے؟ (جس دوران سر سے اشارہ کرنے سے بھی عاجز رہا) تو اس میں اختلاف ہے: بعض کا قول یہ ہے کہ اگر اس کا عجز ایک دن رات سے زیادہ ہو تو اس پر (اس دوران کی نمازوں کی) قضا لازم نہ ہوگی اور اگر اس کا وہ عجز دن رات سے کم ہو تو اس پر (اس دوران کی نمازوں کی) قضا لازم ہوگی، جیسا کہ بے ہوش ہونے کی صورت میں حکم ہے اور یہی حکم زیادہ صحیح ہے۔



(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الرابع عشر في صلوة المريض: ۱/۱۳۷

مریض فدیہ کب ادا کرے؟

سوال نمبر(112):

ایک شخص گردے کے آپریشن کی وجہ سے رمضان کے روزے رکھنے سے قاصر ہو تو ان روزوں کا فدیہ کس وقت دے گا۔رمضان کے اوّل میں یا آخر میں؟اور یہ گندم کے حساب سے کتنا بنتا ہے اور پیسوں کے حساب سے کتنا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

رمضان میں بیماری کی وجہ سے کسی مریض کو جب ایک بار افطاری کی رخصت مل جائے تو روزوں کا فدیہ ادا کرنے میں وہ مختار ہے،چاہے رمضان کے اوّل میں ادا کرے یا آخر میں ہر طرح سے درست ہے،تاہم فدیہ ادا کرنے کے بعد اگر مریض صحت یاب ہو جائے تو بقدر ایامِ صحت اس کا فدیہ باطل ہو جاتا ہے،اس لیے اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہوگی۔

ایک روزے کا فدیہ گندم کے اعتبار سے نصف صاع ہے۔نصف صاع کی مقدار مروجہ پیمانہ کے اعتبار سے پونے دو سیر بنتی ہے،لہٰذا فدیہ اگر گندم کی صورت میں ہو تو ایک روزے کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی مروجہ قیمت کسی مستحق فدیہ کو دیا جائے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ثم إن شاء أعطی الفدیة في أوّل رمضان بمرّة،وإن شاء أخّرھا إلی آخرہ، کذافي النھر الفائق.ولو قدر علی الصیام بعد مافدی بطل حکم الفداء الذي فداہ،حتی یجب علیه الصوم،ھکذا في النھایة.(۱)

ترجمہ:

پھر(روزہ نہ رکھنے کی صورت میں)اس کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو اوّل رمضان المبارک میں یکبارگی فدیہ ایک ہی بار دے دے اور چاہے تو رمضان المبارک کے آخر تک فدیہ کی ادائیگی میں تاخیر کردے۔اگر کوئی معذور فدیہ دینے کے بعد روزہ رکھنے پر قادر ہو گیا تو جو فدیہ وہ دے چکا،اس کا حکم باطل ہو جائے گا حتی کہ اس پر روزے رکھنا واجب ہوگا۔

---

(۱)الفتاوی الھندیة،کتاب الصوم،الباب الخامس في الأعذار اللتي تبیح الإفطار:۱/۲۰۷

باب قضاء الفوائت وإدراك الفريضة

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اسلام میں نماز کی جو اہمیت اور قرآن وحدیث میں جس اہتمام اور تاکید وتکرار کے ساتھ نماز کا حکم دیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات بعید ہے کہ کوئی مسلمان قصداً نماز چھوڑ دے، اس لیے حدیث میں کہیں بھی نماز چھوڑنے (قصداً ترک کرنے) کی حوصلہ افزائی نہیں پائی جاتی، بلکہ بھول جانے یا نیند کی وجہ سے نماز چھوٹ جانے کا ذکر ملتا ہے کہ یہی مؤمن کے شایانِ شان ہے۔اسی لیے فقہائے کرام نے بھی عام طور پر''قضاء المتروکات ''(قصداً چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا) کی بجائے''قضاء الفوائت ''یعنی چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا عنوان اختیار کیا ہے۔تو جب بلا تفریط وکوتاہی نماز کے فوت ہوجانے پر قضا کی صورت میں کفارہ واجب قرار دیا گیا ہے تو ایسی صورت میں کہ انسان بالارادہ نماز نہ پڑھے، بہ درجہ اولیٰ اس پر قضا واجب ہونی چاہیے۔اسی طرح انسانی فطرت اور عقلِ سلیم بھی اس بات کا مقتضی ہے کہ نماز جیسی اہم اور بنیادی عبادت کے چھوٹ جانے کے بعد کسی بھی درجے میں اس کو دوبارہ پالینے کے لیے ذریعہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے بندہ اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں تاخیر کے ساتھ ہی سہی لیکن اپنی حاضری کو یقینی بنا سکے، یہی ذریعہ قضا کہلاتا ہے۔(۱)

قضاء الفوائت کا معنی:

قضا کا لغوی معنی ہے فیصلہ کرنا اور ادا کرنا، جب کہ اصطلاح میں:

"تسليم مثل الواجب بعد وقته".

وقت گزر جانے کے بعد واجب یا فرض کے بدلے اس کی مثل کی سپردگی اور انجام دہی کا نام قضا ہے۔

فوائت جمع ہے فائتة کی۔فائتة ہر اس کام کو کہتے ہیں جو اپنے مخصوص وقت میں ادا نہ ہوسکے اور وہ وقت یوں ہی گزر جائے۔''قضاء الفوائت'' کا مجموعی معنی''علامہ الدردیر''نے یوں ذکر کیا ہے:

"استدراك ما خرج وقته"

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب قضاء الفوائت:۲/۵۱۸

جس چیز کا وقت گزر جائے اس کو پالینے کی سعی اور کوشش قضا کہلاتی ہے۔(۱)

ادا، قضا اور اعادہ کی اصطلاحات اور ان کے مابین فرق:

(۱) ادا............: کسی واجب یا فرض کو اپنے مخصوص وقت میں واجب شدہ طریقے سے انجام دینا ادا کہلاتا ہے۔''الاداء فعل الواجب فی وقتہ''۔

(۲) قضا............: وقت گزر جانے کے بعد واجب یا فرض کے بدلے اس کی مثل کی انجام دہی کو قضا کہتے ہیں۔

(۳) اعادہ............: کسی واجب یا فرض کو اس کے مخصوص وقت میں ایک مرتبہ کسی خلل اور نقص کے ساتھ ادا کرنے کے بعد دوبارہ صحیح طریقے سے ادا کرنے کا نام ہے۔ خلل سے مراد کراہت تحریمی ہے، لہٰذا نماز کے دوران کسی بھی مکروہ تحریمی کے ارتکاب پر اس نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے، تاہم بعض علمائے کرام کے ہاں اعادے کا وجوب اسی وقت کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ وقت گزر جانے کے بعد اعادہ کرنا واجب نہیں رہتا، بلکہ مستحب بن جاتا ہے، جبکہ علامہ شامیؒ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اعادہ وقت کے بعد بھی واجب ہوتا ہے اور یہی راجح قول ہے۔(۲)

قضا کی مشروعیت:

قضا کی مشروعیت نبی کریم ﷺ کے قول و فعل ہر ایک سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''من نسي صلوة فليصلها إذا ذكرها''.

جو شخص کسی نماز کو بھول جائے تو یاد آنے کے بعد اس کو پڑھ لے۔

اسی طرح غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے ساتھ جنگ میں مشغولیت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں رہ گئی تھیں جن کو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر باجماعت ادا فرمایا۔(۳)

قضا کا حکم:

فقہائے کرام کے ہاں وہ عبادات جو کسی خاص وقت کے ساتھ مؤقت ہوتی ہیں، ادائیگی کے بغیر وقت نکل

(۱) الموسوعة الفقهية، مادة قضاء الفوائت: ۲٤/۳٤، الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب قضاء الفوائت، مطلب في أنّ الامر......وفي تعريف الأداء والقضاء: ۵۱۹/۲

(۲) الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب قضاء الفوائت: ۵۱۹/۲ـ۵۲۳، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب قضاء الفوائت، ص: ۳۵۸. (۳) سنن النسائي، كتاب الصلوة، باب من نام عن صلوة أونسيها: ۷۱/۱، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب قضاء الفوائت، ص: ۳۵۸، ۳۵۹

جانے کے بعد بھی مکلف کے ذمہ باقی رہتی ہیں، لہٰذا حنفیہ کے ہاں فرائض کی قضا فرض ہوتی ہے، واجب کی قضا واجب اور سنت کی قضا سنت، اس لیے کہ قضا اسی صفت کے ساتھ ہوتی ہے، جس صفت کے ساتھ وہ فوت ہوتی ہے۔

"ان الفائتة تقضى على الصفة التي فاتت عنه".(۱)

قضا کن لوگوں پر واجب ہے اور کن پر نہیں؟

حنفیہ کے ہاں قضا کے وجوب میں سونے والا، جاگنے والا، بھول جانے والا، خطا کار اور اپنے قصد وارادے سے بلا عذر چھوڑنے والا سب برابر ہیں، چاہے فوت شدہ نمازیں کم ہوں یا زیادہ، قضا بہر صورت واجب ہوگی۔ قضا لانے کے بعد حنفیہ کے ہاں آدمی بری الذمہ ہو جاتا ہے البتہ نماز میں بلا عذر اتنی تاخیر کرنا جس کی وجہ سے نماز فوت ہو جائے، گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا اس کے لیے الگ توبہ کرنا واجب ہے۔(۲)

حیض ونفاس کے دوران فوت شدہ نمازوں کی قضا بالاتفاق واجب نہیں۔ جنون اور بے ہوشی اگر پانچ نمازوں کی مقدار سے زیادہ ہو جائے اور درمیان میں افاقہ نہ ہو تو ان پر قضا واجب نہیں تاہم اگر جنون اور بے ہوشی کی مدت پانچ نمازوں سے کم ہو یا درمیان میں وقفہ وقفہ سے صحت یابی مل رہی ہو تو صحت مل جانے کے بعد اس کی قضا واجب ہوگی۔

جس شخص کی عقل شراب، بھنگ، ہیروئن یا دوسری حرام چیزوں سے زائل ہو جائے، اس پر بہر صورت قضا واجب ہوگی چاہے فوت شدہ نمازیں پانچ سے کم ہوں یا زیادہ ہوں۔ وہ مریض جو اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہو، اگر اس کی فوت شدہ نمازیں پانچ سے زیادہ ہو جائیں تو اس پر قضا نہیں۔ یہی حکم اس شخص کا بھی ہے جس کی عقل کسی مباح چیز سے زائل ہوگئی ہو۔ مرتد شخص پر حالتِ ارتداد کی نمازوں کی قضا نہیں، اسی طرح وہ شخص جو دار الحرب میں اسلام لائے اور نماز کے وجوب کا علم اس کو نہ ہو تو اس پر بھی قضا نہیں۔ اگر کوئی بچہ عشا کی نماز پڑھ کر سو جائے اور اس کو فجر کی نماز سے پہلے احتلام ہو جائے تو اس پر اس نماز کی قضا واجب ہوگی۔(۳)

سفر وحضر میں فوت شدہ نمازوں کی قضا کا حکم:

حنفیہ کا قاعدہ یہ ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا اسی صفت کے ساتھ ہوتی ہے جس صفت کے ساتھ وہ فوت

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ۱/۱۲۱، الدرالمختار، باب قضاء الفوائت: ۲/۵۲۴

(۲) الفتاوى الهندية حواله بالا، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، باب قضاء الفوائت، ص: ۳۵۸، الدرالمختار، باب قضاء الفوائت: ۲/۵۱۸

(۳) الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب صلوة المريض: ۲/۵۷۳، ۵۷۴، الفتاوىٰ الهندية حواله سابقه

ہوتی ہیں، لہٰذا مسافر شخص اگر دورانِ سفر ان نمازوں کی قضا لانا چاہے جو اس سے حالتِ حضر میں فوت ہوئی ہیں تو وہ چار رکعت والی نماز کو چار ہی رکعت پڑھے گا اور مقیم شخص اگر دورانِ اقامت ان نمازوں کی قضا لانا چاہے جو اس سے سفر کے دوران چھوٹ گئی ہیں تو وہ رباعی نمازوں میں قصر کرتے ہوئے دو رکعت پڑھے گا۔

قضا شدہ نمازوں میں سری و جہری قراءت کا حکم:

مذکورہ قاعدے کے موافق قضا نمازوں کی قراءت میں اصل نماز اور اصل وقت کا اعتبار کیا جائے گا، لہٰذا اگر کوئی شخص ان نمازوں کی قضا لانا چاہے جن میں قراءت جہر کے ساتھ ہوتی ہے تو اس صورت میں اگر قضا با جماعت ہو تو جہر واجب ہے اور اکیلے پڑھ رہا ہو تو جہر اور سرّ دونوں میں اختیار ہے، اور اگر نماز سری ہے تو امام و منفرد ہر ایک پر سرّ، یعنی خفیہ تلاوت واجب ہے اگرچہ قضا لانے کا وقت جہر کا ہو۔(۱)

فوت شدہ نمازوں میں ترتیب کا حکم:

حنفیہ کے ہاں اگر زندگی بھر میں فوت شدہ نمازوں کی تعداد چھ سے کم ہو تو ان فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی کے وقت ان کے درمیان ترتیب کی رعایت واجب ہوگی۔ اسی طرح فوت شدہ نمازوں اور وقتی نمازوں کے مابین بھی ترتیب واجب ہے، لہٰذا جس شخص کی قضا نمازیں چھ سے کم ہوں تو وہ صاحبِ ترتیب کہلاتا ہے، ایسے شخص کے لیے وقتی نماز ادا کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ قضا شدہ نمازیں ترتیب کے ساتھ نہ پڑھ لے۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں وتر بھی فرائض کے حکم میں ہے، لہٰذا اگر کسی صاحبِ ترتیب شخص نے وتر نہیں پڑھی ہو تو اس کے لیے امام صاحب کے ہاں فجر کی نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ ترتیب کا وجوب رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل ہر ایک سے ثابت ہے، جس کی تفصیل مراقی الفلاح اور حاشیۃ الطحطاوي میں دیکھی جا سکتی ہے۔(۲)

ترتیب کن صورتوں میں واجب نہیں رہتی؟

حنفیہ کے ہاں درج ذیل صورتوں میں فوت شدہ نمازوں کا اپنے مابین اور فرائض کے ساتھ، ہر دو صورتوں میں ترتیب واجب نہیں۔

---

(۱) الفتاوی الهندية ، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ۱/ ۱۲۱

(۲) الفتاوی الهندية حواله بالا، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب قضاء الفوائت، ص: ۳۵۸

(۱) وقت کی تنگی:

وقت کی تنگی کی وجہ سے قضا نمازوں میں ترتیب کا وجوب ختم ہو جاتا ہے۔ وقت سے مراد امام محمدؒ کے ہاں مستحب وقت ہے، جب کہ شیخینؒ کے ہاں اصل وقت مراد ہے، جس میں فی الجملہ نماز جائز ہو۔ علامہ شرنبلالیؒ نے مختلف فقہاے کرام کے اقوال سے امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے، لہٰذا اگر کسی کے ذمہ فجر اور ظہر کی نماز باقی تھی، لیکن عصر کا وقت اتنا تنگ رہ گیا کہ ان نمازوں کے ادا کرنے میں عصر کا وقت نکل جائے گا تو اب عصر کی نماز ادا کرنی چاہیے۔

اگر وقت اتنا ہو کہ فجر اور ظہر دونوں کی ادائیگی تو ممکن نہ ہو، لیکن صرف فجر کی نماز ادا کی جا سکتی ہو تو اصح قول کے مطابق ترتیب واجب نہیں۔

(۲) نسیان، جہل اور ظنِ غالب:

اگر کسی صاحبِ ترتیب شخص کو فوت شدہ نمازیں یاد نہ رہیں اور اس نے وقتی نماز پڑھ لی تو یہ نماز درست ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے ایک قول اور ائمہ بلخ کے مذہب کے مطابق جس شخص کو ترتیب کے وجوب کا علم نہ ہو تو اس کا حکم بھی ناسی، یعنی بھولنے والے کی طرح ہے۔ یہی حکم اس شخص کا بھی ہے جس نے مثلاً ظہر کی نماز اس حالت میں پڑھ لی کہ اس کو وضو کی صحت کے متعلق ظنِ غالب ہو، پھر عصر کی نماز الگ وضو سے ادا کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ظہر کی نماز کا وضو درست نہیں تھا تو وہ صرف ظہر کا اعادہ کرلے، عصر کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ہے گویا عصر کی نماز پڑھتے وقت یہ شخص ظہر کی فوتگی کو بھول گیا ہو۔

اگر کسی صاحبِ ترتیب شخص کو نماز کے دوران فوت شدہ نماز یاد آ جائے تو اس کی وقتی نماز فاسد ہو جائے گی، تاہم وہ اس کو دو رکعت تک مکمل کرلے تاکہ نفل بن جائے۔

فوت شدہ نمازوں کی کثرت:

حنفیہ کے راجح قول کے مطابق اگر فوت شدہ نمازوں کی تعداد پانچ سے بڑھ کر چھ ہو جائے تو ایسی صورت میں قضا نمازوں اور وقتی نماز کے مابین اور قضا نمازوں کا اپنے مابین ترتیب ساقط ہو جائے گی، اس لیے کہ پانچ سے زیادہ نمازوں میں ترتیب کی رعایت رکھنا موجبِ حرج و مشقت ہے اور شریعت میں کوئی حرج اور تنگی نہیں۔

اسی طرح اگر کسی شخص کے ذمے پانچ یا اس سے کم نمازیں باقی ہوں اور ان کا باقی رہنا یاد بھی ہے اور وقت کی تنگی بھی نہیں، پھر بھی اس نے فریضہ وقت کو ادا کرلیا تو یہ سب نمازیں فاسد ہو جائیں گے، لیکن اگر فوت شدہ نمازوں

کو ادا کیے بغیر چھ فرض (وتر کے بغیر) نمازیں ادا کرتا گیا اور چھٹے نماز کا وقت نکل گیا تو اب اس پر ترتیب واجب نہیں رہے گی اور یہ پانچ نمازیں جو فاسد تھیں وہ بھی درست ہو جائیں گی۔(۱)

احتیاط کی بناپر قضا کا حکم:

عالمگیری نے نقل کیا ہے کہ اگر کسی شخص سے عمر بھر کوئی نماز فوت نہ ہوئی ہو، لیکن اس کو اپنی نمازوں میں کمی کوتاہی کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں وہ مکروہ اوقات اور فجر وعصر کے بعد والے اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات میں ایسی نمازوں کی قضا کر سکتا ہے، تاہم وتر کی قضا لاتے وقت تیسری رکعت پر تشہد کے بقدر بیٹھ کر چوتھی رکعت بھی ملا لے تاکہ اگر وتر کی نماز صحیح نکلے تو یہ نفل بن جائے گی۔(۲)

سنن ونوافل کی قضا:

حنفیہ کے ہاں سنن میں صرف فجر کی سنتوں کی قضا کی جاسکتی ہے، وہ بھی اس صورت میں جب اس کے ساتھ فرض نماز بھی فوت ہو جائے۔ نوافل کی قضا اس صورت میں لازم ہے، جب شروع کرنے کے بعد کسی وجہ سے فاسد ہو گئے ہوں۔ تفصیل باب السنن والنوافل میں موجود ہے۔

قضا نمازوں کے لیے اذان واقامت اور جماعت کا حکم:

فرض نمازوں کے لیے اذان اور اقامت مستقل سنت ہے، چاہے ادا ہوں یا قضا اور چاہے ان نمازوں کی جماعت ہو رہی ہو یا ان کی ادائیگی بلا جماعت تنہا ہو رہی ہو۔ قضا نمازیں اگر زیادہ ہوں تو باجماعت پڑھنے کی صورت میں ہر ایک کے لیے الگ الگ اذان اور اقامت سنت ہے، البتہ اگر ایک ہی مجلس میں متعدد نمازوں کی قضا ہو رہی ہو تو یہ اختیار موجود ہے کہ اذان تو ایک ہی دی جائے، البتہ اقامت الگ الگ کی جائے۔(۳)

---

(۱) مراقي الفلاح مع الطحطاوي، كتاب الصلوة، باب قضاء الفوائت، ص:۳۵۹-۳۶۱، البناية على الهداية، كتاب الصلوة، باب قضاء الفوائت:۲/۷۰۵، ۷۰۶، ۷۱۸، ۷۱۹، الفتاوى الهندية، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت:۱/۱۲۲، ۱۲۳

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، مسائل متفرقه:۱/۱۲۴، ۱۲۵

(۳) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول:۱/۵۵، بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في بيان محل وجوب الاذان:۱/۶۵۰، ۶۵۱

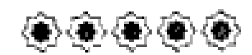
قضا نمازوں کے لیے وقت:

قضا نمازوں کی ادائیگی کے لیے کوئی مخصوص وقت مقرر نہیں، بلکہ طلوعِ شمس، زوالِ شمس اور غروبِ شمس کے تین مکروہ اوقات کو چھوڑ کر ان کو کسی بھی وقت ادا کیا جاسکتا ہے، تاہم اگر کوئی اہم مصروفیت اور اہل وعیال کے لیے کمائی کرنے کا لازمی شغل نہ ہو تو قضا لانے میں جلدی سے کام لینا زیادہ بہتر ہے۔(۱)

فوت شدہ نمازوں کا فدیہ:

اگر کسی شخص سے بحالتِ صحت یا بحالتِ مرض نمازیں فوت ہوگئی ہوں اور بعد میں اس کو اتنا وقت مل گیا ہو جس میں ان فوت شدہ نمازوں کی قضا (اگرچہ اشارہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) ممکن ہو تو جتنی نمازوں کی ادائیگی کے بقدر وقت مل گیا ہو ان تمام نمازوں کے بدلے اگر مرتے وقت فدیہ کی وصیت کی گئی ہو تو ولی کے ذمے میت کے ثلث مال میں سے یہ فدیہ ادا کرنا واجب ہوگا، تاہم اگر مریض کو اتنی صحت بھی نہ ملی ہو جس میں وہ کم از کم اشارے کے ساتھ فوت شدہ نمازیں پڑھ لے تو ان نمازوں کے بدلے فدیہ کی وصیت لازمی نہیں۔

فدیہ کی مقدار گندم کے جنس سے ہر فرض اور واجب (وتر) نماز کے بدلے نصف صاع (پونے دو سیر) ہے جو کہ آٹے یا قیمت کی شکل میں بھی دی جاسکتی ہے۔ کھجور اور کشمش کی جنس سے فدیہ کی مقدار ایک نماز کے بدلے ایک صاع ہے۔ فدیہ میت کے ثلث مال میں سے دیا جائے گا، البتہ اگر اولیا اپنی مرضی سے خود اضافہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔(۲)



(۱) مراقي الفلاح مع الطحطاوي، كتاب الصلوة،باب قضاء الفوائت،ص:۳۵۸، كتاب الصلوة،الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت:۱/۱۲۱

(۲) الدرالمختارمع ردالمحتار، كتاب الصلوة،مطلب في إسقاط الصلوة عن الميت:۲/۵۳۳،۵۳۴

باب قضاء الفوائت

(فوت شدہ نمازوں کی قضا کا بیان)

صاحبِ ترتیب سے چھ نمازوں کا چھوٹنا

سوال نمبر(113):

ایک صاحب ترتیب کی نمازِ فجر فوت ہوگئی، پھر ظہر،عصر،مغرب اور عشا کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لی۔ اگر اگلی فجر کی نماز پڑھنے سے پہلے پہلے فوت شدہ نماز کی قضا لائے تو باقی پڑھی گئی نمازوں کا کیا حکم ہے؟ اگر فجر کی نماز بھی پڑھ لی تو پھر پڑھی گئی نمازوں اور ترتیب کا کیا حکم ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

صاحبِ ترتیب وہ شخص کہلاتا ہے،جس کے ذمہ شب وروز کی نمازیں باقی نہ ہوں۔ پھر کسی شخص کے ذمہ اگر چھ نمازیں جمع ہوجائیں تو اس کی ترتیب ساقط ہوجاتی ہے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر دوسرے دن فجر کی نماز سے پہلے، پہلے دن کی فجر کی نماز کی قضا لائے تو صاحب ترتیب ہونے کی وجہ سے ظہر،عصر،مغرب اور عشا کی پڑھی گئی نمازیں فاسد ہوجائیں گے۔اب ترتیب کے ساتھ ظہر،عصر پھر مغرب اوراسی طرح عشا کی نماز پڑھے گا،لیکن واضح رہے کہ اگر دوسرے دن فجر کی نماز بھی پڑھ لی تو اب یہ شخص صاحب ترتیب نہیں رہا،اس لیے پہلے دن فجر کے بعد پڑھی گئی نمازیں درست ہوجائیں گی اور اب صرف پہلے دن کی فجر کی نماز کی قضا لائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویسقط الترتیب عند کثرۃ الفوائت وھو الصحیح......وحدا لکثرۃ أن تصیر الفوائت ستا بخروج وقت الصلوۃ السادسۃ.(۱)

---

(۱)الفتاوی الھندیۃ،کتاب الصلوۃ،الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت:۱/۱۲۳

ترجمہ:

فوت شدہ نمازوں کی تعداد بڑھ جانے سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے اور یہ صحیح قول ہے۔۔۔۔اور کثرت کی حد یہ ہے کہ فوت شدہ نمازیں چھ ہو جائیں، جب چھٹی نماز کا وقت گزر جائے۔

❁❁❁

عصر کے وقت میں ظہر کی نماز کی قضا

سوال نمبر(114):

ایک صاحب ترتیب شخص۔سے ظہر کی نماز قضا ہوگئی تو عصر کے وقت کون سی نماز پہلے پڑھے گا؟ کیوں کہ عصر کے بعد مکروہ وقت ہوتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر عصر کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں نمازوں کی گنجائش ہو تو پھر صاحب ترتیب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ظہر کی قضا لائے، پھر عصر کا وقتی نماز پڑھے۔اگر صرف ایک نماز پڑھنے کی گنجائش ہو تو پھر عصر کی نماز پڑھ لے،اس لیے کہ صاحب ترتیب کی ترتیب وقت کی تنگی سے ساقط ہو جاتی ہے۔اگر صاحب ترتیب نہ ہو تو پھر عصر کے بعد پڑھ سکتا ہے۔عصر کے بعد نوافل پڑھنا تو مکروہ ہے،جب کہ فوت شدہ نماز کی قضا لانے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إن أمكنه أداء الظهر والعصر قبل تغير الشمس،فعليه مراعاة الترتيب،وإن كان لايمكنه أداء الصلوتين قبل غروب الشمس،فعليه أداء العصر،وإن كان يمكنه أداء الظهر قبل تغير الشمس، وتقع العصر كلها أو بعضها بعد تغير الشمس،فعليه مراعاة الترتيب.(١)

ترجمہ:

اگر سورج کی روشنی میں تغیر سے پہلے ظہر اور عصر (دونوں) کی ادائیگی ممکن ہو تو پھر ترتیب کی رعایت ضروری ہے۔اگر سورج ڈھلنے سے پہلے دونوں نمازوں کی ادائیگی کی گنجائش نہ ہو، پھر عصر ادا کرنا ضروری ہے۔اگر ظہر کا ادا کرنا

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ١/ ١٢٣

سورج کے تغیر سے پہلے اور عصر کی پوری نماز یا کچھ حصہ سورج کے تغیر کے بعد ممکن ہو تو ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۞۞۞

عشا اور وتر کی الگ الگ قضا لانا

سوال نمبر(115):

ایک شخص کی عشا کی کئی نمازیں فوت ہوئی ہیں تو عشا کی نماز اور وتر کی نماز کی قضا الگ الگ اوقات میں لانا کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

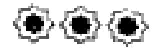
اس میں کوئی شک نہیں کہ عشا کی نماز فوت ہو جانے کی صورت میں فرض کے ساتھ ساتھ وتر کی قضا لانا بھی واجب ہے، لیکن قضا لاتے وقت دونوں میں اتصال ضروری نہیں، اس لیے کہ وتر نماز عشا کی اس طرح تابع نہیں کہ وتر کو عشا سے مؤخر کرنا جائز نہ ہو، اس لیے جس طرح ادا میں دونوں کے درمیان وصل ضروری نہیں، اسی طرح قضا میں بھی دونوں کے درمیان وصل ضروری نہیں۔ بلکہ الگ الگ قضا بھی بلا کراہت لائی جاسکتی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویجب القضاء بترکه ناسیاأوعامداوإن طالت المدة......ویستحب تأخیره إلی آخر اللیل،ولا یکره کمایکره تأخیرسنةالعشاء تبعالها.(۱)

ترجمہ:

وتر بھول کر چھوٹنے سے یا قصداً چھوڑنے کی صورت میں قضا لانا واجب ہے، اگر چہ زیادہ عرصہ گزرا ہو۔ ۔۔۔اور وتر کو رات کے آخری حصے تک مؤخر کرنا مستحب ہے اور وتر کی تاخیر مکروہ نہیں، جس طرح عشا کی سنت کی تاخیر نماز کے تابع ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔



(۱)الفتاوی الهندیة،کتاب الصلوة،الباب الثامن في صلوة الوتر:۱/۱۱۱

متعدد قضا نمازوں کے پڑھنے کا طریقہ

سوال نمبر (116):

اگر کسی شخص سے سستی اور غفلت یا کسی معقول عذر کی وجہ سے نمازیں قضا ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لانے میں ترتیب کی رعایت ضروری ہے یا نہیں؟ ان کے پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نمازیں غفلت اور سستی کی وجہ سے قضا ہوئی ہوں یا کسی معقول عذر کی وجہ سے قضا ہوگئی ہوں، فریضہ ساقط نہیں ہوتا، بلکہ قضا لانا واجب ہے۔ قضا شدہ نمازوں کی تعداد چھ یا چھ سے بڑھ جائے تو پھر ترتیب ساقط ہوجاتی ہے، لہٰذا ان کی مرتب ادائیگی ضروری نہیں، جس طرح کہ سہولت ہو، ترتیب کے ساتھ یا بلاترتیب قضا شدہ نمازوں کی تعداد کی رعایت کے ساتھ ان کی قضا لائے۔ آسان صورت یہ ہے کہ ہر نماز کے ساتھ ایک قضا شدہ نماز پڑھ لیا کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

و كثرة الفوائت كماتسقط الترتيب في الأداء تسقط في القضاء،حتىٰ لوترك صلوة شهرثم قضىٰ ثلثين فجراً،ثم ثلثين ظهرا،هكذا صح.(١)

ترجمہ:

فوت شدہ نمازوں کی کثرت جس طرح ادا نمازوں میں ترتیب ساقط کردیتی ہے، اس طرح قضا نمازوں میں بھی ترتیب ساقط کردیتی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک ماہ کی نمازیں رہ گئی ہوں، پھر تمیں (دن کی) فجر کی قضا لائے، پھر تمیں (دن کی) ظہر کی اس طرح بقیہ نمازوں کی قضا لائے تو ایسا کرنا صحیح ہے۔



(١) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت: ١٢٣/١

دورانِ جنگ فوت شدہ نمازیں

سوال نمبر(117):

ایک مجاہد میدانِ جہاد میں کفار کے ساتھ متواتر قتال کرتا ہوا شہید ہوگیا۔جنگی مصروفیات کی وجہ سے بعض نمازیں ادا کرنے کا موقع نہیں ملا تو شہید کی فوت شدہ نمازوں کے فدیہ کا کیا حکم ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی ایسے حال میں مرجائے کہ اس کے ذمہ قضا نمازیں رہ گئی ہوں تو ان کا تدارک کفارہ ادا کرنے سے ہوسکتا ہے،سوالِ مذکور میں اگر مجاہد نے کفارہ ادا کرنے کی وصیت کی ہو اور مال بھی موجود ہو تو پھر اس کے کل مال کے ثلث میں سے فدیہ دینا ورثا پر واجب ہے،اگر وصیت نہیں کی تو پھر ورثا پر فدیہ دینا واجب نہیں،بغیر وجوب کے ورثا فدیہ ادا کریں تو یہ ان کا تبرع اور احسان ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولو مات وعليه صلوات فائتة،وأوصىٰ بالكفارة يعطى لكل صلوة نصف صاع من بُرٍّ كالفطرة......وإنما يعطي(من ثلث ماله).قال ابن عابدينؒ تحت قوله : فيلزمه ذلك من الثلث إن أوصىٰ،وإلا فلا يلزم الولي ذلك.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص مرگیا اور اس کے ذمہ قضا نمازیں تھیں اور اس نے کفارہ ادا کرنے کی وصیت بھی کی تو ہر نماز کے بدلے فطرانہ کی طرح نصف صاع گندم ادا کیا جائے۔۔۔اور یہ میت کے ثلث مال میں سے دیا جائے۔

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:اگر وصیت کی ہو تو صرف ثلث مال میں لازم ہوگا اور اگر وصیت نہیں کی تو پھر وارث پر لازم نہیں(البتہ اگر ادا کردیا تو استحسانا جائز ہے)۔



(۱) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب الصلوة،باب قضاء الفوائت،مطلب في إسقاط الصلوة عن الميت:۲/۵۳۲

پانچ سال کی قضا نمازوں کا کفارہ

سوال نمبر(118):

ایک آدمی فوت ہوگیا اور اس کے ذمہ پانچ سالوں کی نمازوں کی قضا ہے۔اب ان نمازوں کا کفارہ ورثا پر لازم ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی ،سفر ہو،حضر ہو،تندرستی ہو،بیماری ہو،یہاں تک کہ انتہائی بیماری کے وقت اشارے سے پڑھنے کا بھی مکلف ہے اور کسی بھی حال میں ساقط نہیں ہوتی ،اس لیے اگر کسی کی فرض نماز کسی وجہ سے رہ جائے تو قضا پڑھنا فرض ہے۔اگر کسی وجہ سے پڑھ نہ سکا اور اس حال میں مرگیا تو اگر اس کا مال موجود ہو اور اس نے وصیت بھی کی ہو تو ورثا پر اس کے ثلث مال میں فدیہ (فی نماز صدقۃ فطر کی مقدار کے برابر) دینا واجب ہے۔نمازوں کی تعداد سینکڑوں میں ہو یا ہزاروں میں حکم سب کا ایک ہے۔اگر وصیت نہ کی ہو تو پھر ورثا پر اس کی طرف سے نمازوں کا فدیہ دینا لازم نہیں ،البتہ اگر تبرع اور احسان کے طور پر دینا چاہتے ہوں تو دے سکتے ہیں۔پانچ سالوں کا کفارہ روزانہ چھ نمازوں کے حساب سے ادا کیا جائے گا،اس لیے کہ وتر بھی ایک مستقل نماز ہے،جس کا حساب پانچ نمازوں کے علاوہ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولومات وعلیہ صلوات فائتۃ وأوصیٰ بالکفارۃ،یعطی لکل صلوۃ نصف صاع من برّ کالفطرۃ......وإنمایعطی(من ثلث مالہ).قال ابن عابدینؒ تحت قولہ : فیلزمہ ذلک من الثلث إن أوصیٰ،وإلا فلا یلزم الولي ذلک.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص مرگیا اور اس کے ذمہ قضا نمازیں تھیں اور اس نے کفارہ ادا کرنے کی وصیت بھی کی تو ہر نماز کے بدلے فطرانہ کی طرح نصف صاع گندم ادا کیا جائے۔۔۔۔اور یہ میت کے ثلث مال میں سے دیا جائے۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر وصیت کی ہو تو صرف ثلث مال میں لازم ہوگا اور اگر وصیت نہیں کی تو پھر وارث پر لازم نہیں۔

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب قضاء الفوائت،مطلب في إسقاط الصلوۃ عن المیت:۲/۵۳۲

قضاعمری کی نماز

سوال نمبر(119):

ہمارے ہاں بعض لوگ ہر سال رمضان کے آخری الوداعی جمعہ کو نماز کے بعد باجماعت زندگی بھر کی فوت شدہ نمازوں کی قضا لانے کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھتے ہیں، جس میں امام باقاعدہ بلند آواز سے قرأت بھی پڑھتا ہے۔ شرعی لحاظ سے قضاعمری کی اس مروجہ صورت کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فرض نماز قضا ہو جائے تو اس کی قضا واجب ہے، ورنہ ذمہ فارغ نہیں ہوگا، چاہے نماز قصداً قضا کی ہو یا بھول کر، ہر حال میں اس کی قضا لانا ضروری ہے، جس میں قضا نمازوں کی تعداد یقیناً یا اپنے اندازے سے پوری کرنی ہوگی۔ جہاں تک قضاعمری کا مروجہ طریقہ ہے کہ رمضان کے آخری جمعہ میں دو رکعتوں سے پوری عمر کی نمازوں کی قضا کی نیت کی جائے، اس کا ثبوت احادیث میں نہیں ملتا اور نہ ہی کتبِ فقہیہ میں اس کی کوئی تصریح موجود ہے، اور یہ خود ساختہ مروجہ طریقہ شرعی اصول سے متصادم ہے، اس لیے اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ قضاعمری کے اس مروجہ طریقہ پر عمل سے قضا نمازیں بدستور ذمہ پر باقی رہیں گی، جن حضرات نے اس طریقہ سے قضا نمازیں پڑھی ہیں، ان پر لازم ہے کہ قضا نمازوں کو ان کی تعداد کے مطابق دوبارہ پڑھیں، اگر صحیح تعداد معلوم ہے، ورنہ اپنے اندازے کے مطابق قضا نمازیں ادا کریں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

كل صلوة فاتت عن الوقت بعد وجوبها فيه يلزمه قضاءها،سواء ترك عمدا أو سهواً أو بسبب نوم،وسواء كانت الفوائت كثيرة أو قليلة.(۱)

ترجمہ:

ہر نماز جو ذمہ پر واجب ہو جانے کے بعد اپنے وقت سے فوت ہو جائے تو اس کی قضا لازم ہے، خواہ قصداً چھوڑی جائے یا بھول کر چھوٹ گئی یا سونے کی وجہ سے فوت ہو اور خواہ فوت شدہ نمازیں کم ہوں یا زیادہ ہوں۔

❁❁❁

(۱)الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة،الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت:۱/۱۲۱

فجر کی سنتوں کی قضا

سوال نمبر(120):

اگر کسی عذر کی وجہ سے فجر کی سنتیں رہ جائیں اور فرض نماز پڑھ لے یا پوری نماز رہ جائے تو سنتوں کی قضا لائے گا یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوع آفتاب تک فجر کی سنتیں یا کوئی نفلی نماز پڑھنا جائز نہیں۔ طلوع آفتاب کے بعد سنتیں پڑھ سکتا ہے، فجر کی نماز فوت ہونے کی صورت میں اگر اسی دن قضا لاتا ہے، جس دن نمازِ فجر فوت ہوئی ہے تو پھر زوال سے پہلے فرض کے ساتھ سنتیں بھی پڑھ سکتا ہے، ورنہ صرف فرض نماز کی قضا لائے۔ قاعدہ یہ ہے کہ قضا صرف فرض یا واجب کے ساتھ خاص ہے۔ جہاں فقہائے کرام نے فجر کی سنتوں کی قضا کو جائز قرار دیا ہے تو وہ فجر کی سنتوں کی تاکید کی وجہ سے ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(ولا يقضيها إلا بطريق التبعية) أي لا يقضي سنة الفجر إلا إذا فاتت مع الفجر،فيقضيها تبعا لقضائه لو قبل الزوال،وأما إذا فاتت وحدها فلا تقضىٰ قبل طلوع الشمس بالإجماع،لكراهة النفل بعد الصبح.وأما بعد طلوع الشمس فكذلك عندهما.وقال محمد:أحب إلي أن يقضيها إلى الزوال كما في الدرر.(۱)

ترجمہ:

فجر کی سنتوں کی قضا صرف فرض کے ساتھ تبعاً لائے گا، یعنی فجر کی سنتوں کی قضا تب لائی جائے گی، جب فرض کے ساتھ فوت ہوجائیں تو فرض کی قضا کے ساتھ تبعاً ان کی قضا لائے گا یہ تب ہے جب قضا لانا زوال سے پہلے ہو، لیکن اگر صرف سنتیں فوت ہوئی ہوں تو بالاجماع طلوعِ شمس سے پہلے پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ فجر کی نماز کے بعد نفل مکروہ ہے اور سورج طلوع ہونے کے بعد بھی شیخین کے نزدیک حکم اسی طرح ہے، لیکن امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ’’مجھے یہ پسند ہے کہ زوال سے پہلے قضا لائی جائے‘‘۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوٰۃ، باب إدراك الفريضة، مطلب: هل الإساءة دون الكراهة أو أفحش: ۲/ ۵۱۲

سنتوں کی قضا

سوال نمبر(121):

ہماری مسجد کے پیش امام صاحب نے اعلان کیا کہ'' ظہر،عصر،مغرب اور عشا کی نمازیں جن لوگوں نے میری اقتدا میں پڑھی ہیں،وہ حضرات یہ نمازیں لوٹائیں''تو کیا فرض کے ساتھ سنتوں کی قضا لانا بھی ضروری ہوگا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس نماز کا دوبارہ پڑھنا کسی شرعی نقصان کی وجہ سے واجب ہو تو اس نماز کے فرائض کا اعادہ ضروری ہوگا، سنتوں کا اعادہ ضروری نہیں،اس لیے کہ فجر کی سنتوں کے علاوہ باقی نمازوں کی سنتیں قضا لانے میں فرائض کے تابع نہیں اور سنتوں کی قضا ثابت بھی نہیں۔قضا صرف واجب اور فرض کے ساتھ خاص ہے۔

سوالِ مذکور میں سنتوں میں کوئی ایسی علت بھی نہیں پائی جاتی،جس کی وجہ سے وہ درست نہ ہوں،لہٰذا صرف فرض نمازیں لوٹانے پر ہی اکتفا کی جائے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(ولم تقض إلا تبعاً)أي لم تقض سنة الفجر إلا إذا فاتت مع الفرض فتقضي تبعاً للفرض،سواء قضاها مع الجماعة،أو وحده؛لأن الأصل في السنة أن لا تقضى،لاختصاص القضاء بالواجب.(۱)

ترجمہ:

(اور سنتوں کی قضا صرف تبعاً لائی جائے گی)یعنی فجر کی سنت کی قضا نہیں لائی جائے گی،مگر جب فرض کے ساتھ فوت ہو جائے۔چاہے فرض کی قضا باجماعت ہو یا اکیلے،اس لیے کہ سنت میں اصلاً قضا نہیں ہے،کیوں کہ قضا صرف واجب کے ساتھ خاص ہے۔



(۱)البحر الرائق،کتاب الصلوٰۃ،باب إدراك الفریضة:۲/۱۳۱

نفل کی نیت کر کے پھر قضا کی نیت کرنا

سوال نمبر(122):

پچھلے دنوں ایک تحریر نظروں سے گزری، جس میں لکھا تھا کہ اگر کوئی شخص دو رکعت نفل نماز کی نیت کر کے نماز شروع کرتا ہے، پھر نماز کے دوران دل ہی دل میں چار رکعت قضا نماز کی نیت کر کے پوری کر لیتا ہے تو نفل کے ساتھ چار رکعت قضا کی ادائیگی بھی درست ہو جائیگی۔ کیا اس طرح فرض نماز کی بنا نفل پر جائز ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

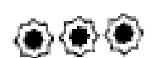
قضا فرائض میں سے ہے اور فرائض کی بنا نفل پر درست نہیں، اس لیے کہ فرض اقوئی اور نفل ادنی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ادنیٰ پر اقوئی کی بنا درست نہیں، البتہ ادنیٰ کی بنا ادنی پر یا اقوئی پر جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفل کی بنا نفل یا فرض پر جائز ہے۔ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ فرض میں تعین اور غیر فرض سے تمیز ضروری ہے، تا کہ فرض کی مستقل حیثیت برقرار رہے، اگر فرض کی بنا نفل پر جائز مان لی جائے تو فرض نماز اپنی مستقل حیثیت کھو بیٹھتی ہے، اس لیے فرض نماز کی بنا نفل پر درست نہیں اور ظاہر روایت کے مطابق فرض کی بنا فرض پر بھی درست نہیں، تا کہ ہر فرض دوسرے سے ممتاز ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(من فرائضها)التي لا تصح بدونها (التحريمة)قائما(وهي شرط)......فيجوز بناء النفل على النفل وعلى الفرض،وإن كره لافرض على فرض أونفل على الظاهر.(۱)

ترجمہ:

نماز کے ان فرائض میں سے جن کے بغیر نماز درست نہیں رہتی، کھڑے ہو کر تحریمہ باندھنا ہے اور یہ شرط ہے ۔۔۔۔ پس نفل کی بنا نفل اور فرض پر جائز ہے، اگر چہ مکروہ ہے اور ظاہر مذہب کے مطابق فرض کی بنا فرض اور نفل پر جائز نہیں۔



(۱)الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صفۃ الصلوۃ:۲/۱۲۷

نفل نماز شروع کرنے کے بعد توڑنا

سوال نمبر(123):

اگر کوئی شخص چار رکعت نفل نماز کی نیت باندھ لے، پھر کسی عذر کی وجہ سے تیسری رکعت میں نماز توڑ دے، تو اس پر قضا لازم ہے یا نہیں؟ اگر لازم ہے تو کتنی رکعتوں کی قضا کرے گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہ حنفی کی رو سے نفلی عبادات شروع کرنے سے واجب ہو جاتی ہیں۔ کسی اختیاری یا غیر اختیاری فعل کی وجہ سے نماز توڑ دے تو اس پر اس کی قضا بھی واجب ہو جاتی ہے۔ نفلی نماز میں چونکہ ہر دو رکعت مستقل نماز شمار ہوتی ہے، اس لیے پہلی دو رکعتیں تو مکمل ہو گئیں، البتہ تیسری رکعت شروع کرنے سے اس پر بعد والی دو رکعتوں کی تکمیل لازم ہو جاتی ہے، لہٰذا تیسری رکعت میں نماز توڑ دینے سے آخری دو رکعتوں کی قضا اس پر لازم ہو گی اور اگر تیسری رکعت شروع کرنے سے پہلے نماز توڑ دے تو اس پر کوئی قضا نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وإن صلى أربعا وقرأفي الأولين،وقعد ثم أفسد الأخريين قضى ركعتين)؛لأن الشفع الأول قدتم،والقيام إلى الثالثة بمنزلة التحريمة المبتدأة،فيكون ملزماهذا،إذا أفسد الأخريين بعد الشروع فيهما.(١)

ترجمہ:

اور اگر چار رکعت (نفل) نماز پڑھنا شروع کیا اور پہلی دو رکعتوں میں قراءت پڑھ کر قعدہ کر لیا، پھر بقیہ دو رکعتوں کو فاسد کر دیا تو ان کی قضا لائے گا، اس لیے کہ پہلی دو رکعت نماز تو مکمل ہو گئی ہے اور تیسری رکعت کے لیے اٹھنا نئی تحریمہ کی طرح ہے، پس اس کا پورا کرنا لازم ہو گا۔ یہ حکم تب ہے، جب آخری دو رکعتیں شروع کرنے کے بعد توڑ دی ہوں۔

❁❁❁

(١) الهداية،كتاب الصلوة،باب النوافل،فصل في القراءة:١/١٥٤،١٥٥

نماز کے آخری وقت میں حیض آنا

سوال نمبر(124):

ظہر کی نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے ایک عورت کو حیض آنا شروع ہوا، تو کیا ظہر کی نماز کی قضا اس عورت پر واجب ہوگی؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

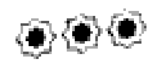
بعض مسائل میں آخر وقت کا اعتبار ہوتا ہے، مثلاً نماز کے آخری وقت میں بالغ ہونا، حیض آنا، حیض کا ختم ہونا وغیرہ، اس لیے اگر کسی عورت کو نماز کے آخری وقت میں حیض آنا شروع ہو، تو اس نماز کی فرضیت اس سے ساقط ہوجاتی ہے، لہٰذا اس پر نمازِ ظہر کی قضا لازم نہیں ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

صبي صلی العشاء، ثم نام واحتلم، وانتبه قبل طلوع الفجر يقضي العشاء، بخلاف الصبية إذا بلغت بالحيض قبل طلوع الفجر، لا يلزمها قضاء العشاء؛ لأن الحيض لو طرأ على الوجوب أسقط الوجوب، فإذا قارنه أولیٰ أن يمنع. (۱)

ترجمہ:

نابالغ بچے نے عشا کی نماز پڑھی، پھر سوگیا اور احتلام ہوگیا اور طلوعِ فجر سے پہلے جاگ گیا تو عشا کی قضا لازم آئے گی۔ اس کے برعکس اگر نابالغ بچی فجر کے طلوع ہونے سے پہلے حیض کے ساتھ بالغ ہوگئی تو عشا کی قضا اس پر لازم نہیں، کیونکہ حیض جب کسی واجب کے اوپر طاری ہوتا ہے تو اس کو ساقط کر دیتا ہے اور جب اس کے ساتھ مقارن ہو تو بطریقِ اولیٰ مانع ہوگا۔



(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت :

ترتیب ساقط ہونے کے بعد دوبارہ صاحبِ ترتیب بننا

سوال نمبر(125):

ایک صاحبِ ترتیب آدمی سے مہینہ بھر کی نمازیں فوت ہوجائیں۔ان کی ادائیگی کے دوران دو نمازیں باقی رہ گئیں تو کیا یہ شخص دوبارہ صاحبِ ترتیب بن سکتا ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فوت شدہ اور وقتی نمازوں میں ترتیب واجب ہے،لیکن یہ ترتیب وقت کی تنگی ،بھولنے اور فوت شدہ نمازوں کی کثرت سے ساقط ہوجاتی ہے اور ان کی تعداد چھ ہے۔اب دوبارہ صاحبِ ترتیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذمہ ایک نماز تک باقی نہ رہے،اس لیے اگر ایک نماز بھی اس کے ذمہ باقی ہوتو دوبارہ صاحبِ ترتیب نہیں سمجھا جائے گا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دو نمازیں جب تک اس کے ذمہ باقی ہیں تو یہ صاحبِ ترتیب نہیں بن سکتا،البتہ جب ایک نماز بھی اس کے ذمہ نہیں رہے گی،تب یہ ازسرِ نو صاحبِ ترتیب کہلائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الترتيب إذا سقط بكثرة الفوائت،ثم قضى بعض الفوائت، وبقيت الفوائت أقل من ستة الأصح أنه لايعود......وعليه الفتوى،حتى لوترك صلوة شهر،فقضا ها إلا صلوة واحدة،ثم صلى الوقتية وهو ذاكرلها جاز.(۱)

ترجمہ:

جب فوت شدہ نمازوں کی کثرت سے ترتیب ساقط ہوجائے،پھر بعض کی قضالائے اور چھ سے کم نمازیں باقی رہ جائیں تو صحیح قول کے مطابق ترتیب نہیں لوٹتی۔۔۔۔اسی پر فتویٰ ہے،یہاں تک کہ اگر اس نے پورا مہینہ نماز نہیں پڑھی، پھر ایک نماز کے سوا سب نمازوں کی قضالائے،پھر وقتی نماز پڑھ لے اور اس کو یہ قضا نماز یاد تھی،پھر بھی جائز ہے۔

❁❁❁

(۱)الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت:۱/۱۲۳

صاحبِ ترتیب کو خطبہ کے دوران نماز یاد آنا

سوال نمبر(126):

صاحبِ ترتیب کی نمازِ فجر فوت ہوئی۔ جمعہ کے خطبہ کے دوران یاد آئی۔ اب اگر خطبہ کے دوران فجر کی قضا لائے گا تو دورانِ خطبہ نماز پڑھنا لازم ہوگا جو کہ مکروہ ہے۔ اگر قضا لائے بغیر جمعہ پڑھے گا تو ترتیب ساقط ہو جائے گی، لہٰذا ایسی صورت میں کیا کرے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صاحبِ ترتیب پر فوت شدہ اور وقتی نمازوں کے درمیان ترتیب کی رعایت رکھنا واجب ہے، جب تک فوت شدہ نمازوں کی تعداد چھ یا اس سے زائد نہ ہو تو یہ بدستور صاحبِ ترتیب کے حکم میں رہے گا، لہٰذا ایسے شخص کو فوت شدہ نمازوں کی قضا لانے سے پہلے وقتی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ خطبۂ جمعہ کے دوران اگرچہ نماز پڑھنا مکروہ ہے، لیکن صاحبِ ترتیب پر ترتیب کی رعایت واجب ہونے کی وجہ سے فجر کی قضا لانا مکروہ نہیں۔

لہٰذا سوالِ مذکور میں اس شخص پر لازم ہے کہ دورانِ خطبہ یاد آنے پر فجر کی قضا لائے، ورنہ ترتیب ساقط ہو جائے گی اور جمعہ کی نماز کی صحت فجر کی قضا لانے پر موقوف ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(اذا خرج الإمام فلا صلوة ولا كلام إلى تمامها خلاقضاء فائتة لم يسقط الترتيب بينها وبين الوقتية) فإنها لاتكره.....لضرورة صحة الجمعة، وإلالا. قال ابن عابدين قوله:(فإنها لا تكره) بل يجب فعلها.(۱)

ترجمہ:

جب امام نکلے (منبر پر بیٹھ کر خطبہ شروع کرلے) تو خطبہ ختم ہونے تک نماز پڑھنے، بات کرنے کی اجازت نہیں، بغیر اس قضا نماز کے جس کی وجہ سے فوت شدہ اور وقتی نمازوں کے درمیان ترتیب ساقط نہ ہوئی ہو، کیونکہ اس کا پڑھنا مکروہ نہیں۔۔۔۔ جمعہ کی صحت کا اس پر موقوف ہونے کی وجہ سے، اگر ترتیب ساقط نہ ہوتی ہو تو پھر مکروہ ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: "مکروہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا پڑھنا واجب ہے"۔

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة: ۳/۳٤،۳٥

نفل پڑھنے کے دوران حیض آنا

سوال نمبر (127):

چار رکعت نفل کی تیسری رکعت میں عورت کا حیض آیا تو کیا اس نفل کی قضا عورت پر لازم ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہی قواعد کی رُو سے نفلی عبادت شروع کرنے سے واجب اور لازم ہوجاتی ہے، اس لیے اگر مکمل کرنے سے پہلے کسی وجہ سے نفلی عبادت توڑ دی جائے تو اس کا دوبارہ پڑھنا واجب ہوجاتا ہے۔

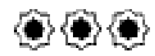
چنانچہ چار رکعت نفلی نماز کی تیسری رکعت میں حیض آنے سے دو رکعت نفل کی قضا لازم ہوگی، کیونکہ نفل کا ہر شفعہ مستقل نماز ہے تو پہلا شفعہ تام ہونے کے بعد حیض آیا، لہٰذا آخری دو رکعت کی قضا لازم ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وإن صلى أربعا وقرأفي الأولين،وقعد ثم أفسد الأخرين قضى ركعتين)لأن الشفع الأول قدتم،والقيا م إلى الثالثة بمنزلة التحريمة المبتدأة،فيكون ملزماهذاإذا أفسد الأخرين بعد الشروع فيهما.(۱)

ترجمہ:

اور اگر چار رکعت (نفل) نماز پڑھنا شروع کیا اور پہلی دو رکعتوں میں قرأت پڑھ کر قعدہ کرلیا، پھر بقیہ دو رکعتوں کو فاسد کردیا تو ان کی قضا لائے گا، اس لیے کہ پہلی دو رکعتیں نماز تو مکمل ہوگئی ہے اور تیسری رکعت کے لیے اٹھنا نئی تحریمہ کی طرح ہے، پس اس کا پورا کرنا لازم ہوگا۔ یہ حکم تب ہے جب آخری دو رکعتیں شروع کرنے کے بعد توڑ دی ہوں۔



(۱) الهداية، كتاب الصلوة، باب النوافل، فصل في القراءة: ۱/۱۵۴، ۱۵۵

فوت شدہ نمازوں کی قضا

سوال نمبر(128):

ایک آدمی سے کچھ نمازیں فوت ہوگئی ہیں۔اب وہ آدمی اُن نمازوں کی قضالانا چاہتا ہے تو وہ کس طرح ان کی قضالائے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ نماز شریعتِ مطہرہ کا ایک اہم رکن ہے، جو کسی صورت میں بھی ساقط نہیں ہوتی، حتیٰ کہ وقت پر ادا نہ کرنے کے بعد بھی یہ ذمہ سے ساقط نہیں ہوتی، بلکہ قضالازم رہتی ہے۔

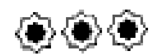
صورتِ مسئولہ میں نمازوں کی قضا کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز کی قضالائی جائے۔ اس طرح ترتیب سے نمازوں کی قضا کرے۔البتہ بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی صحیح ہے، بشرطیکہ صاحبِ ترتیب نہ ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

و كثرة الفوائت كماتسقط الترتيب في الأداء تسقط في القضاء حتى لو ترك صلوة شهرثم قضى ثلاثين فجرًا،ثم ثلاثين ظهرًا،ثم هكذا.(۱)

ترجمہ:

فوت شدہ نمازوں کی کثرت جس طرح ادائیگی میں ترتیب ساقط کر دیتی ہے،اس طرح قضالانے میں بھی ترتیب ساقط کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک ماہ کی نمازیں رہ گئی ہوں، پھر تمیں (دن کی) فجر کی قضالائے، پھر تمیں (دن کی) ظہر کی اس طرح بقیہ نمازوں کی قضالائے تو ایسا کرنا صحیح ہے۔



(۱)الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة،الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت:۱/۱۲۳

صاحبِ ترتیب سے وتر کی نماز کا رہ جانا

سوال نمبر(129):

ایک صاحبِ ترتیب سے وتر کی نماز رہ گئی اور پانچ فرض نمازیں ادا کرنے کے بعد اس کو یاد آیا کہ وتر رہ گئی تھی تواب ان نمازوں کی قضا کس طریقہ سے لائے گا؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ نے جس طرح فرائض کے مابین ترتیب کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایسے ہی فرائض اور وتر کے درمیان بھی ترتیب کو ضروری قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحبِ ترتیب سے اگر وتر کی نماز رہ گئی تو اُسے فجر سے پہلے وتر ادا کرنا چاہیے تھا، لیکن ترتیب چونکہ نسیان سے ساقط ہو جاتی ہے، اس لیے اس کی بقیہ نمازیں درست ہوگئیں اور پھر جس وقت اس کو وتر کی نماز یاد آئی تو اس کے بعد اگلی نماز اس وقت تک درست نہ ہوگی، جب تک اس وتر کی قضا نہ کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولو صلى الفجر وهو ذاكر أنّه لم يوتر، فهي فاسدة عند أبي حنيفة.(۱)

ترجمہ:

اگر کسی نے نمازِ فجر پڑھی اور اسے یاد تھا کہ اس نے نمازِ وتر نہیں پڑھی ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اس کی وہ نمازِ فجر فاسد ہے۔

ثم الترتيب يسقط بالنسيان، وبما هو في معنى النسيان.(۲)

ترجمہ:

ترتیب بھول جانے سے یا ان چیزوں سے جو بھولنے کے حکم میں ہیں، ساقط ہو جاتی ہے۔

ولو صلى الظهر على ظن أنه متوضيء، ثم توضأ وصلى العصر، ثم تبين أنه صلى الظهر من غير

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ۱۲۱/۱

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ۱۲۲/۱

وضوء يعيدالظهر خاصة؛لأنه بمنزلة الناسي في حق الظهر.(۱)

ترجمہ:

کسی نے نمازِ ظہر اس گمان پر پڑھی کہ وہ باوضو ہے، پھر اس نے وضو کیا اور نمازِ عصر پڑھی، پھر ظاہر ہوا کہ اس نے نمازِ ظہر وضو کے بغیر پڑھی تھی تو (اس صورت میں) وہ صرف نمازِ ظہر کو لوٹائے گا، اس لیے کہ وہ ظہر کی نماز کے حق میں بھولنے والے کے حکم میں ہے۔

۞۞۞

نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کر کے بلا عذر بیٹھ کر پورا کرنا

سوال نمبر(130):

اگر ایک شخص نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کرے اور پھر بغیر کسی عذر کے بیٹھ جائے اور اس کو پورا کرے تو یہ عمل کیسا ہے؟ کیا یہ نماز مکمل متصور ہو گی یا قضا لازم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی لحاظ سے نفل نماز کی ادائیگی میں انسان کی سہولت اور آسانی کی رعایت رکھی گئی ہے، لہٰذا جس طرح بیٹھ کر شروع کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نفل نماز شروع کرے اور پھر بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر پورا کرے، تب بھی استحساناً جائز ہے، اس طرح یہ نماز مکمل متصور ہو گی اور قضا لانے کی ضرورت نہیں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

(وإن افتتحها قائمًا،ثم قعدمن غيرعذرجازعندأبي حنيفة)وهذا استحسانًاوعندهما لايجزيه وهو قياس؛لأن الشروع معتبرٌ بالنذرله أنه لم يباشرالقيام فيمابقي ولماباشرصحت بدونه بخلاف النذر؛لأنه التزمه نصًا،حتى لولم ينصّ على القيام لايلزمه القيام عند بعض المشايخ.(۲)

---

(۱)الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة،الباب الحادي عشرفي قضاء الفوائت:۱/۱۲۲

(۲)الهداية، كتاب الصلوة،باب النوافل،فصل في القراءة:۱/۱۵۶

ترجمہ:

اور اگر نفل کھڑے ہوکر شروع کیا، پھر بغیر عذر کے بیٹھ گیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استحساناً جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک قیاس کی وجہ سے ناجائز ہے، کیونکہ شروع کرنا نذر پر قیاس کی وجہ سے ہے (کہ نفل جس حالت میں شروع کیا جائے اسی پر ختم کرنا چاہیے) امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ متنفل نے باقی میں قیام نہیں کیا (اور جس میں قیام کیا، وہ بغیر قیام کے صحیح ہے۔ برخلاف نذر کے، کیونکہ اس نے صراحتاً قیام کو لازم کرلیا، حتی کہ اگر قیام کی تصریح نہ ہوتی تو بعض مشائخ کے نزدیک اس پر قیام لازم نہ ہوتا۔

❁❁❁

صاحبِ ترتیب سے بے ہوشی کی وجہ سے نمازیں قضا ہونا

سوال نمبر (131):

اگر کسی صاحبِ ترتیب آدمی پر بے ہوشی طاری ہوجائے اور چھ سات نمازیں قضا ہوجائیں تو یہ آدمی صاحبِ ترتیب رہے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ میں صاحبِ ترتیب اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کے ذمہ چھ نمازیں قضا باقی نہ ہوں، لہٰذا اگر نماز قضا ہوئی ہو اور اس کو ادا کرلیا ہو تو وہ بدستور صاحبِ ترتیب رہے گا، یعنی اس کے ذمے لازم ہے کہ اگر نماز قضا ہو تو اس کو وقتیہ نماز سے پہلے پڑھ لے۔

لہٰذا اگر کوئی مریض بے ہوش ہوگیا اور پانچ نمازوں سے زیادہ وقت بے ہوشی میں گزرا تو اس پر قضا نہیں اور اگر پانچ نمازوں کا وقت یا اس سے کم وقت بے ہوشی میں گزرا تو ہوش میں آنے کے بعد ان نمازوں کی ترتیب اور پوری نمازیں لوٹانے سے یہ شخص دوبارہ صاحبِ ترتیب متصور ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(ولو فاتته صلوات رتبها في القضاء، كما وجبت في الأصل إلا أن يزيد الفوائت على ستة صلوات)؛لأن الفوائت قد كثرت فتسقط الترتيب فيما بين الفوائت بنفسها، كمايسقط بينها وبين

الوقتية.(١)

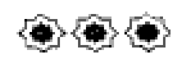
ترجمہ:

اوراگراس کی چندنمازیں فوت ہوگئیں تو قضامیں ان کوترتیب واربجالائے، جیسے نمازوں کی اصل ترتیب واجب تھی، مگر یہ کہ فوت شدہ نمازیں بڑھ کر چھ تک پہنچ جائیں، کیونکہ فوت شدہ نمازیں زیادہ ہوگئیں تو خودفوت شدہ نمازوں کے درمیان ترتیب ساقط ہوجاتی ہے، جیسے فوت شدہ نمازوں اوروقتی نمازوں میں ترتیب ساقط ہوجاتی ہے۔

ومن أغمي عليه خمس صلوات،أو دونها قضى،وإن كان أكثرمن ذلك لم يقض.(٢)

ترجمہ:

اورجس پرپانچ یااس سے کم نمازوں کے وقت میں بے ہوشی طاری رہی توان کی قضا کرے اوراگراس سے زیادہ ہوتو قضانہ کرے۔



قضانمازوں اورروزوں کافدیہ دینا

سوال نمبر(132):

ایک شخص بہت عرصے سے بیمارتھا۔بیماری کے دوران اس سے جونمازیں اورروزے فوت ہوئے تھے،ان سب کا اس نے فدیہ دے دیا۔اب اگر یہ شخص تندرست ہوجائے تو کیااس پرقضانمازوں اورروزوں کی ادائیگی لازم ہوگی یانہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی روسے اگرمریض اپنی مرض سے شفایاب ہوجائے اوراس کواتناوقت مل سکے کہ اس میں وہ قضانمازوں اورروزوں کی ادائیگی کرسکتاہو،چاہے ان قضانمازوں کافدیہ حالتِ مرض میں ادا کرچکا ہو یانہیں۔بہرصورت اس پرقضانمازوں اورروزوں کی ادائیگی لازم ہوگی۔نیز زندگی میں نمازوں کافدیہ بہرحال درست نہیں۔

(١)الهداية،كتاب الصلوة،باب قضاء الفوائت:١/١٦٢

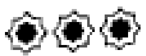
(٢)الهداية،كتاب الصلوة،باب صلوة المريض:١/١٧٠

والدلیل علیٰ ذلك:

ولو قدر علی الصیام بعد ما فدیبطل حکم الفداء الذي فداه، حتی یجب علیه الصوم.(۱)

ترجمہ:

اگر کوئی شخص فدیہ دینے کے بعد روزہ رکھنے پر قادر ہوگیا تو جو فدیہ وہ دے چکا، اس کا حکم باطل ہوجائے گا، حتی کہ اس پر روزے رکھنا واجب ہوگا۔



صاحبِ ترتیب بننا

سوال نمبر (133):

بندہ مسئلہ ترتیب کے متعلق تھوڑے سے تردد کا شکار ہے۔ حل طلب امر یہ ہے کہ صاحبِ ترتیب کون، اور کب بنتا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جس شخص سے بلوغت کے بعد کہیں بھی مسلسل چھ نمازیں فوت نہ ہوئی ہوں، وہ شخص صاحبِ ترتیب ہے۔ اگر کسی سے زندگی میں ایک بار بھی چھ نمازیں فوت ہوئیں تو پھر اس کے اوپر فوت شدہ نمازوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا فرض نہیں، کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صاحبِ ترتیب وہ شخص ہوتا ہے، جس سے بلوغ کے بعد چھ نمازیں فوت نہ ہوئی ہوں، تاہم اگر کسی سے چھ نمازیں فوت ہوگئی ہوں اور پھر اس نے لوٹائی ہوں تو قضا سے چونکہ ذمہ فارغ ہوجاتا ہے، لہٰذا پوری نمازیں لوٹانے سے یہ شخص دوبارہ صاحبِ ترتیب متصور ہوگا اور دوبارہ اس کے لیے نمازوں کی ادائیگی میں ترتیب کا خیال رکھنا لازمی ہوگا۔

والدلیل علیٰ ذلك:

یسقط الترتیب بصیرورۃ الفوائت ستًا ولو کانت متفرقۃ.(۲)

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار اللتي تبیح الإفطار:۱/۲۰۷

(۲) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب قضاء الفوائت، مطلب في تعریف الإعادۃ:۲/۵۲۷

ترجمہ:

اور فوت شدہ نمازوں کی تعداد چھ تک پہنچ جانے سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، اگرچہ متفرق نمازیں قضا ہو چکی ہوں۔

وقید بقضاء البعض؛ لأنہ لو قضی الکل عاد الترتیب عند الکل.(۱)

ترجمہ:

اور نماز کی قضا لانے کو بعض کے ساتھ مقید کیا۔ اس لیے اگر تمام نمازوں کی قضا لائے تو اس صورت میں ترتیب دوبارہ لوٹ آتی ہے۔



قضا نماز کے ہوتے ہوئے دوسری نماز میں امامت کرنا

سوال نمبر(134):

اگر صاحب ترتیب سے نماز قضا ہو جائے اور اس نے ابھی تک وہ نماز نہ پڑھی ہو کہ دوسری نماز کا وقت آجائے اور یہ کہیں نماز کی امامت پر مجبور ہو جائے تو نماز پڑھانے کے بعد اس نماز کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی صاحب ترتیب کی نمازیں قضا ہو جائیں تو اس کے لیے دوسری نماز ادا کرنے سے پہلے اس قضا نماز کی ادائیگی ضروری ہے اور اس وقت تک امامت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ کوئی دوسرا شخص امامت کرائے۔ اور اگر وقتی نماز قضا ہو جانے کا خطرہ نہ ہو تو یہ قضا نماز پڑھنے کے بعد جماعت میں شریک ہو جائے، تاہم اگر اس نے امام بن کر نماز پڑھا دی تو اس کی نماز کی طرح مقتدیوں کی نماز بھی موقوف ہوگئی۔ اگر فوت شدہ نماز کی قضا سے قبل ایسی پانچ نمازوں کا وقت گزر گیا کہ ان کی ادائیگی کے وقت نماز یاد رہنے کے باوجود بھی نہ لوٹائی گئی تو سب نمازیں درست ہوگئیں، البتہ اگر امام نے درمیان میں وہ قضا نماز ادا کر لی تو امام اور مقتدیوں سب کی درمیانی نمازیں باطل ہوگئیں۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب قضاء الفوائت، مطلب فی تعریف الإعادۃ: ۲/۵۲۹

والدّلیل علیٰ ذلك:

(الترتیب بین الفروض الخمسة والوتر أداءً وقضاءً لازمٌ) یفوت الجواز بفوته،للخبر المشهور" من نام عن صلوۃٍ" تمام الحدیث " قوله:(للخبرالمشھور)أونسیھا فلم یذکرھاإلاوھو یصلي مع الإمام فلیصل التي ھو فیھا،ثم لیقض التي تذکرھا،ثم لیعد التي صلیٰ مع الإمام .(۱).

ترجمہ:

پانچ فرض نمازوں اور وتر میں ترتیب لازم ہے،خواہ ادا ہو یا قضا اور اس ترتیب کے فوت ہونے کی وجہ سے اس نماز کا جواز بھی فوت ہوجاتا ہے،خبر مشہور کی رُو سے کہ جو شخص سوگیا اور اس نے نماز نہیں پڑھی۔۔۔الخ یا نماز پڑھنا بھول گیا اور پھر اس وقت یاد آیا،جب یہ شخص امام کے ساتھ اگلی نماز میں شریک ہوچکا تھا تو اس کو چاہیے کہ امام کے ساتھ نماز پوری کرے، پھر اس فوت شدہ نماز کی قضا لائے، پھر جو نماز امام کے ساتھ پڑھی ہے، اس کا اعادہ کرے۔



ایک اہم وضاحت:

مندرجہ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ قضا نمازوں میں بھی ترتیب کی رعایت رکھنی ضروری ہے۔

اسی طرح عشا کی نماز کے فرض،سنت اور وتر میں بھی ترتیب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

یہ مسئلہ بھی اہم ہے کہ صاحبِ ترتیب آدمی سے جب ایک مرتبہ ترتیب ساقط ہوجائے تو کیا نمازوں کی قضا لانے سے وہ دوبارہ صاحبِ ترتیب بن سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں راجح قول یہی ہے کہ اگر صاحبِ ترتیب شخص فوت شدہ نمازوں کی قضا لائے اور اس کے ذمہ کوئی بھی فرض نماز باقی نہ رہے تو وہ دوبارہ صاحبِ ترتیب بن جائے گا اور اس پر فرض نمازوں کی ادائیگی میں ترتیب کی رعایت رکھنی لازم ہوگی۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الصلوۃ،باب قضاء الفوائت،مطلب في تعریف الإعادۃ:۲/۵۲۳

باب إدراك الفريضة

(فرض نماز پانے کا بیان)

مسبوق کا دوسرے مسبوق کو دیکھ کر رکعتوں کی قضا کرنا

سوال نمبر(135):

ایک شخص امام کے ساتھ اس حالت میں شریک ہوا کہ کچھ رکعتیں ہوگئی تھیں، لیکن مسبوق کو پتہ نہ چلا کہ کتنی رکعتیں ہوگئی ہیں۔اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی اس وقت امام کے ساتھ شریک ہوا تھا۔اب کیا یہ شخص اس دوسرے شخص کو دیکھ کر اپنی نماز پوری کرسکتا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب و باللّٰہ التوفیق:

نمازی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کو نماز کی رکعتیں یاد ہوں کہ کتنی رکعتیں امام کے ساتھ پڑھی گئی ہیں اور کتنی باقی ہیں،تاہم اگر مسبوق کو باقی رکعتوں کی تعداد معلوم نہ ہو یا وہ بھول جائے اور دوسرے مسبوق کو دیکھتے ہوئے اپنی نماز پوری کرلے تو یہ جائز ہے،لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھے کہ ایک مسبوق دوسرے مسبوق کی اقتدا کی نیت نہ کرے۔اقتدا کی صورت میں نماز فاسد ہوجائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولو نسي أحد المسبوقين المتساويين كمية ماعليه،فقضى ملاحظًا للأخر بلااقتداء به صحّ.(۱)

ترجمہ:

اور اگر دو مسبوق شخصوں میں سے ایک یہ بھول گیا کہ اس کی کتنی رکعتیں چھوٹی ہیں تو اس نے دوسرے مسبوق کو دیکھتے ہوئے،چھوٹی ہوئی رکعتیں پڑھ لی،مگر اس کی اقتدا نہ کی تو (اس صورت میں اس کی نماز) صحیح ہے۔



(۱) الفتاوی الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس في الإمامة،الفصل السابع في المسبوق واللاحق:۱/۹۲

مسبوق کا درود شریف پڑھنا

سوال نمبر(136):

ایک آدمی ظہر کی نماز میں امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شریک ہوا، آخری قعدہ میں مقتدی امام کے ساتھ التحیات میں درود شریف پڑھے گا یا نہیں؟ اگر قصداً یا بھول کر پڑھ لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ نیز اگر کوئی نفل یا سنتیں پڑھ رہا ہو تو اس میں افضل کیا ہے، قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھے یا نہ پڑھے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب و بالله التوفيق:

فقہی عبارات کی رو سے اگر مسبوق امام کے ساتھ قعدہ اخیرہ میں درود شریف قصداً یا بھول کر پڑھ لے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس پر سجدہ سہو لازم ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ مقتدی تشہد اس قدر آرام سے پڑھ لے کہ امام نماز سے فارغ ہو جائے۔

جہاں تک نفل اور سنن کے قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے کا تعلق ہے تو ظہر اور جمعہ کی سنتوں کے علاوہ باقی چار رکعت والی سنن و نوافل میں ہر دو رکعت مستقل شفع ہونے کی وجہ سے قعدہ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا افضل ہے۔

والدّليل علىٰ ذلك:

وإذا أتمّ التشهّد لا يشتغل بما بعده من الدعوات، ثمّ ماذا يفعل تكلّموا فيه، وعن ابن شجاع: أنه يكرّر التشهّد أي قوله: أشهد أن لآ اله إلّا الله وهو المختار. والصحيح أنّ المسبوق يترسّل في التشهّد، حتّى يفرغ عند سلام الإمام.(١)

ترجمہ:

اور جب تشہد پڑھ چکے تو اس کے بعد کی دعائیں نہ پڑھے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ (وہ تشہد پڑھ لینے کے بعد) کیا کرے۔ ابن شجاع سے منقول ہے کہ وہ کلمہ شہادت بار بار پڑھتا رہے اور یہی حکم مختار ہے۔ اور صحیح حکم یہ ہے کہ مسبوق تشہد کو آہستہ آہستہ پڑھ لے، یہاں تک کہ امام کے سلام کے قریب فارغ ہو۔

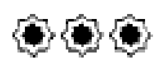
(ولا يصلّي على النبي ﷺ في القعدة الأولى في الأربع قبل الظهر، والجمعة، وبعدها)......لأنّها

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل السابع في المسبوق واللاحق: ٩١/١

لشا كدها أشبهت الفريضة (وفي البواقي من ذوات الأربع يصلّي على النبي ﷺ) (ويستفتح) ويتعوّذ ولو نذرًا؛ لأنّ كلّ شفع صلوٰة.(١)

ترجمہ:

نمازِ ظہر اور جمعہ سے قبل اور بعد کی جو چار، چار رکعتیں سنت ہیں، ان میں قعدہ اولیٰ پر بیٹھ کر (صرف تشہد پڑھا جائے گا) اور درود شریف نہیں پڑھی جائے گی۔۔۔۔اس لیے کہ یہ سنن مؤکدہ ہونے کی وجہ سے فرضیت کے مشابہ ہیں۔اس کے علاوہ باقی چار رکعت سنتوں میں نبی علیہ السلام پر درود شریف پڑھے گا اور تیسری رکعت پر ثناء تعوذ پڑھے گا، اگر چہ یہ نذر کی نماز کیوں نہ ہو، کیوں کہ اس میں ہر ایک شفعہ مستقل نماز ہے۔



امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہونے والے کی رکعت کا حکم

سوال نمبر(137):

مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو رہا تھا کہ امام نے سر اٹھالیا، لیکن مقتدی نے پھر بھی رکوع کر لیا۔اس حال میں امام کے ساتھ ایک تسبیح کے بقدر بھی شریک نہ ہوا تو مقتدی کا رکوع میں امام کے ساتھ شرکت کیے بغیر اس رکعت کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب و باللہ التوفیق:

شریعت کی رو سے جو شخص امام کو رکوع میں پالے تو وہ رکعت کا پانے والا شمار ہوتا ہے، البتہ اگر مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں تھوڑی دیر کے لیے بھی شامل نہ ہو سکا تو وہ مدرکِ رکعت شمار نہ ہوگا، بلکہ اس رکعت کی قضا اس پر فرض ہے

صورتِ مسئولہ میں جب مقتدی امام کے ساتھ رکوع میں شامل نہ ہو سکا تو وہ مدرکِ رکعت نہ ہوا، لہٰذا اختتامی سلام کے بعد اس رکعت کی قضا کرے گا اور وہ رکوع جو مقتدی نے امام کے سر اٹھانے کے بعد کیا ہے، اس سے نماز پر کچھ اثر نہیں پڑتا، تاہم اس رکعت کی قضا بہر حال اس کے ذمے لازم ہے۔

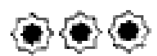
(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب الوتر والنوافل: ٢/ ٤٥٦، ٤٥٧

والدليل على ذلك:

ومن انتهى الى الامام في ركوعه، فكبّر ووقف، حتّى رفع الإمام رأسه من الركوع لا يصير مدركا لتلك الركعة، سواء تمكّن من الركوع أو لم يتمكّن، وكذا لو انحط ولم يقف لكن رفع الإمام رأسه قبل أن يركع.(۱)

ترجمہ:

کوئی شخص امام کے ساتھ رکوع میں ملا اور جب وہ تکبیر کہہ کر کھڑا ہوا تو اتنے میں امام نے رکوع سے سر اُٹھالیا، تو وہ شخص اس رکعت کو پانے والا شمار نہ ہوگا، خواہ اتنی دیر میں وہ رکوع میں شریک ہو سکتا تھا یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں حکم برابر ہے۔ اسی طرح اگر تکبیر کہہ کر کھڑا نہ ہوا اور جھک گیا، لیکن اس کے رکوع میں جانے سے پہلے امام نے (رکوع سے) سر اٹھالیا (تو وہ بھی اس رکعت کو پانے والا شمار نہ ہوگا)۔



مسبوق کے فوت شدہ رکعت کی قرأت کا حکم

سوال نمبر(138):

اگر مقتدی اس حال میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے کہ اس سے قرأت والی پہلی رکعتیں ہوئی ہوں تو مقتدی امام کے سلام پھیرنے کے بعد ان فوت شدہ رکعتوں میں کون سی سورتیں پڑھے گا۔ مثال کے طور پر امام نے دونوں رکعتوں میں معوذتین پڑھی ہوں تو مقتدی اب اس سے پہلے سورتیں پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ احنافؒ کے نزدیک مسبوق فوت شدہ رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملا کر پڑھے گا، کیونکہ مسبوق قرأت کے اعتبار سے نماز کا پہلا حصہ ادا کر رہا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر امام نے پہلی دو رکعتوں میں معوذتین پڑھے ہوں تو مسبوق کو اختیار ہے کہ وہ جو بھی سورتیں پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے، کیوں کہ مقتدی تو امام کے ساتھ صرف آخری رکعتوں میں شریک ہوا ہے اور فوت شدہ

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب العاشر في إدراك الفريضة: ۱/ ۱۲۰

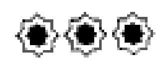
دو رکعتوں میں اس کی حیثیت منفرد کی ہے اور منفرد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جو بھی سورت پڑھے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

قوله: (ويقضي أوّل صلوته في حقّ قرأة) هذا قول محمدؒ كمافي مبسوط السرخسي، وعليه اقتصر في الخلاصه، وشرح الطحاوي......لو أدركه في ركعة الرباعي يقضي ركعتين بفاتحة وسورة.(۱)

ترجمہ:

اور مسبوق اپنی نماز کے پہلے حصے کی قضا قرأت کے ساتھ کرے گا، یہ امام محمدؒ کا قول ہے، جیسا کہ مبسوطِ سرخسیؒ میں ہے اور اسی پر خلاصہ اور شرح الطحاوی میں اکتفا کیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی امام کو چار رکعت والی نماز میں پالے تو وہ دو رکعتوں کی قضا کرے گا، جس میں فاتحہ اور سورت دونوں پڑھے گا۔



جماعت کی آخری دو رکعت میں شامل ہونے والے کا فاتحہ اور سورت پڑھنا

سوال نمبر (139):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو شخص جماعت کی نماز کے آخری دو رکعت میں شامل ہو جائے اور پہلی دو رکعتیں اس سے رہ گئی ہوں تو اکیلے دو رکعت ادا کرتے وقت یہ فاتحہ کے ساتھ سورت ملائے گا یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب و باللّٰہ التوفیق:

احنافؒ کے نزدیک مسبوق قرأت کے اعتبار سے نماز کا پہلا حصہ ادا کرتا ہے، سابقہ رکعتوں کی ادائیگی میں اس کی حیثیت منفرد کی ہوگی، لہٰذا جو مسبوق ظہر، عصر یا عشا کی نماز میں امام کے ساتھ آخری دو رکعت پالے تو وہ امام کی فراغت کے بعد اکیلے دو رکعت ادا کرے گا اور اُن دونوں میں وہ منفرد جیسا نماز پڑھنے کا پابند ہوگا، یعنی سورتِ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت بھی ملائے گا۔

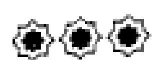
(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، باب الإمامة، مطلب في مالوأتى بالركوع والسجود أو بهمامع الإمام: ۲/۳۴۷

والدّليل علىٰ ذلك:

(وهو منفرد) حتّى يثني،ويتعوّذ،ويقرأ،وإن قرأ مع الإمام ......ويقضي أوّل صلوته في حق قرأة،واٰخرها في حقّ تشهّد .(۱)

ترجمہ:

اورمسبوق فوت شدہ نماز کے ادا کرتے وقت منفرد کی طرح ہے۔یہاں تک کہ وہ ثنا،تعوذ اور قرأت کرے گا، اگرچہ اس نے امام کے ساتھ ایک مرتبہ قرأت کی ہو۔۔۔اور وہ قرأت کے اعتبار سے پہلے حصہ اور تشہد کے اعتبار سے آخری حصہ کی طرح اپنی نماز کی قضا لائے گا۔



قعدہ میں شریک مسبوق کے تشہد کا حکم

سوال نمبر(140):

کوئی مسبوق امام کے ساتھ قعدہ میں شریک ہوجائے اور بعینہٖ اسی وقت امام قیام کے لیے کھڑا ہوجائے تو اس صورت میں یہ شخص اپنا تشہد پورا کرے گا یا امام کی متابعت کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہی قیام کے لیے کھڑا ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب و باللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے مقتدی کے لیے نماز کے دوران امام کی متابعت ضروری ہے،تاہم بعض مواضع میں شریعت کی طرف سے تاخیر کی بھی اجازت ہے۔

صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شخص امام کے ساتھ قعدہ میں شریک ہوجائے اور امام تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے اور مقتدی نے تشہد پورا نہیں کیا ہو تو مختار قول یہ ہے کہ مقتدی تشہد پورا کرکے امام کے ساتھ شامل ہو،البتہ اگر کسی نے تشہد پورے کیے بغیر امام کی متابعت کی تو بھی نماز صحیح ہے۔

---

(۱)الدرالمختار علی صدر ردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب الإمامۃ:۲/۳۴۶،۳۴۷

والدّليل علىٰ ذلك:

إذاأدرك الإمام في التشهّد،وقام الإمام قبل أن يتمّ المقتدي أوسلّم الإمام في آخر الصلوٰة قبل أن يتم المقتدي التشهد،فالمختار أن يتمّ التشهّد،وإن لم يتمّ أجزأه.(١)

ترجمہ:

مقتدی تشہد میں امام کے ساتھ شریک ہوا اور امام مقتدی کے تشہد پورا پڑھنے سے پہلے کھڑا ہو گیا یا مقتدی کے تشہد پورا پڑھنے سے پہلے امام نے سلام پھیر دیا تو (اس صورت میں) مختار حکم یہ ہے کہ مقتدی تشہد پورا پڑھ لے اور اگر پورا نہیں کیا تو پھر بھی نماز جائز ہو جائے گی۔

❁❁❁

مسبوق کا وتر کی آخری رکعت میں شرکت کے بعد قنوت کا حکم

سوال نمبر(141):

باجماعت وتر نماز میں ایک آدمی مسبوق ہوا۔اُس نے تیسری رکعت امام کے ساتھ پڑھی اور دُعائے قنوت بھی پڑھ لی۔اب جب بعد میں یہ دو رکعتیں پڑھے گا تو ان میں قنوت پڑھے گا یا امام کے ساتھ پڑھی ہوئی قنوت اس کے لیے کافی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

مسبوق بقیہ نماز میں نماز شروع کرنے والے کی طرح ہے (گویا وہ اب نماز شروع کر رہا ہو) اور یہی مسئلہ رمضان شریف میں وتر کی نماز کا ہے۔مسبوق نے جب تیسری رکعت میں شرکت کر کے امام کے ساتھ ایک مرتبہ حکماً قنوت پڑھ لیا ہے تو اب بقیہ رکعتوں میں قنوت پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

(قوله وأما المسبوق)أي في وتر رمضان بركعة أوركعتين(قوله:فيقنت مع إمامه فقط) ولا يأتي به ثانيًا؛لأنه مأمور بأن يقنت مع الإمام فصار ذلك موضعًا له،فلو أتىٰ بالثاني كان ذلك

(١) الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس في الإمامة،الفصل السادس في مايتابع الإمام:١/ ٩٠

تكراراً للقنوت.(١)

ترجمہ:

اور جو شخص مسبوق ہو، یعنی اس سے رمضان المبارک میں وتر کی نماز کی ایک یا دو رکعتیں چھوٹ گئی ہوں تو یہ شخص صرف امام کے ساتھ قنوت پڑھنے پر اکتفا کرے گا اور اسے دوبارہ نہیں پڑھے گا، اس لیے کہ یہ اس بات پر مامور ہے کہ صرف امام ہی کے ساتھ قنوت پڑھے گا، اگر یہ دوبارہ قنوت پڑھے گا تو اس سے قنوت کا تکرار لازم ہوگا۔

❁❁❁

مقتدی کا امام کے ساتھ سجدہ میں شرکت

سوال نمبر(142):

ایک شخص امام کو سجدہ کی حالت میں پالے تو آیا وہ اس امام کے ساتھ فوراً سجدہ میں شرکت کرے گا یا امام کی سجدوں سے فراغت تک انتظار کرے گا اور جب وہ فارغ ہو جائے تو پھر اس کے ساتھ شریک ہو جائے گا۔ ان دونوں صورتوں میں وہ کون سی صورت اپنائے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی شخص امام کو سجدہ کی حالت میں پا کر اس کے ساتھ شریک نہ ہو جائے، بلکہ انتظار کر کے سجدوں سے فراغت کے بعد شریک ہو جائے تو یہ صورت بھی جائز ہے، لیکن بہتر نہیں، بلکہ اسی مسئلہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "إذا جئتم إلى الصلوة ونحن سجود ،فاسجدوا...... جب تم نماز میں ملنے کے لیے آؤ اور ہمیں سجدہ میں پاؤ تو سجدہ کرلو، لہٰذا اس روایت کو دیکھتے ہوئے فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ ایسا شخص فوراً امام کے ساتھ شریک ہو کر سجدہ میں چلا جائے۔

والدّليل علىٰ ذلك:

وإذا وجد الإمام ساجداً تجب مشاركته فيه فيخر ساجداً،وإن لم يحسب له من صلاته ......الخ

وقال الشارح الطحطاويؒ:(قوله تجب مشاركته فيه) ظوهر عبارته الوجوب،وإن قصد الركوع ففاته،

(١) حاشية الطحطاوي على الدرالمختار ،كتاب الصلاة ،باب الوتر والنوافل :١/ ٢٨٣

ويؤيده حديث أبي داؤد عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ ((إذا جئتم إلى الصلاة ونحن سجود فاسجدوا، ولا تعدوه شيئا ومن أدرك الركوع فقد أدرك الركعة)).(۱)

ترجمہ:

اور جب کوئی امام کو سجدہ میں پائے تو اس پر امام کے ساتھ شرکت لازم ہے، البذا یہ بھی سجدہ کرے گا، اگرچہ یہ اس کی نماز میں شمار نہ ہوگا۔ علامہ طحطاویؒ مصنف کے اس قول تجب مشاركته فيه کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ اس عبارت سے تو بظاہر شرکت کا وجوب معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس نے رکوع کا قصد کیا ہو اور وہ اس سے فوت ہو چکا ہو۔ اور اس کی تائید ابوہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ملتی ہے، جو کہ ابو داؤد شریف میں مذکور ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: ''نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جب تم نماز پڑھنے کی غرض سے آجاؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو تم بھی سجدہ کرو اور اس کو اپنی نماز میں شمار نہ کرو اور جس نے رکوع پالیا گویا کہ اس نے پوری رکعت پالی''۔



پانچویں رکعت کے لیے امام کے قیام پر مسبوق کا حکم

سوال نمبر (143):

قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد امام پانچویں رکعت کے لیے سہواً کھڑا ہوگیا تو ایسی صورت میں مسبوق (جس نے امام کے ساتھ کچھ رکعتیں پڑھی ہوں اور کچھ باقی ہوں) کیا طریقہ اختیار کرے؟ کیا وہ بھی امام کی تابعداری کرتے ہوئے پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے یا بیٹھ کر امام کے بیٹھنے اور سلام پھیرنے کا انتظار کرے اور یا امام کی تابعداری چھوڑ کر اپنی بقیہ نماز پوری کرے، تینوں صورتوں میں مسبوق کے لیے کونسی صورت قابلِ عمل ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

پانچویں رکعت کے لیے امام کھڑا ہو تو مسبوق اس کی پیروی نہ کرے، بلکہ بیٹھ کر امام کے لوٹنے کا انتظار کرے۔ اگر امام پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے قبل لوٹ کر بیٹھ گیا تو مسبوق اس کے ساتھ سجدہ سہو کر کے امام کے سلام کے بعد کھڑا ہو جائے اور اپنی بقیہ نماز پوری کرے۔ اگر امام نے پانچویں رکعت بھی پڑھی تو پھر مسبوق تشہد کی

(۱) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلوة، باب إدراك الفريضة: ص ۳۷۱

مقدار بیٹھنے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرے اور اگر امام چوتھی رکعت کے بعد تشہد کے لیے بیٹھنے کے بغیر کھڑا ہو تو پھر اس صورت میں مسبوق امام کی تابعداری کرے یا نہ کرے، دونوں صورتوں میں پانچویں رکعت کے لیے سجدہ کرنے سے فرض نماز نفل میں تبدیل ہو جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولو قام الإمام إلى الخامسة،فتابعه المسبوق إن قعد الإمام على رأس الرابعة تفسد صلوة المسبوق،وإن لم يقعد لم تفسد،حتى يقيد الخامسة بالسجدة،فإذاقيدها بالسجدة فسدت صلوة الكل .(١)

ترجمہ:

اور اگر امام پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا اور مسبوق نے اس کی پیروی کی تو (اس کا حکم یہ ہے کہ) اگر امام چوتھی رکعت کے بعد (التحیات کے لیے بقدرِ تشہد) بیٹھا تھا تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر امام چوتھی رکعت کے بعد بیٹھا نہیں تھا تو جب تک امام پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کرے گا، اس (مسبوق) کی نماز فاسد نہ ہو گی اور جب امام نے پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو سب (امام و مقتدی) کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

وفي الأصل:لو قام المسبوق إلى قضاء ماسبق به بعد فراغه من التشهد قبل السلام جاز.(٢)

اور اصل میں ہے کہ: اگر مسبوق اپنی فوت شدہ رکعتوں کی ادائیگی کے لیے تشہد سے فراغت کے بعد اور سلام پھیرنے سے قبل کھڑا ہو جائے تو یہ جائز ہے۔

❁❁❁

مقتدی کا سجدے میں جانے سے پہلے امام کا سجدے سے سر اٹھانا

سوال نمبر (144):

ایک شخص امام کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا، تیسری رکعت میں جب امام سجدے میں چلا گیا تو یہ شخص قومے میں کچھ دیر کھڑا رہا، یہاں تک کہ جب یہ مقتدی سجدے میں جانے لگا تو امام نے سجدے سے سر اٹھا لیا تھا، یوں مقتدی نے امام کو سجدہ میں نہیں پایا۔ تو اس صورت میں مقتدی کی نماز درست ہو گی یا نہیں؟

(١) الفتاوى الهندية،كتاب الصلوة،الباب الخامس في الإمامة،الفصل السابع في المسبوق واللاحق:١/٩٢

(٢) طاهر ابن عبدالرشيد البخاري،خلاصة الفتاوى،كتاب الصلوة،الفصل [illegible] ١٦٩/١

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے نماز کے ارکان میں مقتدی کے لیے امام کی تابعداری لازم ہے اور یہ تابعداری عام ہے، چاہے ارکان میں شریک ہو یا مقتدی امام کے بعد وہ رکن ادا کرے۔ یہ تفصیل اس صورت میں ہے، جب اس سے پہلے اُس نے امام کی اتباع کی ہو اور اگر یہ شخص ابھی اقتدا کر رہا ہو تو پھر اس کا امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ اُس رکعت کا پانے والا شمار نہ ہوگا۔

صورتِ مسؤلہ میں جب امام سجدہ کے لیے چلا گیا اور مقتدی نے قومہ میں تاخیر کی اور امام کے ساتھ سجدہ میں شریک نہ ہوسکا اور پھر الگ سجدہ کر کے امام کے ساتھ شریک ہو جائے، تب بھی اس کی نماز درست ہوگی اور اگر سجدہ چھوڑ کر فوراً امام کے ساتھ بقیہ نماز میں شریک ہو جائے اور امام کی فراغت کے بعد ایک رکعت مستقل ادا کرے تو نماز درست ہوگی، تاہم اگر سرے سے رکعت ادا نہیں کی تو نماز باطل ہو کر اعادہ کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

قال ابن عابدینؒ: نعم تكون المتابعة فرضاً بمعنى أن يأتي بالفرض مع إمامه أو بعده، كمالو ركع إمامه،فركع معه مقارناً أو معاقباً، وشاركه فيه أو بعد ما رفع منه.(١)

ترجمہ:

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ وہاں متابعت کا فرض ہونا اس معنی کے اعتبار سے ہے کہ مقتدی فرض رکن اپنے امام کے ساتھ یا امام کی (فراغت) کے بعد ادا کرے، جیسا کہ کوئی امام رکوع کرے اور یہ بھی اس کے ساتھ اکٹھے رکوع کرے یا اس کی فراغت کے بعد رکوع کرے یا اس رکن میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور یا اس سے فارغ ہونے کے بعد شریک ہو جائے۔



(١) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوة، باب صفة الصلوة، مطلب: مهم في تحقيق متابعة الإمام: ٢/١٦٦

باب الاستسقاء

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

اللہ تعالیٰ نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا ہے۔(۱)

تمام ذی روح اشیا کی زندگی کی بقا پانی ہی پر منحصر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو ہم آسمان سے بارش کو آبِ حیات کی شکل میں نازل فرما کر اس کی زندگی کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔(۲)

چونکہ نماز اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کی کلید ہے اور مختلف ضرورتوں کے مواقع پر مخصوص نمازوں کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے پانی جیسی اہم ضرورت کو حاصل کرنے کے لیے بھی اس بنیادی وسیلے کا سہارا لینا بہتر ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کئی مواقع پر جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو آپ ﷺ استسقا یعنی نماز یا دعا واستغفار کے ذریعے سیرابی کی دعا فرمایا کرتے تھے۔(۳)

استسقا کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

استسقا کا لغوی معنی "پانی طلب کرنے" کے ہیں، اس لیے پانی کے لیے کی جانی والی دعا اور نماز دونوں کو استسقا کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں استسقاء کا معنی ہے:

"طلب إنزال المطر من الله تعالیٰ بکیفیة مخصوصة عند شدة الحاجة".

سخت ضرورت کے وقت مخصوص کیفیت کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے بارش برسانے کی دعا کو استسقا کہتے ہیں۔(۴)

استسقا کی مشروعیت:

استسقا کے لیے دعا واستغفار اور نماز کی مشروعیت قرآن وحدیث اور اجماع ہر ایک سے ثابت ہے۔ قرآن

(۱) الأنبیاء:۳۰ (۲) النحل:۶۵

(۳) ملخص أز قاموس الفقه، مادة استسقاء:۲/۱۰۹، ۱۱۰، الموسوعة الفقهية، مادة استسقاء:۳/۳۰۶

(۴) حاشية الطحطاوي علیٰ مراقي الفلاح، باب الاستسقاء، ص:۴۴۹، ۴۵۰، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوٰة، باب الاستسقاء:۳/۷۰

کریم میں ہے:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ ﴿۱۰﴾ ﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ ﴿۱۱﴾ ﴿وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا﴾.(۱)

مذکورہ آیات میں بارش، مال واولاد کی کثرت اور باغات ونہروں کی فراوانی کو استغفار کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح قحط سالی کے زمانے میں نبی کریم ﷺ سے بارش کے لیے دعا اور دورکعت نماز پڑھنے کا عمل بھی متعدد روایات میں منقول ہے۔(۲)

علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں کہ:''استسقاء کی مشروعیت پر پوری امت کا اجماع ہے''۔(۳)

استسقا کا حکم شرعی:

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں استسقا کے لیے صرف دعا کرنا مسنون ہے، البتہ نماز پڑھنا بھی بلا کراہت جائز ہے، تاہم امام محمدؒ کے ہاں نماز پڑھنا اور دعا کرنا یا صرف دعا پر اکتفا کرنا ہر ایک مستقل سنت ہے، جس کا ثبوت مستقل طور پر احادیث میں موجود ہے۔ حنفیہ کے ہاں فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے اور یہی قول امام ابو یوسفؒ کا بھی ہے۔(۴)

استسقا کن صورتوں میں مشروع ہے؟

جب نہریں اور کنویں خشک ہوجائیں، انسان وحیوان کے پینے کے لیے اور کاشت کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پانی میسر نہ ہو یا میسر تو ہو، لیکن ناکافی ہو تو ایسی صورت میں استسقا مسنون ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ :''سرسبز وشاداب اور بارش والے علاقوں کے لوگ خشک علاقے والوں کے لیے بھی استسقا کرسکتے ہیں، اسی طرح اگر کسی قوم نے نمازِ استسقا اور دعا کے لیے تیاری کرلی ہو، لیکن نماز اور دعا سے پہلے ہی بارش ہوجائے تو واپسی کی بجائے بطورِ شکر ہی نماز پڑھنا مستحب ہے''۔

اسی طرح اگر ایک مرتبہ نمازِ استسقا پڑھنے سے خشکی دور نہ ہو تو حنفیہ کے ہاں مسلسل تین دن تک پڑھنا بھی

(۱) نوح: ۱۰-۱۲ (۲) الصحيح للبخاري، أبواب الاستسقاء، باب الاستسقاء في المسجد الجامع: ۱/۱۳۷، أبوداؤد، كتاب الصلوة، أبواب صلوة الاستسقاء، باب رفع اليدين في الاستسقاء: ۱/۱۷۳

(۳) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب الاستسقاء، ص: ٤٥٠

(٤) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في صلاة الاستسقاء: ۲/۲۵۸-۲٦۰، ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب الاستسقاء: ۳/۷۰

مسنون ہے۔فقہائے کرام کے ہاں تین دن سے زیادہ نمازِ استسقاء پڑھنا ثابت نہیں ہے،اس لیے تین دن کے بعد نماز استسقاء کے لیے نکلنے کی بجائے صرف دُعا اور استغفار پر اکتفا کرے۔(۱)

استسقاء کی صورتیں اور ان میں سے افضل صورت:

حنفیہؒ کے ہاں استسقاء کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) نماز کے بغیر اجتماعی طور پر دعا و استغفار۔

(۲) انفرادی طور پر دو دو رکعت نماز کی ادائیگی۔

(۳) اجتماعی طور پر دو رکعت نماز کی ادائیگی،اس کے بعد خطبہ اور دعا و استغفار۔

امام ابوحنیفہؒ کے ہاں پہلی صورت اور امام محمدؒ کے ہاں آخری صورت افضل ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جماعت کے ساتھ بھی یہ نماز ادا فرمائی ہے اور جماعت کے ساتھ پڑھنے میں مصالح بھی زیادہ ہیں۔(۲)

استسقاء کے لیے مناسب جگہ:

جمہور فقہاء کرام کے ہاں بالاتفاق مکروہ اوقات کے علاوہ بقیہ تمام اوقات میں استسقاء کے لیے نماز پڑھی جا سکتی ہے،تاہم اگر نماز کی بجائے صرف دعا پر اکتفا کرنا ہو تو مکروہ اوقات میں بھی استسقاء کرنا درست ہے۔بعض فقہائے کرام نے عید کی نماز کے لیے مخصوص وقت کو استسقاء کے لیے بھی افضل قرار دیا ہے۔استسقاء کے لیے شہر سے باہر کسی صحرا یا ویرانے میں نکلنا افضل ہے،تاہم مکہ،مدینہ منورہ اور بیت المقدس جیسے شہروں میں مسجد حرام،مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں استسقاء کرنا زیادہ بہتر اور مستحب ہے۔(۳)

نمازِ استسقاء کا مستحب طریقہ:

استسقاء کے لیے نکلنے سے پہلے مستحب یہ ہے کہ امام لوگوں کو تین دن روزہ رکھنے کی ہدایت کرے اور گناہوں سے توبہ،حقوق کی ادائیگی اور ظلم و زیادتی کی تلافی پر خصوصی زور دے،پھر چوتھے دن نماز کے لیے نکلے۔نماز کے لیے

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب الاستسقاء:۳/۷۲،۷۳،فتح القدیر،کتاب الصلاۃ،باب الاستسقاء:۲/۵۷ (۲) الدرالمختار مع ردالمحتار،کتاب الصلوۃ،باب الاستسقاء:۳/۷۰۔۷۲،مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي،باب الاستسقاء: ۴۵۰،۴۵۱، بدائع الصنائع، كتاب الصلوة،فصل في صلاة الاستسقاء:۲/۲۵۸،۲۵۹

(۳) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي،باب الاستسقاء،ص:۴۵۱،۴۵۲،الموسوعة الفقهية،مادة الاستسقاء:۳/۳۰۸

پیدل جانا بہتر ہے۔کپڑے پرانے اور پیوند لگے ہوئے ہوں تو زیادہ بہتر ہے،البتہ پاک اور دھلے ہوئے ضرور ہوں۔ چلتے ہوئے سر جھکائے رہیں،عاجزی اور درماندگی ایک ایک ادا سے نمایاں ہو اور تمام مؤمنوں کے لیے توبہ واستغفار زبان پر جاری ہو۔

مستحب یہ ہے کہ امام بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی نکل آئے۔یہ بھی مستحب ہے کہ ہر روز استسقا کے لیے نکلنے سے پہلے کچھ نہ کچھ صدقہ دے دیا کریں۔اسی طرح استسقا میں بوڑھوں،بچوں اور جانوروں کو ساتھ لے جانا بھی مستحب ہے،تاکہ ان ضعیف لوگوں اور بے زبان مخلوق کے واسطے رحم دلانہ فریاد اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کی جاسکے۔نمازِ استسقا کی مجموعی کیفیت نمازِ عید کی طرح ہے،یعنی آذان و اقامت کے بغیر جہری قرات کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرنا مستحب ہے،تاہم نمازِ استسقا میں نمازِ عید کی طرح تکبیراتِ زوائد نہیں۔بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ اور دوسری میں سورۂ غاشیۃ پڑھی جائے۔نماز کے بعد مستحب یہ ہے کہ امام زمین پر کھڑے ہو کر کسی لاٹھی یا تلوار کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس پر ٹیک لگا کر لوگوں کی طرف رخ کرتے ہوئے خطبہ پڑھے۔امام محمدؒ کے ہاں دو خطبے پڑھنا (جن کے درمیان معمولی جلسہ ہو) جب کہ امام ابو یوسفؒ کے ہاں ایک خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔خطبہ کے دوران لوگوں کے لیے خاموش رہنا اور سننا ضروری ہے۔خطبہ پڑھنے کے بعد امام قیام کی حالت میں قبلہ کی طرف رخ کر کے دعا کرے گا،دعا زور سے بھی کی جاسکتی ہے اور آہستہ بھی،دوسرے لوگ امام کے پیچھے قبلہ رخ ہو کر بیٹھیں گے اور دعا واستغفار کرتے رہیں گے،تاہم اگر امام بلند آواز سے دعا کر رہا ہو تو لوگ اس پر آمین کہتے جائیں گے۔دعا کے دوران ہاتھوں کو سر تک اٹھانا مسنون ہے۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اتنا بلند فرمایا کہ بغل مبارک کی سفیدی نظر آتی تھی۔سر کی مقدار سے زیادہ ہاتھ اٹھانا مناسب نہیں۔

امام محمدؒ کے ہاں خطبے کا کچھ حصہ پڑھنے کے بعد نیک فالی کے طور پر چادر پلٹ دی جائے،تاہم ایسا کرنا صرف امام کے لیے مسنون ہے،عوام کے لیے نہیں۔چادر پلٹنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں،اوپر والے حصے کو نیچے کر دیا جائے،دائیں والے حصے کو بائیں کر دیا جائے یا باہر کے حصے کو اندر اور اندر کے حصے کو باہر کر دیا جائے۔رسول اللہ ﷺ سے دعا کے مختلف الفاظ منقول ہیں،جن میں سے اکثر فقہاے کرام نے یہ دعا نقل کی ہے:

"اللھم اسقنا غیثا مغیثا ھنیئا مریعا غدقا مجللا دائما نافعا غیر ضار عاجلا غیر اٰجل ".(۱)

---

(۱) مراقي الفلاح ،باب الاستسقاء،ص:۴۵۱۔۴۵۵،الفتاوی الهندية،الباب التاسع عشر في الاستسقاء:۱/۱۵۳،۱۵۴
الدرالمختار مع ردالمحتار،باب الاستسقاء:۳/۷۰۔۷۳،بدائع الصنائع ،فصل في صلوة الاستسقاء:۲/۲۵۸۔۲۶۳

باب الاستسقاء

(نمازِ استسقا)

تین دن سے زیادہ نمازِ استسقا

سوال نمبر (145):

اہلِ علاقہ نے تین دن تک نمازِ استسقا پڑھی، لیکن بارش نہیں ہوئی۔ اب نماز جاری رکھی جائے یا استسقا کا عمل پورا ہو چکا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قحط اور خشک سالی میں مسلمانوں کا اجتماعی طور پر توبہ واستغفار کرتے ہوئے تین دن تک بارش کی طلب کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں نماز پڑھنا مسنون ہے، البتہ تین دن تک متواتر پڑھ لینے کے بعد مزید پڑھنا منقول نہیں، اس لیے شریعت کی مقررہ مدت سے تجاوز کرکے تین دن سے بڑھانا درست نہیں، بلکہ شرعی حکم تین دن تک پڑھ لینے سے پورا ہو گیا، نیز امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح استسقا نماز پڑھ کر کیا جا سکتا ہے، اسی طرح دعا اور استغفار سے بھی کیا جا سکتا ہے، لہٰذا اگر مزید نماز نہیں پڑھی جا سکتی، دعا اور استغفار تو کیا جا سکتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

يخرجون للاستسقاء ثلاثة أيام، ولم ينقل أكثر منها. (۱)

ترجمہ: وہ استسقا کے لیے تین دن تک نکلیں گے، اس سے زیادہ منقول نہیں۔

❁❁❁

نمازِ استسقا میں خطبہ کا وقت

سوال نمبر (146):

نمازِ استسقا میں خطبہ اور دعا کے اوقات کون کون سے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

(۱) فتح القدير، كتاب الصلوة، باب الاستسقاء: ۵۷/۲

الجواب وباللہ التوفیق :

حضور ﷺ سے استسقا کے سلسلے میں کئی طریقے ثابت ہیں، لہٰذا کبھی آپ ﷺ نے نماز پڑھ کر استسقا کی تو کبھی محض دعا یا استغفار پر اکتفا کیا۔ جس طرح نماز پڑھ کر استسقا کیا جا سکتا ہے، اسی طرح دعا اور استغفار پڑھ کر بھی جائز ہے، اس لیے استسقا صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں۔ سیدنا امام ابوحنیفہؒ کی یہی رائے ہے، جبکہ صاحبینؒ استسقا میں نماز کے قائل ہیں۔ جہاں کہیں صاحبین کی رائے پر عمل کرتے ہوئے نماز پڑھ کر استسقا کرنا ہو تو پھر خطبہ اور دعا نماز کے بعد ہوں گے، کیونکہ صاحبینؒ نے ترمذی کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے خطبہ اور دعا کو نماز کے بعد نقل کیا ہے اور اسی پر امت کا تعامل چلا آرہا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

عن عباد بن تمیم عن عمه أن رسول ﷺ خرج بالناس یستسقي فصلیٰ بهم رکعتین ...... رفع یدیه واستسقی واستقبل القبلة.(۱)

ترجمہ:

عباد اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ لوگوں کو لے کر بارش کی طلب کے لیے باہر نکلے، انہیں دو رکعت نماز پڑھائی ۔۔۔ ہاتھ اُٹھائے اور قبلہ رُخ ہو کر بارش طلب کی۔

قالا: یصلي الإمام رکعتین، ویجهر فیهما بالقراءة، ثم یخطب ...... ویستقبل القبلة بالدعاء.(۲)

ترجمہ:

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ: ''امام دو رکعت نماز پڑھائے گا، دونوں رکعتوں میں قرأت جہر کے ساتھ پڑھے گا، پھر خطبہ دے گا ۔۔۔ اور قبلہ رُخ ہو کر دعا مانگے گا''۔



(۱) جامع الترمذي، ابواب السفر، باب ماجاء في صلاة الاستسقاء: ۱/۲۳۷

(۲) الهداية، كتاب الصلاة، باب الاستسقاء: ۱/۱۸۷

باب الجنائز

(مباحث ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے، جس سے انکار کی گنجائش دنیا کے کسی بھی عقل مند انسان کے لیے ممکن نہیں۔ مختلف افراد کے مختلف حالات کے اعتبار سے یہ ایک ایسا میٹھا یا کڑوا گھونٹ ہے، جس کا ذائقہ ہر کسی کو چکھنا ہے۔ یہی اس دنیا کا نظام ہے، جو ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ اس حقیقی اور نازک موڑ تک پہنچنے سے پہلے اور بعد میں انسان کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن کا اثر اس کے علاوہ اس کے گھر والوں اور معاشرے پر بھی پڑتا ہے، مثلاً: بیماری، عیادت، علاج، موت کی سختی کے دوران اس کے ساتھ مناسب سلوک، غسل، تکفین، نمازِ جنازہ، غم وحزن، تعزیت اور زیارتِ قبور جیسے مراحل وہ ہیں، جن میں سے اکثر کی ابتدا وہی سے ہوئی ہے، جہاں سے خود انسانیت کی ابتدا ہوئی ہے، تاہم نبی کریم ﷺ نے ان مروجہ احکام میں حسبِ ضرورت کچھ بنیادی اصلاحات بھی فرمائی ہیں، جن کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات کو دنیا کے تمام مذاہب پر فوقیت حاصل ہے کہ اس میں انسان کے جنم لینے کے بعد سے اس کی موت تک کے تمام مراحل میں اس کی عزت واحترام اور تقدس وتحفظ کا خیال رکھا گیا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے مذکورہ باب کے ایک ایک حکم کو مستقل طور پر عقل وفہم اور انسانی مصلحت کے مطابق قرار دیا ہے اور اس پر خوب تفصیل کے ساتھ بحث بھی فرمائی ہے۔(۱)

جنائز کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

صلاۃ الجنازۃ میں صلاۃ کی اضافت جنازۃ کی طرف ''اضافۃ الشیئ الی سببہ'' کے قبیل سے ہے۔ جنازہ کا لفظ جیم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مستعمل ہے۔ فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے ''میت'' اور کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: ''سریر'' یعنی وہ چارپائی یا تخت جس پر مردہ رکھا جاتا ہے۔ دونوں کا اطلاق تخت پر رکھے ہوئے مردہ پر بھی ہوتا ہے۔(۲)

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ، مبحث فی الجنائز وحکمۃ تشریعھا: ۲/۳۲،۳۳، احکام اسلام عقل کی نظر میں، حصہ اول، باب الجنائز: ۸۵-۹۲

(۲) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ: ۳/۷۷، مراقی الفلاح، باب أحکام الجنائز، ص [illegible]

باب الجنائز کے احکامات کی تفصیل:

فقہائے کرام کے ہاں باب الجنائز ان تمام فقہی مباحث پر مشتمل ہے، جن کا تعلق انسان کی موت سے اس کی تجہیز و تکفین تک ہو۔ زیرِ نظر باب میں بھی فقہائے کرام کی ترتیب کو مدِنظر رکھ کر اجمالی طور پر ہر بحث کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

محتضر یعنی قریب المرگ شخص کے احکام:

موت کے قریب ہونے کی حالت کو احتضار کہتے ہیں۔ اس کی علامات مختلف ہو سکتی ہیں، مثلاً پاؤں کا ڈھیلا ہو جانا، نتھنوں کا پھول جانا اور چہرے وغیرہ اعضا کے جلد کا تھن جانا وغیرہ۔ اس حالت میں مسنون یہ ہے کہ دائیں پہلو پر اس کو قبلہ رُخ کر کے لٹا دیا جائے، بشرطیکہ اس میں کوئی مشقت اور دشواری نہ ہو۔ اگر دشواری محسوس ہو تو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کو چت لٹا دیا جائے اور سر کے نیچے کوئی چیز رکھ کر قبلہ کے عین سامنے کر دیا جائے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ روح نکلنے اور اعضا کی درستگی کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب ہے۔ اس کے بعد اس کے سامنے شہادتین کی تلقین کی جائے۔ تلقین کی صورت یہ ہے کہ شہادتین کو بلند آواز سے بار بار پڑھے، مگر اس کو پڑھنے کی تاکید نہ کرے کہ مبادا اس کی زبان سے انکار کا لفظ نکل آئے۔ یہ تلقین مستحب ہے۔ علامہ شامیؒ اور شرنبلالیؒ نے قبر میں رکھے جانے کے بعد بھی مردے کو دین پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کو مشروع قرار دیا ہے اور بعض روایات و آثار سے اس کی تائید کر کے اس کو میت کی موانست اور فائدے کا سبب قرار دیا ہے، تاہم علامہ حصکفیؒ اور عالمگیری نے ظاہر الروایۃ میں اس کو غیر مشروع قرار دیا ہے اور صرف دو جگہوں میں تلقین کو جائز قرار دیا ہے: موت کے وقت اور تدفین کے وقت۔ تلقین کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ میت کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ایسے وقت میں اہلِ خیر اور دین دار حضرات کا مریض کے قریب بیٹھنا اور سورۂ یٰسین وسورۂ رعد کی تلاوت کرنا مستحب ہے۔ اس وقت وہاں پر خوشبو رکھنا بھی بہتر ہے۔ حائضہ عورت یا جنبی شخص کا اس وقت حاضر ہونا جائز ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس حالت میں اگر مرنے والے کی زبان سے کوئی کفریہ کلمہ نکل گیا تو اس کی وجہ سے اس کو کافر نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ مسلمانوں ہی جیسا معاملہ کیا جائے گا اور اسی طرح تکفین و تدفین ہوگی۔ موت کے وقت اقربا اور دوستوں کی حاضری مستحب ہے، تاکہ تسلی، تلقین اور تذکیر وغیرہ کرتے رہیں اور نزاع کے وقت اس کو پانی بھی پلا سکیں۔(۱)

---

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ: ۳/۷۷-۸۲، مراقي الفلاح، باب أحكام الجنائز، ص: ۴۵۸-۴۶۳، الفتاوی الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر: ۱/۱۵۷

موت کے بعد کے فوری اعمال:

موت کے فوراً بعد اس کی آنکھیں بند کر دی جائیں گی اور ٹھوڑی کو ایک کپڑے کے ذریعے پیشانی کی طرف سے سر کے ساتھ باندھا جائے گا، تاکہ تمام اعضا مناسب رہیں اور میت بدصورت نہ لگے۔ ٹھوڑی باندھتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے:

"بسم الله وعلى ملة رسول الله، اللهم يسّر عليه أمره وسهل عليه مابعده واسعده بلقاءك واجعل ماخرج إليه خيرا مماخرج منه".

اللہ کے نام پر اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر (اس کو حوالہ کرتے ہیں)، اے اللہ! تو اس پر اس کے معاملے کو آسان کر دے اور اس کی آئندہ زندگی کو اس پر سہل و آسان بنا دے اور اس کو اپنی ملاقات کا شرف بخش دے اور اس کے لیے آخرت کو دنیا سے بہتر بنا دے۔

اس کے بعد ہاتھ، انگلیاں، ران اور پنڈلیوں وغیرہ کو نرمی کے ساتھ ایک دو مرتبہ سمیٹ کر واپس دراز کر دیا جائے، تاکہ لکڑی کی طرح خشک اور سیدھے نہ رہ جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ جس کپڑے میں موت آئی ہے، اسے اتار کر اوپر سے کسی دوسرے کپڑے سے سارا جسم چھپا لیا جائے اور اس کی نعش کسی تخت یا چارپائی وغیرہ پر رکھ دی جائے۔ میت کے پیٹ پر کوئی مناسب بھاری چیز رکھنا بھی جائز ہے، تاکہ پیٹ پھول نہ جائے۔ میت کے دونوں ہاتھوں کو اس کے پہلو میں رکھنا مستحب ہے۔ سینہ پر رکھنا اہل کتاب سے مشابہت کی وجہ سے ناجائز ہے۔ مستحب یہ ہے کہ پڑوسیوں اور قرابت داروں کو موت کی اطلاع دی جائے۔ اگر میت عالم زاہد ہو تو بازاروں اور عام مواضع میں موت کا اعلان کرنا بھی جائز ہے بلکہ عام لوگوں کی موت کا اعلان کرنا بھی مستحب ہے، جیسا کہ نجاشی کا جنازہ پڑھاتے وقت آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ اس پر جنازہ پڑھو(۱) تاکہ جنازہ میں لوگ کثرت سے شریک ہو سکیں اور میت سے متعلقہ حقوق اور قرض وغیرہ کا بھی بروقت علم ہو جائے، تاکہ تجہیز و تکفین سے پہلے پہلے حقوق ادا ہو سکیں، تاہم اعلانات کرنے سے میت کی تعریف میں مبالغہ آرائی اور فخر وغیرہ مقصود نہ ہو۔

میت کو دیکھ کر رونا اور غمگین ہونا جائز ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی موت پر غم کے آنسو بہائے تھے، تاہم چیخنا چلانا اور جاہلیت کے نعرے لگانا حرام ہے۔ غسل سے پہلے میت کے قریب تلاوت کرنا مکروہ ہے، تاہم میت سے ذرا دور ہو کر یا میت کو کسی پاک کپڑے سے چھپا کر تلاوت کرنا جائز ہے۔ تسبیح و تہلیل اور

(۱) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب بنيان الكعبة: ۱/ ۵۴۷

دعائیں کرنا بہرصورت جائز ہے۔ اگر مردہ عورت کے پیٹ میں زندہ بچہ ہو تو آپریشن کے ذریعے اس کو نکالنے میں کوئی حرج نہیں۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مختلف طریقوں سے یہ یقین کرانا ضروری ہے کہ واقعی موت واقع ہوگئی ہے یا ابھی روح باقی ہے۔ اگر موت کا یقین ہو جائے تو بلا تاخیر تجہیز و تکفین شروع کرنا مستحب ہے۔(۱)

میت کو غسل دینے کے احکام:

غسل کا حکم شرعی:

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: ''میت کو غسل دینے کا وجوب احادیث مبارکہ، اجماع اور قیاس ہر ایک سے ثابت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جو چھ حقوق بتائے ہیں، ان میں سے ایک غسل دینا بھی ہے، تاہم اس کا وجوب علی الکفایہ ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ غسل دے دیں تو تمام مسلمانوں کی طرف سے ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔ غسل دینا کم از کم ایک بار واجب ہے، اس سے زیادہ یعنی تین مرتبہ تک سنت ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کو صرف ایک مرتبہ غسل دیا گیا یا غسل کی نیت سے ایک بار جاری پانی میں ڈبو دیا گیا تو واجب ادا ہو جائے گا۔ بارش سے بھیگ جانا یا پانی میں ڈوبے ہوئے شخص کو غسل کی نیت سے پانی میں حرکت دیئے بغیر نکالنا غسل نہیں کہلائے گا''۔(۲)

غسل دینے کا مسنون طریقہ:

غسل دینے سے قبل مستحب یہ ہے کہ جس لکڑی، تخت یا اونچے پتھر وغیرہ پر غسل دینا ہو، اس کو طاق مرتبہ خوشبودار چیز سے دھونی دی جائے یا کوئی خوشبو وغیرہ اس پر چھڑکا جائے، پھر جس طرح آسان ہو اسی طریقے سے میت کو تخت پر لٹا دے، تاہم حتی الوسع اس کا رخ قبلہ کی طرف رکھنا بہتر ہے۔ اس کے بعد مستحب یہ ہے کہ جس جگہ میت کو غسل دیا جا رہا ہو، اس کو عام لوگوں کی نظروں سے چھپا دے۔ میت کے کپڑے اتارنے سے پہلے ضروری ہے کہ اولاً کسی

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ الجنازۃ: ۳/۸۲-۸۴، مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی، باب أحکام الجنائز، ص: ۴۶۳-۴۶۶، الفتاوی الھندیۃ، الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل الأول فی المحتضر: ۱/۱۵۷

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلوٰۃ، فصل فی غسل المیت وفصل فی وجوب غسل المیت: ۲/۶-۷،۲۳، الفتاوی الھندیۃ، الفصل الثانی فی الغسل: ۱/۱۵۸

کپڑے کے ذریعے اس کے عورت غلیظہ یعنی شرم گاہوں کو چھپادیا جائے ،ایسا کرنا واجب ہے، البتہ عورتِ خفیفہ، یعنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا مکمل حصہ چھپادینا زیادہ مناسب ہے۔ علامہ شرنبلالیؒ، علامہ زیلعیؒ اور صاحب نہایہ نے اس دوسرے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے بعد میت کے کپڑے اتار دیئے جائیں گے، پھر ہاتھ میں کپڑا لپیٹ کر اعضا غلیظہ کو دھو کر میت کا استنجا کرائے ،تاہم استنجا کراتے وقت میت کے شرم گاہوں یا رانوں وغیرہ کو دیکھنا جائز نہیں ، چاہے مرد ہو یا عورت۔ اس کے بعد میت کے لیے وضو کرائے ،تاہم مضمضہ واستنشاق یعنی منہ اور ناک میں پانی ڈالنے کی بجائے انگلی پر کپڑا لپیٹ کر اس کو پانی سے تر کر کے منہ اور ناک کو اچھی طرح صاف کر دے۔ ایسا کرنا جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں ضروری ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ: ’’بچے اور مجنون کے لیے بھی وضو کرانا بہتر ہے‘‘۔ اس کے بعد چہرہ سے ابتدا کرے، پھر ہاتھ کہنیوں تک دھولے، سر کا مسح بھی کرلے اور پاؤں بھی اسی وقت دھولے۔ وضو میں انہی سنتوں کا خیال رکھے جو زندہ شخص کے لیے مسنون ہیں۔

وضو سے فارغ ہونے کے بعد بیری کے پتوں میں جوش دیئے ہوئے مناسب گرم پانی سے میت کے تمام جسم کو دھولیا جائے۔ سر اور داڑھی کے بالوں کو خطمی یا صابن وغیرہ سے اچھی طرح صاف کیا جائے ،اس کے بعد میت کو بائیں کروٹ پر لٹادیا جائے اور دایاں حصہ نیچے تک دھولیا جائے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف سے سہارا دے کر بٹھایا جائے اور پیٹ دبادیا جائے ،اگر کچھ نجاست نکلے تو دھودی جائے ،تاہم نجاست نکلنے سے وضو یا غسل کا اعادہ لازم نہیں آتا۔ اس کے بعد کسی کپڑے یا تولیہ کے ذریعے تمام بدن کو خشک کر دیا جائے اور حنوط یا کوئی اور خوشبو (جو رنگ والی نہ ہو) اس کے سر اور داڑھی پر لگادی جائے۔ مستحب یہ ہے کہ سجدہ والے اعضا یعنی پیشانی ،ناک، دونوں پاؤں، گھٹنوں اور ہاتھوں پر کافور لگادیا جائے۔ میت کے چہرے، منہ، شرم گاہ، ناک یا کان میں روئی رکھنا بھی جائز ہے۔

میت کے بغل کے بال اکھاڑنا، زیر ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرانا، مونچھیں تراشنا، سر یا داڑھی کے بالوں میں کنگھی کرنا، ناخن تراشنا سب کے سب مکروہِ تحریمی ہیں، البتہ ٹوٹا ہوا ناخن کاٹنا جائز ہے۔

اگر نعش اس قدر پھولی ہو کہ ہاتھ سے ملنا مشکل ہو تو صرف پانی بہانے پر اکتفا کیا جائے گا۔ مذکورہ تمام احکام میں عورت کا حکم بھی مرد کی طرح ہے، البتہ اس کے بالوں کو پیچھے چھوڑنے کی بجائے سینے پر ڈالنا مستحب ہے۔ اسی طرح غسل کے مذکورہ احکام میں بالغ ونابالغ یا محرم وغیر محرم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

حنفیہ کے ہاں وضو اور غسل ہر ایک کے لیے مناسب گرم پانی کا استعمال افضل ہے، چاہے میت پر میل کچیل ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح میت کو تین دفعہ غسل دیتے وقت مستحب یہ ہے کہ پہلی اور دوسری مرتبہ بیری کا پتہ پانی میں ملا کر اور

تیسری مرتبہ کافور ملا کر غسل دیا جائے۔غسل کے دوران ان چیزوں کی رعایت چونکہ روایات سے ثابت ہے، اس لیے اس کی افضلیت بہر حال موجود رہے گی ،تاہم موجودہ دور میں صابن چونکہ کافور اور بیری کے پتوں سے زیادہ پاکی اور خوشبو کا ذریعہ ہے ،اس لیے خالص گرم پانی اور صابن کا استعمال بھی ان چیزوں کا قائم مقام بن سکتا ہے، بلکہ فقہائے کرام نے اس کی صراحت بھی فرمائی ہے۔(۱)

کس قسم کے میت کو غسل دینا واجب ہے؟

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: جس مردے میں درج ذیل شرائط پائی جائیں ،اس کو غسل دینا واجب ہے۔

(۱) ولادت کے بعد زندگی کے آثار پائے جانے کے بعد موت آئی ہو ،لہٰذا جو بچہ ولادت کے بعد حرکت کرے یا چیخ لگائے تو اس کو غسل دینا اور اس پر نماز پڑھنا واجب ہے اور جو بچہ زندگی کے آثار کے بغیر پیدا ہو جائے یا ناقص الخلقت پیدا ہو جائے یا نصف سے زیادہ نکل آئے تو حنفیہ کے مختار قول کے مطابق اس کو غسل دینا اور کفن پہنانا افضل ہے، واجب نہیں ،البتہ نمازِ جنازہ پڑھے بغیر اس کو دفن کر دیا جائے گا۔(۲)

(۲) میت مسلمان ہو تو اس کو غسل دینا واجب ہے ،البتہ اگر کوئی کافر کسی مسلمان شخص کا ذی رحم محرم رشتہ دار ہو اور اس کی موت کے بعد اس کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہو تو ذی رحم محرم مسلمان کے لیے اس کو غسل دینے اور تکفین و تدفین کی اجازت ہے۔ابو طالب کی موت کے وقت نبی کریم ﷺ سے یہی کچھ ثابت ہے ،تاہم مذکورہ غسل اور تکفین و تدفین میں سنتوں کی رعایت نہیں کی جائے گی۔(۳)

(۳) میت عادل ہو ،یعنی باغیوں میں سے نہ ہو۔حنفیہ کے ہاں باغیوں کو غسل دینا یا ان پر نمازِ جنازہ پڑھنا زجراً ممنوع ہے ،تاہم بعض احناف کا قول یہ ہے کہ: غسل دینا بہتر ہے۔قاطع الطریق ،یعنی ڈاکو ،قتل و غارت کے عادی شخص ،جب

(۱) بدائع الصنائع ،کتاب الصلوٰۃ ،فصل في کیفیة غسل المیت: ۲/۳۱۲ ،الدر المختار مع رد المحتار ،کتاب الصلوٰۃ ،باب صلوٰۃ الجنازۃ: ۳/۸۵۔۹۰ ،مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي ،باب أحکام الجنائز ،ص: ۴۶۶۔۴۷۰ ،الفتاویٰ الهندیة ،الباب الحادي والعشرون في الجنائز ،الفصل الثاني في الغسل: ۱/۱۵۸

(۲) بدائع الصنائع ،کتاب الصلوٰۃ ،فصل في شرائط وجوبه: ۲/۳۱۲۔۳۱۴ ،الفتاویٰ الهندیة ،الباب الحادي والعشرون في الجنائز ،الفصل الثاني في الغسل: ۱/۱۵۹

(۳) بدائع الصنائع ،کتاب الصلوٰۃ ،فصل في شرائط وجوبه: ۲/۳۱۴ ،۳۱۵ ،الفتاویٰ الهندیة ،الباب الحادي والعشرون في الجنائز ،الفصل الثاني في الغسل: ۱/۱۶۰

ان کو لڑتے ہوئے قتل کر دیا جائے، اگر یہ لوگ اسلحہ ڈال دیں یا قاضی کے حکم سے ان پر سزائے موت جاری ہو جائے تو ان صورتوں میں ان کا حکم عام مسلمانوں جیسا ہوگا۔(۱)

(۴) غسل کے لیے کافی پانی موجود ہو۔ اگر پانی نہ ہو تو ایسی صورت میں غسل واجب نہیں، بلکہ تیمم واجب ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ: ''تیمم کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد اگر پانی مل جائے تو میت کو غسل دے کر دوبارہ نماز پڑھی جائے گی''، تاہم اس کا دوسرا قول صرف غسل لوٹانے کا ہے۔(۲)

(۵) میت شہید نہ ہو اس لیے کہ شہید کو غسل نہ دینا نص سے ثابت ہے۔ امام محمدؒ کے ہاں جس شخص کو ظلماً یا جبراً قتل کر دیا جائے تو اس کو بھی غسل نہیں دیا جائے گا، بلکہ صرف اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔(۳)

(۶) میت خنثیٰ مشکل نہ ہو اس لیے کہ اس کے مرد یا عورت ہونے میں شک کی وجہ سے اس کو غسل دینا نہ مرد کے لیے جائز ہے اور نہ عورت کے لیے، البتہ کپڑوں کے اوپر سے پانی بہانا یا اس کو تیمم کرانا جائز ہے۔(۴)

کون کس کو غسل دے سکتا ہے؟

میت کو غسل دینے کے لیے ایک جنس کا ہونا ضروری ہے، یعنی مرد مرد کو اور عورت عورت کو غسل دے سکتی ہے، تاہم انتہائی چھوٹے بچے (جو شہوت کے قابل نہ ہو) کو عورت بھی غسل دے سکتی ہے اور غیر مشتہاۃ چھوٹی بچی کو مرد بھی غسل دے سکتا ہے۔ مذکورہ احکام میں خصی اور مقطوع الذکر شخص کا حکم مرد کا ہے۔

خلاف الجنس صورت میں بچہ بچی کے علاوہ ایک اور صورت بھی جائز ہے اور وہ ہے عورت کا اپنے شوہر کو غسل دینا، تاہم اس کے لیے شرط یہ ہے کہ عورت شوہر کی موت کے وقت ایسی حالت میں ہو کہ اگر بالفرض شوہر زندہ ہوتا تو اس کے لیے جماع کرنا جائز ہوتا یعنی یا تو مکمل طور پر نکاح میں ہو یا طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو۔ اگر عورت طلاق ثلاثہ یا

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في شرائط وجوبه: ۲/ ۳۱۵-۳۱۷، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ۱/ ۱۵۹

(۲) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۴۶۸، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ۱/ ۱۶۰

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في شرائط وجوبه: ۲/ ۳۱۷

(۴) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۴۶۷، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ۱/ ۱۶۰

طلاقِ بائن کی عدت میں ہو یا وہ شوہر کی زندگی میں مرتد ہو کر اس کی موت کے بعد واپس اسلام لائی ہو یا اس نے شوہر کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد اس (شوہر) کے بیٹے کو اپنے اوپر قدرت دی ہو تو ان تمام صورتوں میں وہ اپنے شوہر کو غسل نہیں دے سکتی۔

شوہر کے لیے کسی بھی صورت میں اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں چاہے، اس کو غسل دینے والی کوئی عورت موجود ہو یا نہ ہو۔(۱)

غسل دینے کے لیے چند اصولی ہدایات اور صورتیں:

اگر کوئی مرد سفر کے دوران مر جائے اور دوسرے مرد بھی موجود ہوں تو اس کے غسل اور تکفین و تدفین کی ذمہ داری مردوں پر ہوگی۔ اگر کوئی بھی مرد نہ ہو، بلکہ تمام عورتیں ہوں اور ان عورتوں میں اس کی بیوی بھی ہو تو مذکورہ تمام ذمہ داریاں اس کی بیوی پر ہوں گی اور عورتیں ہی اس پر نماز پڑھیں گی اور اگر عورتوں میں اس کی بیوی نہ ہو، بلکہ صرف ایک کافر مرد ہو تو یہ عورتیں اس کافر مرد کو غسل کا طریقہ سکھا دیں گی، کافر شخص کی تجہیز و تکفین کے بعد عورتیں اس پر نماز پڑھ لیں گی اور یہ کافر اس کو دفن کر دے گا۔ اگر کوئی کافر شخص بھی نہ ہو، بلکہ تمام اجنبی عورتیں ہوں اور ان میں سے کوئی چھوٹی بچی ہو جو غسل اور تکفین و تدفین کر سکتی ہو تو کافر کی طرح وہ بھی تمام کام سرانجام دے دیں گی، تاہم اگر چھوٹی بچی بھی نہ ہو، بلکہ تمام بالغ عورتیں ہوں تو ایسی صورت میں مرد کو غسل نہیں دیا جائے گا، بلکہ تیمم دیا جائے گا، تاہم اگر ان عورتوں میں ذی رحم محرم بھی ہو تو وہ کسی کپڑے کے بغیر بھی تیمم دے سکتی ہے، جب کہ غیر محرم عورت ہاتھوں کو کپڑے میں لپیٹ کر تیمم دے گی۔ اسی طرح اگر سفر کے دوران کوئی عورت مر جائے تو اصولی طور پر بالترتیب یہی صورتیں ہوں گی، البتہ شوہر کے لیے اپنی بیوی کو غسل دینے کی اجازت نہیں، صرف دیکھنے کی اجازت ہے۔(۲)

غسل دینے والے مرد یا عورت کے لیے آداب:

مستحب یہ ہے کہ غسل دینے والا شخص میت کا قریبی رشتہ دار ہو، اگر کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو یا ہو، لیکن غسل کے

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل فیمن یقوم بالغسل:۲/۳۱۸، ۳۱۹، الفتاوی الهندیة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل:۱/۱۶۰

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل فیمن یقوم بالغسل:۲/۳۱۸-۳۲۲، الفتاوی الهندیة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل:۱/۱۶۰، الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة:۳/۹۰، ۹۱، مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، باب أحکام الجنائز، ص:۴۷۰، ۴۷۱

احکام نہ جانتا ہو تو نیک، دیانت دار اور راز دار لوگ اس کو غسل دے دیں۔ یہ بھی مستحب ہے کہ غسل دینے والا شخص باوضو ہو، تاہم اگر وضو نہ ہو تو بلا کراہت جائز ہے۔ غسل دینے والی عورت اگر حالتِ حیض و نفاس میں ہو یا وہ کافر ہو تو غسل دینا جائز تو ہے، لیکن مکروہ ضرور ہے۔ غسل دینے والے شخص کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ غسل کے احکام جانتا ہو اور میت کے کسی عیب پر مطلع ہو جانے کے بعد اس کو چھپا سکتا ہو، تاہم اگر میت بدعتی ہو تو بدعت کی شناعت ظاہر کرنے کی نیت سے اس عیب کا افشا کرنا جائز ہے۔ غسل دینے والا شخص اگر میت میں کوئی خوبی دیکھے تو اس کو بیان کرنا مستحب ہے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ غسل دینے والا شخص اپنے ساتھ خوشبو رکھے اور غسل کے بدلے کوئی اجرت طلب نہ کرے۔ اگر شہر یا گاؤں میں صرف یہی ایک شخص میت کو غسل دینا جانتا ہو تو اس کے لیے اجرت لینا جائز نہیں، اس لیے کہ ایسی صورت میں خاص اس پر غسل دینا واجب ہے۔(۱)

مشتبہ حالت والی میت کو غسل دینے اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم:

اگر کسی جنگ وغیرہ میں مسلمان اور کافر ایک ساتھ مر جائیں تو جن نعشوں پر اسلام کی علامت (ختنہ، زیر ناف بالوں کی صفائی، خضاب، لباس وغیرہ) موجود ہوں تو وہ مسلمانوں کے حکم میں ہوں گے اور اگر سب کی حالت مشتبہ ہو تو پھر اکثریت کا اعتبار ہوگا۔ اگر اکثر مسلمان ہوں تو غسل، تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ کے جواز میں تمام نعشیں برابر ہیں، لہٰذا سب کو مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے گا، تاہم اگر کثرت کافروں کی ہو تو غسل اور تکفین مسلمانوں کی طرح کی جائے گی، البتہ نہ ان پر نماز پڑھی جائے گی اور نہ ہی ان کو مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے گا۔ اگر مسلمان اور کافر برابر ہوں تو غسل دینے میں تو اتفاق ہے اور نمازِ جنازہ کے بارے میں راجح قول نہ پڑھنے کا ہے، اس لیے کہ مسلمان کا جنازہ چھوڑنا بعض صورتوں (قطع الطریق، بغاوت وغیرہ) میں جائز ہے، لیکن کافر کا جنازہ پڑھنا کسی صورت بھی جائز نہیں۔ دفن کرنے کے بارے میں اقوال مختلف ہیں، تاہم فقیہ ابو جعفر ہندوانیؒ کا قول ہے کہ: "ان کے لیے مسلمانوں اور کافروں کے مقبروں سے الگ کوئی اور مقبرہ مختص کر دیا جائے"۔

اگر دارالاسلام میں کوئی مقتول مل جائے تو حنفیہ کے صحیح قول کے مطابق چاہے اس پر اسلام کی علامت ہو یا نہ ہو، اس کو مسلمان سمجھ کر تکفین و تدفین کا معاملہ کیا جائے گا، تاہم دارالحرب یعنی کافروں کے ملک میں ملنے والی نعش

(۱) الفتاوی الهندیة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ۱/۱۵۹، ۱۶۰، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة، خاتمة: ۳/۵، ۹، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۹ ۶ ۴

پر اسلام کی علامت ضرور دیکھی جائے گی۔(۱)

میت کو کفن دینے کے احکام:

کسی بھی مسلمان کی تجہیز و تکفین تمام مسلمانوں پر واجب کفائی ہے۔کفن کا وجوب حدیث، اجماع اور عقل ہر ایک سے ثابت ہے۔امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ: عورت کی تکفین بہر صورت شوہر پر واجب ہے، اگر چہ مرنے والی عورت بذاتِ خود مال دار ہو اور اس کا شوہر تنگ دست ہو۔ اس کے برعکس بیوہ عورت پر اپنے مرنے والے شوہر کی تجہیز و تکفین واجب نہیں، اگر چہ وہ مال دار کیوں نہ ہو۔ مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر متوفی کا اپنا مال موجود ہو تو خود اس کے مال سے تجہیز و تکفین ہوگی اور کفنِ مسنون کی حد تک اخراجات دَین، وصیت اور میراث سب سے مقدم ہوں گے، لیکن اگر اس کا کچھ متروکہ نہ ہو تو ورثا پر بقدرِ میراث کفن واجب ہے، ورثا بھی نہ ہوں تو یہ ذمہ داری بیت المال کی ہوگی اور اگر بیت المال بھی نہ ہو تو تمام مسلمانوں کو یہ ذمہ داری نبھانی ہوگی۔(۲)

کپڑوں کی تعداد کے اعتبار سے کفن کی قسمیں:

کفن کے تین درجات ہیں: کفنِ سنت، کفنِ کفایہ اور کفنِ ضرورت۔

کفنِ سنت مردوں کے لیے تین کپڑے ہیں، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کو بھی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص دو کپڑوں کے بارے میں وصیت کرے تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو تین کپڑوں میں کفن دیا جائے گا، البتہ اگر زیادہ کی وصیت کرے تو تین سے زیادہ کپڑوں میں کفن دینا مکروہ نہیں۔ بلا وصیت بھی پانچ تک کپڑوں کی تعداد بڑھائی جاسکتی ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا تھا۔ان تین کپڑوں میں ایک قمیص ہوگی، جس میں آستین اور گریبان نہیں ہوگا اور گردن سے پاؤں تک کے حصے کو شامل ہوگی، دوسرا کپڑا ازار ہوگا، جو سر سے پاؤں تک کے حصے کو شامل ہوگا، تیسرا کپڑا لفافہ ہے جو اس سے بھی کسی قدر بڑا ہوگا، جس میں سر سے پاؤں تک مردہ کو لپیٹا جاسکے اور اوپر نیچے سے باندھا جاسکے۔

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل فیمن یقوم بالغسیل: ۲/۳۱۶، ۳۱۷، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلوۃ، باب الجنازۃ: ۳/۹۳، ۹۴

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في التکفین وفي کیفیة وجوبه: ۲/۳۲۲، ۳۲۳، وفصل في بیان من یجب علیه الکفن: ۲/۳۳۰، الفتاوی الهندیة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التکفین: ۱/۱۶۱، مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي، باب أحکام الجنائز، ص: ۴۷۲، ۴۷۳

خواتین کے کفن سنت میں ان تین کپڑوں کے علاوہ دو اور کپڑوں کا بھی اضافہ ہے۔ایک خمار (اوڑھنی) جو چہرے اور سر کے حصہ کو چھپادے، دوسرا خرقہ یعنی وہ کپڑا جو سینے سے ران تک یا ناف تک حصہ کو چھپادے۔

کفن کفایہ کفن کی وہ کم سے کم مقدار ہے جو بلا کراہت درست ہوجاتی ہے۔مردوں کے لیے کفن کفایہ دو کپڑے ہیں: ازار اور لفافہ جب کہ عورتوں کے لیے تین کپڑے: خمار، ازار اور لفافہ ہیں۔بلا مجبوری اس سے کم کفن دینا مکروہ ہے۔

کفنِ ضرورت سے مراد وہ کم سے کم کپڑا ہے جس سے متوفی کا جسم چھپ جائے، خواہ جیسا بھی کپڑا ہو، تاہم اگر ایسا کپڑا بھی نہ ملے تو پھر گھاس وغیرہ سے بدن کو چھپا کر اس پر نماز پڑھنی چاہیے۔(۱)

کفن پہنانے کا طریقہ:

کفن پہنانے سے پہلے مستحب یہ ہے کہ کفن کو طاق عدد میں دھونی دی جائے اور خوشبو کا استعمال کیا جائے۔ پہلے لفافہ نیچے بچھادیا جائے، پھر اس کے اوپر ازار بچھایا جائے، اس کے اوپر قمیص، پھر پہلے قمیص پہنائی جائے، پھر ازار اس طرح پہنائی جائے کہ ازار کا بایاں حصہ مردے کے دائیں حصے پر ڈالا جائے، پھر ازار کا دایاں حصہ مردے کے بائیں حصہ پر رکھا جائے یعنی اس طرح ڈالا جائے کہ دائیں جانب کا کپڑا اوپر رہے، پھر اسی طرح لفافہ میں بھی لپیٹ دیا جائے۔ازار اور لفافہ میں لپیٹنے سے پہلے سر اور داڑھی میں حنوط یعنی خوشبو اور سجدہ والی اعضا میں کافور کا استعمال مستحب ہے۔

خواتین کا کفن بھی اسی طرح ہے، تاہم قمیص پہنانے کے بعد عورت کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے سینہ پر قمیص کے اوپر رکھ دیا جائے گا، پھر چہرے اور سر پر خمار (اوڑھنی، دوپٹہ) ڈال دیا جائے گا، پھر ازار لپیٹ دیا جائے گا، ازار کے بعد لفافہ لپیٹ دیا جائے گا اور آخر میں تمام کپڑوں کے اوپر خرقہ یعنی وہ کپڑا لپیٹ دیا جائے گا جو سینہ سے ران تک ہونا چاہیے۔طحطاویؒ فرماتے ہیں کہ: ’’لفافہ سے پہلے خرقہ باندھ لیا جائے اس کے بعد لفافہ لپیٹ دیا جائے‘‘۔(۲)

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في كمية الكفن:۲/۳۲۳_۳۲۶ ، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين:۱/۱۶۰، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي ، باب أحكام الجنائز، ص:۴۷۳_۴۷۷، الدر المختار مع رد المحتار ، كتاب الصلوة، باب الجنازة:۳/۹۵_۹۷

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في كيفية التكفين:۲/۳۲۷_۳۳۰ ، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين:۱/۱۶۱، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي ، باب أحكام الجنائز، ص:۴۷۶

چند اہم مسائل:

(۱) فقہائے کرام کا اصول یہ ہے کہ: مرد وعورت کے لیے دنیا میں جس قسم کا کپڑا پہننا جائز ہو اسی طرح کے کپڑے میں اس کو کفن دینا بھی جائز ہے۔ یہ بات بہتر ہے کہ سفید کپڑے میں کفن دیا جائے۔ مرد کو ایسے کپڑے میں کفن دی جائے گی جس قسم کا قیمتی کپڑا وہ جمعہ اور عیدین کے لیے استعمال کرتا تھا اور عورت کے لیے وہ کپڑا لیا جائے گا جس قسم کا قیمتی کپڑا وہ والدین سے ملاقات کے وقت استعمال کرتی تھی۔ کفن کا پاک وصاف ہونا ضروری ہے، نیا ہونا ضروری نہیں۔(۱)

(۲) میت کو عمامہ پہنانا صحیح تر قول کے مطابق مکروہ ہے، البتہ متأخرین نے علما وفقہا کے لیے عمامہ باندھنے کو مستحسن کہا ہے، جس کا شملہ میت کے چہرے پر ڈال دیا جائے گا۔(۲)

جنازہ اٹھانے کے آداب:

مسنون طریقہ یہ ہے کہ کم از کم چار آدمی جنازہ کے چاروں پائیوں کو تھام کر چلیں۔ اکمالِ سنت کی خاطر ایک شخص اپنے دائیں کندھے پر جنازے کا اگلا حصہ رکھ کر دس قدم چلے، پھر اسی کندھے پر جنازے کا پچھلا حصہ رکھ کر دس قدم چلے، پھر بائیں کندھے پر اگلا حصہ رکھ کر دس قدم چلے اور آخر میں بائیں کندھے پر پچھلا حصہ رکھ کر سنت پوری کرے۔ جگہ کی تنگی یا جنازگاہ کی دوری کے بغیر میت کو کسی سواری پر لے جانا یا چار افراد سے کم کرنا مکروہ ہے، تاہم بچے کو ایک مرد بلا کراہت گود میں بھی لے جاسکتا ہے۔ جنازہ لے جانے میں تیزی مستحب ہے، تاہم اتنی تیزی نہ ہو جس سے میت کا تقدس اور احترام فوت ہو جائے۔ حنفیہ کے ہاں جنازے کے پیچھے چلنا سنت ہے، البتہ چند افراد آگے بھی جاسکتے ہیں۔ جنازہ کے پیچھے عام عورتوں یا رونے والی عورتوں کا چلنا مناسب نہیں۔ راستے پر سے جنازہ گزرتے وقت بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ بلند آواز سے تلاوت یا ذکر کرنا مکروہ ہے۔ جنازہ رکھنے سے پہلے بیٹھ جانا مناسب نہیں۔ جنازہ لے جانے میں سر کا حصہ آگے کی جانب ہونا چاہیے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في صفة الكفن: ۳۲۶/۲، ۳۲۷، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين: ۱۶۱/۱

(۲) الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين: ۱۶۰/۱، الدر المختار مع ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب الجنازة: ۹۵/۳، ۹۶

(۳) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في حمل الجنازة: ۳۳۰/۲-۳۳۵، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون، الفصل الرابع في حمل الجنازة: ۱۶۲/۱، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۴۹۷، ۵۰۱

نمازِ جنازہ کا حکم:

نمازِ جنازہ بالاتفاق فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر کسی آبادی کے کچھ لوگوں نے (باجماعت یا تنہا، مردوں نے یا عورتوں نے) پڑھ لی تو سب کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی اور اگر کسی نے بھی نہ پڑھی تو سب گنہ گار ہوں گے۔ اس کی مشروعیت احادیثِ مبارکہ، اجماع اور قیاس ہر ایک سے ثابت ہے۔(۱)

نمازِ جنازہ کس پر پڑھی جائے؟

نمازِ جنازہ اس میت پر پڑھی جائے جس میں درج ذیل شرائط ہوں۔

(۱) میت مسلمان ہو، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، مذکر ہو یا مؤنث، غلام ہو یا آزاد۔

(۲) پیدائش کے بعد یا پیدائش کے دوران نصف بدن سے زیادہ نکلتے وقت اس میں زندگی پائی گئی ہو۔

(۳) نعش کا اکثر حصہ موجود ہو۔ نصف جسم سے کم حصے پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، البتہ اگر سر بھی موجود ہو اور نصف بدن کے بقدر ہو تو نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

(۴) میت باغی، ڈاکو، فسادی یا اپنے ماں باپ میں سے کسی کو قتل کرنے والا نہ ہو۔

(۵) میت پاک ہو یعنی اس کو غسل یا تیمم دیا گیا ہو، تاہم اگر کوئی شخص غسل اور نمازِ جنازہ کے بغیر دفن کردیا گیا ہو اور نکالنا ممکن نہ ہو تو ضرورت کی وجہ سے قبر پر نماز پڑھی جائے گی۔ میت جس جگہ پڑی ہو، اس جگہ کا پاک ہونا شرط نہیں۔

(۶) میت زمین پر پڑی ہوئی ہو، سواری یا کسی انسان کے گود میں یا گردنوں کے اوپر موجود میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا درست نہیں۔

(۷) میت لوگوں کے سامنے پڑی ہوئی ہو۔

(۸) میت موجود ہو۔ حنفیہ کے ہاں غائبانہ نمازِ جنازہ درست نہیں۔

(۹) میت پر ایک مرتبہ نمازِ جنازہ نہ پڑھی گئی ہو، اگر ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی ہو (چاہے باجماعت ہو یا تنہا) تو قریبی ولی یا سلطان وامام کے بغیر کسی اور کو دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت نہیں۔

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في بيان صلوة الجنازة: ۳۳۶/۲ ، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت: ۱۶۲/۱

(۱۰) امام اور مقتدیوں نے نمازِ جنازہ پڑھنے کی نیت کی ہو، اگر چہ دل ہی میں ہو۔(۱)

مذکورہ شرائط وہ ہیں، جو خاص نمازِ جنازہ کے لیے ہیں۔اس کے علاوہ وہ تمام شرائط جو عام نمازوں کے لیے ضروری ہیں وہ نمازِ جنازہ میں بھی ضروری ہوں گی۔

نمازِ جنازہ کے ارکان:

حنفیہ کے ہاں چار تکبیرات اور قیام نمازِ جنازہ کے ارکان ہیں،لہٰذا کوئی بھی تکبیر چھوڑنے سے یا بلا عذر بیٹھ جانے سے نمازِ جنازہ ادا نہیں ہوگا۔

نمازِ جنازہ پڑھنے کا مسنون طریقہ:

نمازِ جنازہ پڑھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ امام میت (مرد ہو یا عورت) کے سینے کے برابر کھڑا ہو جائے اور تکبیر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائے۔اس کے بعد ثنا پڑھ لے۔حنفیہ کے ہاں ثنا کی جگہ بطورِ دعا سورۃ فاتحہ پڑھنا بھی درست ہے، البتہ قرأت وتلاوت کی نیت سے قرآن پڑھنا درست نہیں۔ثنا پڑھنے کے بعد تکبیر کہے، جس میں ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔اس کے بعد درود پڑھے، اس کے بعد تیسری تکبیر کہے اور میت کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے۔اس سلسلے میں کوئی خاص دعا متعین نہیں، تاہم حضور اکرم ﷺ سے اس موقع پر "اللھم اغفر لحینا ومیتنا ......" والی دعا منقول ہے۔(۲) یہ اس وقت ہے، جب میت بالغ مرد یا عورت ہو، اگر نابالغ لڑکا ہو تو دعائے مغفرت کی بجائے "اللھم اجعلہ لنا فرطا......" والی دعا پڑھ لے اور اگر نابالغ لڑکی ہو تو "اللھم اجعلھا لنا فرطا......" والی دعا پڑھ لے۔چوتھی تکبیر کے بعد کچھ بھی نہ پڑھے، بلکہ فوراً سلام پھیر لے۔سلام پھیرنا واجب ہے۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوۃ، فصل في بيان من يصلي عليه:۲/۳۳۶۔۳۳۹، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت:۱/۱۶۲۔۱۶۴، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص:۴۷۹،۴۸۰

(۲) سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الدعاء للميت:

(۳) الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت:۱/۱۶۴، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص:۴۸۰۔۴۸۳

متفرق مسائل:

(۱) نمازِ جنازہ کے لیے جماعت شرط نہیں، بلکہ تنہا بھی نمازِ جنازہ ادا کی جا سکتی ہے۔(۱)

(۲) نمازِ جنازہ میں صرف تکبیرات جہراً پڑھی جاتی ہیں، بقیہ نماز خفیہ ادا کرنا سنت ہے۔(۲)

(۳) نمازِ جنازہ پڑھانے کا حق امام ابوحنیفہؒ کے ہاں اولاً خلیفہ کو ہے، اس کے بعد شہر کے گورنر یا قاضی کو، اس کے بعد محلے کے امام کو اور اس کے بعد قریبی رشتہ داروں کو۔ رشتہ داروں میں عصبات کی ترتیب پر جنازہ پڑھانے کا حق ملے گا۔ اگر ولی برابر درجے کے ہوں تو عمر کے اعتبار سے جو بڑا ہو اس کو حق حاصل ہوگا۔ امام ابویوسفؒ کے ہاں قریبی رشتہ دار سلطان اور ہر شخص سے زیادہ حق دار ہے۔ عالمگیری نے طرفین کے قول کو مشائخ کے ہاں پسندیدہ قول قرار دیا ہے۔

(۴) اگر کسی شخص نے یہ وصیت کی ہو کہ میرا جنازہ فلاں شخص پڑھائے گا تو اس کی وصیت لازم نہیں، البتہ اس پر عمل کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔(۳)

نمازِ جنازہ کے مفسدات:

نمازِ جنازہ ان تمام اشیاء سے ٹوٹتا ہے، جن سے عام نماز ٹوٹتی ہے، البتہ قابلِ شہوت عورت اگر نمازِ جنازہ میں ساتھ کھڑی ہو جائے تو نمازِ جنازہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح نمازِ جنازہ میں قہقہہ لگانے سے وضو بھی نہیں ٹوٹتا۔(۴)

نمازِ جنازہ پڑھنے کے اوقات:

نمازِ جنازہ کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں، بلکہ دن یا رات کے کسی بھی وقت اس کی ادائیگی درست ہے، البتہ طلوع، غروب اور زوال کے وقت نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، تاہم اگر کوئی پڑھ لے تو اعادہ واجب نہیں۔ ان اوقات میں تدفین مکروہ نہیں۔ فجر یا عصر کی نماز کے بعد بھی نمازِ جنازہ بلا کراہت ادا کی جا سکتی ہے۔(۵)

---

(۱) الفتاوی الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت: ۱/۱۶۲

(۲) الفتاوی الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت: ۱/۱۶۴

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في من له حق الإمامة فيها: ۲/۳۵۰، ۳۵۱، الفتاوی الهندية، الباب الحادي والعشرون، الفصل الخامس في الصلوة على الميت: ۱/۱۶۳، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۴۸۵-۴۸۷

(۴) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في مفسدات صلاة الجنازة: ۲/۳۴۹

(۵) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في مكروهات صلاة الجنازة: ۲/۳۴۹، ۳۵۰

قبر کے احکام:

قبر کے دو طریقے ہیں: شق اور لحد۔ شق سے مراد کھلی ہوئی قبر ہے اور لحد بغلی قبر کو کہتے ہیں، جہاں مکمل قبر کھودنے کے بعد قبلہ کی جانب ایک اور جگہ کھودی جاتی ہے۔ حنفیہ کے ہاں لحد بنانا سنت ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا قبر مبارک بھی لحد والا یعنی بغلی تھا، تاہم اگر زمین نرم اور مرطوب ہو یا لحد کھودنے میں دشواری ہو تو شق کھودی جائے۔ حنفیہ کے ہاں قبر کی مقدار متوسط آدمی کے سینہ تک ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ مقدار کھودنا بھی افضل ہے۔ قبر کی لمبائی میت کی لمبائی کے بقدر اور چوڑائی نصف قد کے برابر ہونی چاہیے۔ بلا عذر تابوت میں مردہ کو دفن کرنا مکروہ ہے، البتہ زمین نرم یا مرطوب ہو تو تابوت کا استعمال بھی جائز ہے۔ عالمگیری وغیرہ نے لکھا ہے کہ تابوت میں دفن کرتے وقت بہتر یہ ہے کہ تابوت میں کچھ خشک مٹی بچھادی جائے، تاکہ لحد کے مشابہہ ہو جائے۔ قبر کو کوہان نما بنانی چاہیے۔ سطح زمین سے قبر کی اونچائی ایک بالشت یا اس سے کچھ زیادہ ہونی چاہیے، اس سے زیادہ نہیں، اس لیے قبر سے جو مٹی نکل آئی ہو اس سے زیادہ ڈالنا مکروہ ہے۔ قبر پر عمارت بنانا، مٹی سے لیپنا اور پختہ کرنا جائز نہیں، تاہم بارش یا روندنے سے بچانے کے لیے یا پہچان کے لیے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے مضبوط کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۱)

مردے کو کسی ایسے مقبرے میں دفن کرنا بہتر ہے، جہاں نیک لوگوں کی قبریں ہوں۔ بلا ضرورت ایک قبر میں ایک سے زیادہ مردے دفن کرنا مکروہ ہے، تاہم سخت ضرورت کے وقت اگر ایسا کرنا پڑے تو ہر دو مردوں کے درمیان کچھ مٹی ڈالنی چاہیے۔ انتہائی پرانی اور بوسیدہ قبروں کو ہموار کر کے ان میں دوبارہ مُردوں کی تدفین جائز ہے۔ (۲)

دفن کے احکام:

غسل اور تکفین کی طرح تدفین بھی تمام مسلمانوں پر فرضِ کفائی ہے۔ حنفیہ کے ہاں سنت یہ ہے کہ میت کو قبلہ کی طرف سے لایا جائے اور قبلہ کی سمت سے قبر میں اتارا جائے۔ مردے کو قبر میں داخل کرتے ہوئے آپ ﷺ یہ دعا فرماتے:

"بسم الله وبالله وعلى ملة رسول الله".

اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے حکم سے ہم اس کو رسول اللہ ﷺ کی ملت پر دفن کرتے ہیں۔

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في سنة الحفر: ۲/۳۵۳، ۳۵٤ ، الفتاوى الهندية ،الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في القبر والتدفين: ۱/۱٦۵، ۱٦٦، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي ، باب أحكام الجنائز، ص: ۵۰۱-۵۰۳

(۲) الفتاوى الهندية ،الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في القبر والتدفين: ۱/۱٦٦، ۱٦۷

یہ دعا ان تمام لوگوں کے لیے پڑھنا سنت ہے، جو قبر کے آس پاس موجود ہوں۔ قبر میں مردے کے ساتھ تدفین کی غرض سے اترنے والے افراد کی کوئی خاص تحدید نہیں، حسب ضرورت کوئی بھی اتر سکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اترنے والے نیک صالح اور قوی ہوں اور ہو سکے تو وہ میت کے قریبی رشتہ دار ہوں۔ کافر یا عورت کے لیے قبر میں اترنا جائز نہیں، اگرچہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ عورتوں کو بھی قبر میں ان کے محرم رشتہ دار اتاریں گے، محرم نہ ہوں تو غیر محرم رشتہ دار اور پڑوس کے عمر رسیدہ نیک لوگ بھی یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ محرم رشتہ داروں کی موجودگی میں شوہر اپنی بیوی کو قبر میں نہ اتارے، البتہ محرم رشتہ دار نہ ہوں تو شوہر کے لیے بھی گنجائش ہے۔ عورتوں کو دفن کرتے وقت قبر پر کپڑے کا ایک پردہ کرنا چاہیے، تاکہ بے ستری نہ ہو۔ قبر میں رکھنے کے بعد مردہ کو دائیں کروٹ لٹانا یا اس کو کسی قدر قبلہ رخ کر دینا چاہیے۔ بعض حنفیہ نے اس کو واجب کہا ہے یہاں تک کہ تختے برابر کرنے کے بعد یاد آئے کہ اس کا رخ قبلہ کی طرف نہیں تھا تو تختے دوبارہ کھول دیے جائیں گے، تاہم مٹی ڈالنے کے بعد قبر کھولنا جائز نہیں۔ قبلہ رخ کرنے کے بعد کفن کے تمام بندھن اور گرہیں کھول دینا چاہییں۔ مردے کو مٹی سے بچانے کے لیے قبر پر بانس کی لکڑیاں اور مٹی یا پتھر کی سلیں رکھ دی جائیں۔ بلا ضرورت آگ سے پکائی گئی اینٹیں اور لکڑی کے عام تختے رکھنا مناسب نہیں۔ تختے برابر کرنے کے بعد سنت یہ ہے کہ ہر شخص میت کے سر کی جانب سے آکر تین لپ مٹی قبر میں ڈال دے۔ پہلی لپ ڈالتے وقت "منها خلقنكم" دوسری لپ ڈالتے وقت "وفيها نعيدكم" اور تیسری لپ ڈالتے وقت "ومنها نخرجكم تارة اخرىٰ" پڑھنا مستحب ہے۔ قبر تیار کرنے کے بعد اس پر پانی چھڑکنا یا حفاظت کے لیے لکڑیاں یا شاخیں وغیرہ رکھنا بھی جائز ہے۔ تدفین کے بعد تھوڑی دیر قبر پر ٹھہرنا اور مردہ کے لیے استغفار کرنا مستحب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ وہ سورۃ بقرۃ کی ابتدائی اور اختتامی آیات پڑھنے کو پسند فرماتے تھے۔ (۱)

شہید کے احکام:

حنفیہ کے ہاں شہید دنیوی احکام کے اعتبار سے تمام احکام میں عام مُردوں کی طرح ہے، البتہ دو چیزوں میں شہید کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في سنة الحفر: ۲/ ۳۵۵۔۳۵۹، الفتاوى الهندية، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في القبر والتدفين: ۱/ ۱۶۶، ۱۶۷، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، باب أحكام الجنائز، ص: ۶۰۲، ۶۰۵، الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة: ۳/ ۱۳۸۔۱۴۴

(۱) شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا۔

(۲) شہدا کو اپنے ان کپڑوں میں دفن کیا جائے گا جن میں ان کو شہادت نصیب ہوئی ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے "زملوھم بکلومھم و دمائھم و ثیابھم" کہ شہدا کو ان کے زخموں، خون اور کپڑوں سمیت دفن کرو، البتہ کپڑوں کے علاوہ اشیا، یعنی اسلحہ، پوستین، پگڑی، ٹوپی وغیرہ اتارے جائیں گے۔ ان دو احکام کے علاوہ بقیہ احکام، یعنی نمازِ جنازہ اور تدفین وغیرہ میں عام مُردوں اور شہدا کا حکم بالکل یکساں اور برابر ہے۔

ملاحظہ:

ملک العلما علامہ کاسانیؒ نے شہید کی تعریف، شہادت کی شرائط اور شہید کے احکام پر کافی دلچسپ اور سیر حاصل بحث کرنے کے بعد آخر میں شہید کے دنیاوی احکام بیان فرمائے ہیں، جن میں سے ایک شہید کو غسل دینے کا مسئلہ بھی ہے۔ احناف کے ہاں شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا اور جنازہ پڑھایا جائے گا جبکہ دیگر ائمہ کے ہاں شہید کو غسل دیا جائے گا جیسا کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: شہید کو غسل دیا جائے گا کیونکہ یہ بنی آدم کی شرافت ہے اور شہید اس شرافت کا زیادہ حق دار ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میت کی پاکی واجب ہے، کیونکہ نمازِ جنازہ اس وقت تک درست نہیں، جب تک اُس کو غسل نہ دیا جائے اور چونکہ شہید کی نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے، اس لیے اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور جنگِ اُحد میں شہدا کو اس لیے غسل نہیں دیا گیا کہ اکثر صحابہؓ زخمی تھے۔

احناف کی دلیل وہ حدیث مبارک ہے، جو آپ ﷺ نے جنگِ اُحد کے موقع پر شہدا کے بارے میں فرمایا تھا کہ: "زملوھم بکلومھم و دمائھم و ثیابھم" کہ شہدا کو ان کے زخموں، خون اور کپڑوں سمیت دفن کرو، لہٰذا اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا اور غسل نہ دینا اس کی شرافت کی وجہ سے ہے، موت کی نجاست شہادت کی وجہ سے ان میں سرایت نہیں کرتی، جیسے کہ اُحد کے شہدا تھے۔

جنگِ اُحد کے شہدا کو غسل نہ دینا اس وجہ سے نہیں تھا کہ کوئی غسل دینے والا نہیں تھا اور اکثر صحابہؓ زخمی تھے، بلکہ یہ خالصتاً شرافت کی وجہ سے آپ ﷺ نے غسل نہ دینے کا حکم فرمایا تھا، ورنہ ان زخموں کی حالت میں قبر کھودنا اور اس میں شہدا کو دفن کرنا تو غسل سے بھی سخت کام تھے، جب وہ کر سکتے تھے تو وہ غسل بھی دے سکتے تھے۔ (۱)

❁❁❁❁❁

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصلوة، فصل في حكم الشهادة في الدنيا: ۲/۳۶۷، ۳۶۸

فصل في غسل الميت

(میت کو غسل دینے کا بیان)

میت کے غسل کی اہمیت

سوال نمبر(147):

اسلامی تعلیمات کی رُو سے مردے کو غسل دینے کی کیا اہمیت ہے؟ احادیث اور فقہ کی روشنی میں باحوالہ جواب سے مستفید فرمایئے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق :

احادیثِ مبارکہ میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جہاں دوسرے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں مرنے کے بعد اس کو غسل دینے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ احادیث کے علاوہ امت کا بھی اس بات پر اجماع ہے اور آدم علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد تمام مسلمانوں کا تعامل بھی یہی چلا آ رہا ہے۔

نیز حالتِ نزع کی بے ہوشی اور سختیوں کی وجہ سے طہارت کیونکر برقرار رہ سکتی ہے۔ چنانچہ عقل بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ میت کو ناپاکی کی حالت میں غسل دیئے بغیر نہ دفنایا جائے۔

والدليل علىٰ ذلك :

عن أم عطية الأنصارية ؓ قالت:دخل علينارسول اللهﷺ حين توفيت ابنته فقال: "اغسلنها ثلاثا، أو خمسا،أو أكثرمن ذلك إن رأيتن ذلك .....الخ".قال العلامة ابن حجر العسقلانيؒ في فتح الباري تحت هذا الحديث وترجمته قوله: "باب غسل الميت ووضوئه "أي بيان حكمه،وقد نقل النووي الإجماع علىٰ أن غسل الميت فرض كفاية.(١)

ترجمہ:

حضرت ام عطیہ الانصاریہؓ سے روایت ہے کہ: جب آپ ﷺ کی بیٹی وفات ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے

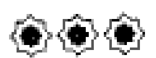
(١)ابن حجر العسقلاني،حافظ أحمد بن علي،فتح الباري،كتاب الجنائز،رقم الحديث(١٢٥٣): ٣/٤٦٤

ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ: ''اس کو تین یا پانچ مرتبہ غسل دیدو (یعنی اتنی مرتبہ پانی ڈالو) اور اگر مناسب ہو تو اس سے بھی زیادہ کرو''۔ اس باب اور اس حدیث کے تحت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: ''امام نوویؒ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے''۔

وقال الإمام الكاسانيؒ: الدليل على وجوبه النص، والإجماع، والمعقول. أما النص: فروي عن النبي ﷺ أنه قال: "للمسلم على المسلم ست حقوق" وذكر من جملتها: "أن يغسله بعد موته" و"على" كلمة إيجاب وروي أنه لما توفي آدم صلواة الله عليه غسلته الملئكة، ثم قالت: لولده هذه سنّة موناكم. والسنة المطلقة في معنى الواجب، وكذا الناس توارثوا ذلك من لدن آدم عليه السلام إلى يومنا هذا، فكان تاركه مسيئا لتركه السنة المتوارثة، والإجماع منعقد على وجوبه، وكذا المعقول. (١)

ترجمہ:

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں: میت کا غسل واجب ہونے پر نص، اجماع اور قیاس (سب) دال ہیں۔ نص تو یہ ہے کہ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں اور من جملہ ان میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ ''فوتگی کے بعد اسے غسل دے'' اور کلمۂ علی اس کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ: جب آدمؑ اس دنیا سے رحلت کر گئے تو فرشتوں نے اسے غسل دے کر آپؑ کی اولاد کو بتایا کہ یہ تمہارے مردوں (کو غسل دینے) کا طریقہ ہے اور سنتِ مطلقہ واجب کے معنی میں ہے، اس طرح آدمؑ کی اولاد میں آج تک یہ عمل جاری ہے۔ پس اس کا چھوڑنے والا سنتِ متوارثہ کو چھوڑنے کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔ نیز اس کے وجوب پر اجماع بھی منعقد ہے اور قیاس بھی (اس کا تقاضہ کرتا ہے)۔



ریزہ شدہ میت کا غسل

سوال نمبر (148):

اگر میت کا جسم ریزہ ریزہ ہو جائے تو اس کے غسل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

(١) بدائع الصنائع، كتاب الصلوة، فصل في غسل الميت: ٢/ ٣٠٦

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر میت کے جسم کا نصف حصہ بمع سر موجود ہو یا سر کے بغیر اکثر حصہ موجود ہو تو اس صورت میں غسل دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی ،لیکن اگر نصف حصہ موجود ہو اور سر نہ ہو یا اکثر حصہ موجود نہ ہو اور سر ہو تو پھر غسل اور نماز دونوں ساقط ہوں گے۔اگر میت کے جسم کو غسل میں چھونا مشکل ہو، مثلاً پھٹ گیا ہو تو پھر صرف پانی بہا دینا کافی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(إذا وجد أكثر البدن، أو نصفه مع الرأس غسل وصلي عليه وإلالا) قال الطحطاوي: قيد به؛ لأنه لو وجد النصف بدون الرأس لا يغسل، ولا يصلى عليه، بل يد فن.(١)

ترجمہ:

اگر اکثر جسم یا نصف جسم سر سمیت مل جائے تو غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نماز بھی پڑھائی جائے گی، ورنہ نہیں۔علامہ طحطاوی فرماتے ہیں کہ" سر مل جانے کے ساتھ حکم مقید کیا گیا، اس لیے کہ اگر نصف جسم بغیر سر کے مل جائے تو غسل اور نماز دونوں ساقط ہو کر یوں ہی دفن کیا جائے گا۔

والمتنفخ الذي تعذر مسه يصب عليه الماء.(٢)

ترجمہ:

اور نعش ایسی پھولی ہو کہ اس کو چھونا مشکل ہو تو اس پر پانی بہایا جائے گا۔

❁❁❁

متاثرہ جسم والے میت کو غسل دینا

سوال نمبر(149):

میت کا جسم ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بری طرح متاثرہ ہو گیا ہو یا میت کی نعش جل جائے یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے گل سڑ جائے اور غسل دینے سے میت کے جسم کے مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس میت کو کس طرح غسل دیا جائے گا؟

---

(١) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الصلوة، باب أحكام الجنائز: ص ٤٧٣

(٢) أيضاً: ص ٤٦٩

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کہیں مسلمان فوت ہوجائے تو اس کو غسل دینا واجب ہے، لہٰذا میت کو مسنون طریقے سے غسل دینے کے بعد کفن پہنایا جائے گا، تاہم جہاں کہیں میت پھول گیا ہو یا میت کی نعش جل جائے یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے پھول جائے یا پھٹ جائے اور اسے چھوکر اور ہاتھ پھیر کر غسل دینا مشکل ہو اور مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو صرف میت کے بدن پر پانی بہانا کافی ہے اور اگر میت کے بدن کو پانی سے بھی سخت نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو جوجگہ پانی کے بہاؤ کے لیے صحیح ہو، اس پر پانی بہایا جائے اور جوجگہ صحیح نہ ہو، اس پر مسح کیا جائے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي الفتاوى العتابية:لو كان الميت متفسخاً يتعذرمسه كفيٰ صبّ الماء عليه.(١)

ترجمہ:

اگر میت کا جسم پھٹ گیا ہو اور ہاتھ لگانا مشکل ہو تو پانی بہایا جائے۔

❁❁❁

دریا میں غرق ہونے والے کو غسل دینا

سوال نمبر(150):

ایک آدمی کی نعش پانی میں کئی دن گزارنے کی وجہ سے بوسیدہ ہوجائے تو اس کو غسل دینے کا کیا طریقہ ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعت کی رُو سے ہر مسلمان میت کو غسل دینا اور اس پر نماز جنازہ پڑھنا فرض ہے۔البتہ اگر میت کو دریا سے نکالا جائے تو نکالتے وقت میت کو غسل دینے کی نیت سے تین غوطے دیئے جائیں۔اگر میت کا جسم خراب ہو چکا ہو اور غسل دینا ممکن نہ ہو تو اس پر صرف پانی بہانا کافی ہے۔

---

(١)الفتاوى التاتارخانية،كتاب الصلوة،الباب الثاني والثلاثون في الجنائز،قسم آخرفي بيان كيفية الغسل:٢/١٠٤

والدّلیل علیٰ ذلك:

المیّت إذا وجد في الماء، لا بدّ من غسله؛ لأنّ الخطاب بالغسل توجّه علی بني آدم، ولم یوجد من بني آدم فعل إلّا أن یحرّکه في الماء بنیة الغسل عند الإخراج ،ولو کان المیّت متفسّخاً یتعذّر مسه کفی صبّ الماء علیه۔(۱)

ترجمہ:

میت اگر پانی میں مل جائے تو اس کو غسل دینا فرض ہے، اس لیے کہ شریعت میں میت کو غسل دینے کا حکم بنی آدم کو ہے اور بنی آدم سے غسل دینا نہیں پایا گیا الا یہ کہ اگر میت کو پانی سے نکالتے وقت غسل کی نیت سے ہلا لیں تو پھر دوبارہ غسل دینا ضروری نہیں ۔اگر میت پانی میں گل سڑ گیا ہو اور اس کو ملنا مشکل ہو تو اس پر پانی بہانا کافی ہے۔

❁❁❁

نابالغ بچوں کو غسل دینا

سوال نمبر(151):

جب کوئی بچہ یا بچی مرجائے تو اس کو غسل دینے میں کونسی صورت اختیار کی جائے ،مرد اور عورت دونوں غسل دے سکتے ہیں یا یہ ضروری ہے کہ بچے کو مرد اور بچی کو عورت ہی غسل دے گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

دین اسلام نے جس طرح زندگی میں بنی آدم کی عزت وتوقیر کا لحاظ رکھا ہے۔اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کو عزت کے ساتھ قبر کے حوالہ کرنے کے احکام وضع کیے ہیں۔چنانچہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ جب کوئی مسلمان مرجائے تو اس کو غسل دے کر کفن پہنایا جائے، پھر احترام کے ساتھ قبرستان لے جاکر اُس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد دفن کردیا جائے۔

غسل کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ اگر میت مرد کی ہو تو مرد اُس کو غسل دے اور اگر عورت کی ہو تو عورت اس کو غسل دے اور اگر میت ایسے بچے یا بچی کی ہو جو شہوت کی حد تک نہ پہنچے ہوں تو مرد یا عورت دونوں اس کو غسل دے

(۱)الفتاوی الھندیة،کتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز ، الفصل الثاني في الغسل : ۱/۱۵۸

سکتے ہیں، البتہ بہتر یہی ہے کہ لڑکے کو مرد اور لڑکی کو عورت غُسل دے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ویغسل الرجال الرجال، والنساء النساء، ولا یغسل أحدهما الأخر، فإن کان المیّت صغیراً لا یشتهي جازأن یغسله النساء وکذا إذا کانت صغیرة لا تشتهي جاز للرجال غسلها.(۱)

ترجمہ:

مرد، مردوں کو اور عورتیں، عورتوں کو غسل دیں۔ مرد عورتوں کو اور عورت مردوں کو غسل نہ دیں۔ اگر میت ایسے چھوٹے بچے کی ہو، جس کی طرف شہوت پیدا نہ ہوتی ہو تو عورتوں کے لیے اس کو غسل دینا جائز ہے، اسی طرح اگر میت اتنی چھوٹی لڑکی کی ہو کہ جس کو خواہش نہ ہوتی ہو تو مردوں کے لیے اسے غسل دینا جائز ہے۔

❁❁❁

عورت کا نومولود بچے کو غسل دینا

سوال نمبر(152):

اگر نومولود بچہ چند گھنٹے زندہ رہنے کے بعد فوت ہو جائے تو کیا عورت اس کو غسل دے سکتی ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے اگر کوئی بچہ یا بچی نومولود ہو یا چند سال کی ہو، لیکن حدِ شہوت کو نہ پہنچی ہو، اس حالت میں فوت ہو جائے تو مرد، بلکہ عورت کے لیے بھی اس کو غسل دینا جائز ہے۔

والدلیل علیٰ ذلك:

الصغیر والصغیرة إذالم یبلغا حدّ الشهوة، یغسلهما الرجال والنساء.(۲)

ترجمہ:

چھوٹا بچہ یا بچی جب حدِ شہوت کو نہ پہنچے ہوں تو مرد اور عورت اس کو غسل دے سکتے ہیں۔

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ۱/ ۱۶۰

(۲) رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب: في حدیث "کلّ سبب ......": ۳/ ۹۵

مردے کو غسل اور کفن دیے بغیر دفن کرنا

سوال نمبر(153):

ایک آدمی کی نعش ملی تھی جس پر تقریباً تین دن گزرے تھے اور کتوں نے نعش کو چیر پھاڑ دیا تھا اور گرمی کی وجہ سے اس سے بدبو بھی آرہی تھی، لوگوں نے اس کو غسل اور کفن دیے بغیر دفنایا تو لوگوں کا یہ فعل شرعاً کیسا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اگر ایک مسلمان کے جسم کا اکثر حصہ موجود ہو تو اس کو غسل دیا جائے گا اور کفن پہنا کر اس کو دفن کیا جائے گا۔

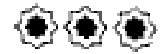
مذکورہ صورت میں مردے کو بغیر غسل اور کفن کے دفنانا ایک غیر مستحسن عمل ہے، جو مسلمان کی حق تلفی کے مترادف ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال علاء الدين الكاسانيؒ: ذكر القاضيؒ في شرحه "المختصر الطحاوي" أنه إذا وجد النصف ومعه الرأس يغسل، وإن لم يكن معه الرأس لا يغسل فكأنه جعله مع الرأس في حكم الأكثر؛ لكونه معظم البدن. (١)

ترجمہ:

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: قاضی نے شرح الطحاوی میں ذکر کیا ہے کہ: ''جب بدن کا نصف حصہ پایا جائے اور اس کے ساتھ سر بھی ہو تو اس کو غسل دیا جائے گا اور اگر اس کے ساتھ سر نہ ہو تو اس کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ گویا انہوں نے نصف بدن کے ساتھ سر کی موجودگی کو اکثر بدن کے حکم میں کر دیا، کیوں کہ سر بدن کا اعلیٰ جز ہے۔



(١) بدائع الصنائع، كتاب الصلوٰة، باب في صلاة الجنازة، فصل في شرائط وجوبه: ٢/٣١٣

نعش کے بعض حصے کو غسل دینا

سوال نمبر (154):

اگر کسی حادثے میں میت ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے اور اس کا پورا بدن نہ ملے تو بعض اعضا پائے جانے کے بعد اس کو غسل دینے کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق :

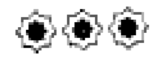
اگر میت کی نعش کا اکثر حصہ موجود ہو، اگر چہ اس کا سر نہ ہو یا نصف بدن سر کے ساتھ موجود ہو تو دونوں صورتوں میں اس کو غسل دیا جائے گا اور اگر نصف سے کم ہو یا نصف موجود ہو، لیکن اس کا سر نہ ہو تو اس صورت میں نہ غسل ہے اور نہ ہی نماز جنازہ، بلکہ اس کو اسی طرح دفنا دینا چاہیے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولو وجد أکثر البدن، أو نصفه مع الرأس یغسل، ویکفن، ویصلیٰ علیه...... وإن وجد نصفه من غیر الرأس أو وجد نصفه مشقوقا طولا، فإنه لایغسل ولایصلیٰ علیه، ویلف في خرقة ویدفن فیها. (۱)

ترجمہ:

اگر بدن کا اکثر یا نصف حصہ سر سمیت پایا جائے تو اسے غسل دیا جائے گا اور کفن بھی دیا جائے گا اور اس پر نماز بھی پڑھی جائے گی ۔۔۔۔ اور اگر نصف بدن سر کے بغیر مل جائے یا نصف بدن لمبائی میں چیرا ہوا مل جائے تو اس کو غسل نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اس پر نماز پڑھی جائے گی، (بلکہ) اس کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر اسی میں دفن کیا جائے گا۔



(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل المیت: ۱/۱۵۹

میت کو غسل دینا

سوال نمبر(155):

ایک شخص نے غسل کیا، غسل خانہ سے نکلنے کے فوراً بعد مرگیا تو کیا اس کو دوبارہ غسل دیا جائے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زندہ لوگوں پر میت کے دوسرے حقوق کے علاوہ غسل دینا بھی ہے، البتہ میت کو غسل حدث کی وجہ سے نہیں، بلکہ موت کی نجاست کی وجہ سے دیا جاتا ہے، کیوں کہ آدمی کے اندر حیوانات کی طرح بہنے والا خون ہوتا ہے، موت کی وجہ سے وہ نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے، لہٰذا اگر میت نے مرنے سے پہلے غسل کیا بھی ہو، تب بھی مرنے کے بعد دوبارہ غسل دینا فرض ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

غسل الميت ف[illegible] بالاجماع......وجب غسله لنجاسة الموت لابسبب الحدث؛لأن للآدمي [illegible] كحيوانات [illegible] منجس بالموت.(١)

ترجمہ:

میت کو غسل دینا بالاجماع فرض ہے۔۔۔۔میت کو غسل دینا موت کی نجاست کی وجہ سے واجب ہے، حدث کی وجہ سے نہیں، کیوں کہ آدمی کے اندر بھی دوسرے حیوانات کی طرح بہنے والا خون ہوتا ہے، اس لیے موت کی وجہ سے ناپاک ہوجاتا ہے۔

❀❀❀

میت کو دوبارہ غسل دینا

سوال نمبر(156):

ایک میت کو غسل دینے کے بعد دوبارہ غسل دیا گیا۔دوسری مرتبہ غسل دینے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس پر آنسو

(١) العناية على فتح القدير، كتاب الصلوة، باب الجنائز، فصل في الغسل: ٢/ ٦٩

بہائے گئے ہیں۔ میت کو دوبارہ غسل دینا ازروئے شریعت کیسا ہے؟ نیز مرنے کے بعد میت کے ناخن اور بال کاٹنے کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جس طرح زندہ انسان کے ستر والے حصے کو بلاضرورت دیکھنا اور ہاتھ لگانا جائز نہیں، اسی طرح میت کا حکم بھی ہے۔ میت کا غسل فرض ہے اور خود میت اس سے معذور ہے، اس لیے شریعت نے اس مجبوری کے تحت یہ ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی ہے۔ اور فرض ایک بار غسل دینے سے ادا ہو جاتا ہے، اس لیے دوبارہ غسل دینے کی شرعاً اجازت نہیں، البتہ اگر میت کو طویل علالت گزارنے کے باعث زندگی میں نہانے کا موقع نہ ملا ہو تو اسی صورت میں ورثا پہلے اس کی صفائی کریں، پھر مسنون طریقے سے غسل دیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میت کے ناخن اور بال کاٹنا بہرحال جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

غسل المیت حق واجب علی الأحیاء بالسنة وإجماع الأمة ...... فإن خرج منه شيء غسله، ولایعید غسله ولاوضوءه ...... ولا یقص شاربه، ولاینتف إبطه، ولایحلق شعرعانته، ویدفن بجمیع ماکان علیه.(١)

ترجمہ:

میت کو غسل دینا (میت کا) زندہ لوگوں پر سنت اور اجماع سے حق ثابت ہے۔ اگر کوئی چیز (غسل کے بعد) نکل آئے تو اسے دھویا جائے اور دوبارہ غسل دینا، وضو کرانا ضروری نہیں، مونچھ کٹوانا، بغل کے بال اکھاڑنا اور زیرناف بال مونڈنا درست نہیں، بلکہ سب کچھ کے ساتھ دفنایا جائے گا۔

❁❁❁

(١) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل: ١/١٥٨

مرنے کے بعد میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا

سوال نمبر(157):

اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی میں میاں بیوی کے درمیان باہمی تعلقات کو قرآن نے "ھن لباس لکم وأنتم لباس لھن" سے تعبیر کر کے حسی اور فطری رکاوٹیں دور کی ہیں، لیکن کیا مرنے سے یہ نسبت ختم ہو کر میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل نہیں دے سکتے؟ یا مرنے کے بعد بھی اس نسبت سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو غسل دینے کی اجازت ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس کی حیثیت رکھتے ہوئے حسی اور فطری پابندیوں سے آزاد متصور ہوتے ہیں۔ موت کے بعد یہ نسبت باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے میاں بیوی کے احکامات الگ الگ ہیں، چنانچہ بیوی کی یہ نسبت تو ایک خاص مدت یعنی عدت تک قائم رہتی ہے، اس لیے خاوند کی موت کے بعد بھی بیوی غسل دے سکتی ہے، تاہم بیوی کے فوت ہونے کے بعد خاوند کا اس سے رشتہ ازدواج منقطع ہو جاتا ہے، اس لیے وہ بیوی کی موت کے بعد اس کو غسل نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خاوند پر بیوی کی موت کے بعد کوئی عدت نہیں، وہ اس کی جگہ چوتھی بیوی یا میتہ کی بہن سے فوراً نکاح کر سکتا ہے، البتہ موت کے بعد ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے میں کوئی پابندی نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویمنع زوجھا من غسلھا ومسھا لا من النظر إلیھا علی الأصح، وھي لا تمنع من ذلک.(۱)

ترجمہ:

شوہر کو بیوی کے غسل دینے اور ہاتھ لگانے سے منع کیا جائے گا، صحیح قول کے مطابق اس کا چہرہ دیکھنے سے منع نہیں کیا جائے گا۔۔۔۔اور بیوی کو (شوہر کے نہلانے) سے نہیں روکا جائے گا۔

ویغسل الرجال الرجال، والنسآء النسآء ......ویجوز للمرأة أن تغسل زوجھا إذا لم یحدث

---

(۱) تنویر الأبصار مع الدر المختار، کتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة: ۹۰/۳

بعد موته مايوجب البينونة...... وإن حدث ذلك بعدموته لم يجز لهاغسله،وأماهو،فلايغسلهاعندنا.(۱)

ترجمہ:

مرد، مردوں کو اور عورتیں، عورتوں کو غسل دیں گے۔۔۔۔البتہ بیوی کے لیے اپنے شوہر کو غسل دینا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی ایسی بات پیش نہ آئی ہو، جس سے جدائی واقع ہو جاتی ہے۔۔۔۔اور اگر ایسی کوئی بات پیش آئی ہے، (جس کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی آئی ہو) تو بیوی کے لیے بھی اپنے شوہر کو غسل دینا جائز نہیں اور مرد ہمارے نزدیک اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا۔

❁❁❁

شہید کو غسل نہ دینے کی حکمت

سوال نمبر(158):

شہید کے احکام کے متعلق فقہ کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اس کو غسل نہ دیا جائے اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھ کر دفنایا جائے تو غسل نہ دینے میں کیا حکمت ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

شہید کی موت عام لوگوں کی موت سے افضل ہے۔ یہاں تک کہ اس کو مردہ تک کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ شہید کو غسل نہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن باری تعالیٰ کے سامنے اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جو اس کے لیے فضیلت اور ظالم کے خلاف گواہی کا باعث ہوگا، البتہ نمازِ جنازہ پڑھنے میں میت کی کرامت کا ظہور ہوتا ہے اور شہید اس کا زیادہ مستحق ہے اور گناہوں سے پاک ہونا کسی کو دعا سے مستغنی نہیں کرتا۔ اس لیے شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ پڑھا جائے گا۔

والدّليل علىٰ ذلك:

الحكمة في كون دم الشهيد يأتي يوم القيمة على هيئة أنّه يشهد لصاحبه بفضله، وعلى ظالمه

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوٰة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل الثاني في غسل الميت:۱/۱۶۰

بقعوله.(۱)

ترجمہ:

شہید کو خون میں دفن کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ خون قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ شہید کی فضیلت اور ظالم کے ظلم کی گواہی دے گا۔

قال الخطابيؒ: انّ النبي ﷺ قد صلّى على أهل احدٍ بعد مدّة، فدلّ على انّ الشهيد يصلّى عليه كما يصلّى على من مات حتف أنفه.(۲)

ترجمہ:

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے اہل احد کے شہدا پر ایک مدت کے بعد نماز جنازہ پڑھی، یہ بات دلالت کرتی ہے کہ شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جس طرح اپنی موت آپ مرے ہوئے شخص پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

❁❁❁

ناحق قتل کیے گئے شخص کو غسل دینا

سوال نمبر(159):

جو لوگ علاقائی تنازعات مثلاً کھیت وغیرہ پر ناحق قتل کیے جاتے ہیں، یہ لوگ شہدا میں شمار ہوتے ہیں یا نہیں؟ نیز اگر شہید ہوں تو غسل دینے کا کیا حکم ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

شرعی نقطہ نظر سے شہید کا اطلاق ''دُنیوی شہید'' اور ''اُخروی شہید'' دونوں پر ہوتا ہے۔ دُنیوی شہید سے مراد وہ

---

(۱) العيني، بدر الدين محمود بن أحمد، عمدة القاري، كتاب الطهارة، باب مايقع من النجاسات في السمن والماء:۳/۱٦٦

(۲) أيضاً، كتاب الجنائز، باب الصلاة على الشهيد:۸/۱٥٧

ہے جس کو میدانِ جہاد میں کافر قتل کرے یا وہاں مُردہ پایا جائے اور اس کے جسم پر زخم کے آثار ہوں یا ظلماً قتل کیا جائے کہ اس کے قتل پر دیت واجب نہ ہو تو اس کو غسل دیے بغیر کفن دے کر اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے، جبکہ اُخروی شہید کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً کوئی شخص پانی میں غرق ہو جائے یا آگ میں جل جائے، ہیضہ، طاعون وغیرہ سے مر جائے تو یہ شخص بھی اُخروی شہدا میں شمار ہوگا یعنی قیامت میں حشر اور ثواب کے اعتبار سے شہید جیسا معاملہ ہوگا، لہٰذا اس کو عام مؤمنین کی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مقتول نے قاتل کے قتل کے لیے ابتدا نہ کی ہو اور قاتل نے دیدہ ودانستہ طور پر اس کو قتل کیا ہو تو مقتول اپنے اہل وعیال، مال وجان اور عزت کی حفاظت میں مدافعت کرتے ہوئے قتل ہوا ہو تو اس صورت میں وہ حکماً شہید متصور ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذٰلك:

عن أبي سعيد بن زيدؓ عن النبي ﷺ قال: من قُتِل دون ماله فهو شهيد، ومن قُتِل دون أهله فهو شهيد، أو دون دينه فهو شهيد.(۱)

ترجمہ:

سعید بن زیدؓ سے روایت ہے، وہ نبی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ: ''جو کوئی اپنے مال کے دفاع میں مارا گیا، وہ شہید ہے جو اپنے اہل وعیال، اپنے خون اور اپنے دین کے مقابلے میں مارا گیا وہ شہید ہے''۔

❁❁❁

جنبی شخص کا مردے کو غسل دینا

سوال نمبر(160):

اتفاقاً اگر مردے کو کوئی جنبی شخص غسل دیدے تو کیا غسل ہو جائے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

بہتر تو یہ ہے کہ غسل دینے والا پاک ہو، لیکن اگر کہیں جنبی شخص یا حائضہ عورت کسی میت کو غسل دے دے،

(۱) سليمان بن الأشعث السجستاني، سنن أبي داؤد، كتاب السنّة، باب في قتال اللصوص: ۲/ ۳۰۲ ایچ ایم سعید

تو غسل ہو جائے گا، البتہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولو کان الغاسل جنبا، أو حائضا، أو کافرا جاز، ویکرہ.(۱)

ترجمہ: اگر میت کو غسل دینے والا جنبی یا حائضہ عورت ہو یا کافر ہو تو کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

❁❁❁

غسل دینے کے بعد میت کا پیشاب، پاخانہ نکلنا

سوال نمبر(161):

نہلانے اور کفنانے کے بعد اگر میت کا پیشاب، پاخانہ نکلے تو غسل کا اعادہ ضروری ہے یا غلاظت کو دھونا کافی ہے، اگر بغیر دھوئے نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے تو کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

میت کو غسل دینے کے بعد اگر اس کے جسم سے کہیں گندگی نکل آئے تو صرف اس گندگی کو صاف کرنا کافی ہے، غسل کا اعادہ ضروری نہیں اور کفنانے کے بعد گندگی نکلنے کی وجہ سے کفن ناپاک ہو جائے تو وقت اور اپنی سہولت کو دیکھ کر بدن اور کفن دونوں سے نجاست دور کرنا بہتر ہے، البتہ اگر کسی ضرورت کی وجہ سے نجاست دھوئے بغیر نماز جنازہ پڑھی جائے اور میت دفنا دی جائے تو بھی جائز ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

في الدرالمختار:(ویمسح بطنه رفیقا،وما خرج منه یغسله)قال ابن عابدین: أي تنظیفاله ...... لا شرطا ،حتی لوصلی علیه من غیرغسله جاز......وفي الأحکام عن المحیط: یمسح ماسال،ویکفن. وفي کتاب الصلوة للحسن:إذاسال قبل أن یکفن غسل وبعده لا.وفي ردالمحتار: وعن الخزانة إذاتنجس الکفن بنجاسة المیت لایضر دفعاللحرج،بخلاف الکفن المتنجس ابتداءً.(۲)

(۱) الفتاوی الهندیة،کتاب الصلاة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل الثاني في غسل المیت ، ۱۵۹/۱

(۲) الدرالمختارعلی صدرردالمحتار،کتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة: ۸۸/۳،۱۰۳

ترجمہ: (میت کو غسل دیتے وقت) اس کے پیٹ کو نرمی کے ساتھ صاف کرے اور جو کچھ اس سے نکلے اس کو دھوئے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: ''صفائی کی خاطر (دھویا جائے) یہ شرط نہیں، چنانچہ اگر نجاست کو دھوئے بغیر اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے تو جائز ہے۔ احکام میں محیط سے نقل کیا گیا ہے کہ: ''(غسل کے بعد) میت سے جو کچھ نکل کر بہہ جائے بس اسی کو صاف کر کے کفن دیا جائے'' ۔ حسن کی کتاب الصلوۃ میں ہے کہ: کفنانے سے قبل اگر کچھ نکل آئے تو اس کو دھوئے اور کفنانے کے بعد دھونا ضروری نہیں ۔ ردالمحتار میں ہے کہ خزانہ میں ہے کہ: ''اگر کفن میت کی نجاست سے گندا ہو جائے تو یہ (نمازِ جنازہ کی صحت کو کوئی) نقصان نہیں دیتا، بخلاف اس کفن کے جو پہلے سے ناپاک ہو''۔

❁❁❁

میت کو استنجا کرانا

سوال نمبر (162):

میت کو استنجا کرانے میں مٹی کے ڈھیلے استعمال کیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ نیز استنجا کرانے کا طریقہ کیا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

میت کو استنجا کرانے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک استنجا کرانا جائز ہے اور یہ قول راجح معلوم ہوتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ غسل دینے والا اپنے ہاتھ سے کپڑا لپیٹ کر میت کو استنجا کرائے، کپڑے کے بغیر میت کے ستر والے حصہ کو ہاتھ لگانا درست نہیں جس طرح اس کو دیکھنا درست نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ويستنجي عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله، كذا في محيط السرخسي، وصورة استنجائه أن يلف الغاسل على يديه خرقة، ويغسل السوأة؛ لأن مس العورة حرام كالنظر إليها.(١)

ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک استنجا کرایا جائے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ غسل دینے والا ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ کر ستر والے حصہ کی صفائی کرے گا، کیوں کہ ہاتھ لگانا حرام ہے جس طرح اس کی طرف دیکھنا حرام ہے۔

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني: ١٥٨/١

فصل في تجهيز الميت وتكفينه

(میت کی تجہیز وتکفین کا بیان)

کفن تیار کر کے رکھنا

سوال نمبر(163):

اگر کوئی شخص موت سے پہلے ہی اپنی تکفین کے لیے کفن تیار کرلے اور اس میں دفن کرانے کی وصیت بھی کرلے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے موت کو یاد کرنے سے زہد، تقویٰ اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور کفن کی تیاری موت کی یاد کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے، اس لیے اگر کوئی موت سے پہلے اپنی حیات میں کفن تیار کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، تاہم اس کو مستقل رواج دینا درست نہیں، اس لیے کہ تجہیز وتکفین ورثا اور اولیا کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ويحفر قبراً لنفسه، وقيل يكره...... ينبغي أن لا يكره تهيئة نحو الكفن.(١)

ترجمہ:

اپنے لیے قبر کھودنا ایک قول کے مطابق مکروہ ہے۔۔۔۔مناسب یہ ہے کہ قبر تیار کرنا مکروہ نہ ہو، جیسا کہ کفن تیار کرنا مکروہ نہیں ہے۔

❁❁❁

(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة:٣/١٥٤

جنازہ کے لیے میت کو تابوت میں رکھنا

سوال نمبر(164):

عام طور پر میت کو کفن پہنانے کے بعد نمازِ جنازہ کے لیے چار پائی پر رکھا جاتا ہے،لیکن بعض حالات میں تابوت میں رکھا جاتا ہے۔خصوصاً جب میت پر کئی دن گزرے ہوں اور تابوت کے بغیر رکھنے سے اس کی بدبو پھیلنے سے لوگوں کو تکلیف کا خطرہ ہو تو ایسے حالات میں میت کو تابوت میں رکھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جنازہ کی صحت کے لیے میت کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔پھر انسان ہونے کے ناطے اس کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ کفن پہنانے کے بعد باعزت طور پر چار پائی پر رکھ کر نماز پڑھائی جائے۔جہاں تک تابوت میں رکھ کر نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو اگر کسی عذر کی وجہ سے ہو تو جائز ہے اور بغیر عذر کے مکروہ ہے،تاہم اگر تابوت میں بند کر کے نماز پڑھائی ہو تو پھر تابوت کو چار پائی کے اوپر رکھ کر نماز پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(ولا بأس باتخاذ تابوت) أي يرخص ذلك عند الحاجة وإلا كره.(١)

ترجمہ:

ضرورت کے وقت تابوت کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں،یعنی جائز ہے، ورنہ (اگر بلاضرورت ہو تو) مکروہ ہے۔



تدفین میں تابوت کا استعمال

سوال نمبر(165):

جب کوئی شخص بیرون ملک فوت ہو جائے تو اس کو تابوت میں لا کر دفن کیا جاتا ہے،از روئے شریعت میت کو

(١) ردالمحتارعلی الدرالمختار،کتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة،مطلب في دفن الميت:٣/ ١٤٠

تابوت میں رکھ کر دفن کرنا کیسا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہاے کرام کی تصریحات کے مطابق میت کو کفنانے کے بعد چارپائی پر رکھ کر دفنانا زیادہ بہتر ہے،البتہ اگر ضرورت کی وجہ سے میت کو تابوت میں رکھا جائے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

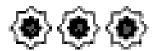
بیرون ممالک میں جو فوت ہو جائے اور اس کی میت منتقل کرانی ہو تو ملکی قانونی مراحل اور طویل سفر طے کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات اس میں کافی وقت بھی لگتا ہے تو میت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اگرچہ شریعت میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔بہتر یہی ہے کہ اس کو وہی دفنایا جائے،لیکن اولیاے میت کو اس سے تسلی حاصل نہیں ہوتی اور وہ منتقل کرنے پر اصرار کرتے ہیں تو ایسی حالت میں میت کو اپنے مقام تک پہنچانے میں تابوت کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے،اس لیے ایسی حالت میں تابوت استعمال کرنا درست ہے۔

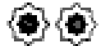
والدّلیل علیٰ ذلك:

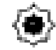
قوله:(ولا بأس باتخاذ تابوت) أي يرخص ذلك عند الحاجة وإلا كره.(١)

ترجمہ:

ضرورت کے وقت تابوت کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں،یعنی جائز ہے،ورنہ (اگر بلا ضرورت ہو تو) مکروہ ہے۔







(١) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ الجنازۃ،مطلب في دفن المیت:۳/۱۴۰

فصل في صلوة الجنازة

(نمازِ جنازہ کا بیان)

نمازِ جنازہ میں امام کی نیت

سوال نمبر(166):

نمازِ جنازہ میں امام کیسی نیت کرے گا؟ اگر نیت کے الفاظ زبان سے ادا کیے بغیر محض دل میں نیت کرے تو یہ کافی ہے یا زبان سے نیت کے الفاظ کی ادائیگی ضروری ہے؟ وضاحت کیجیے۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

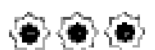
نیت کا محل دل ہے، اس لیے امام یا مقتدی محض دل میں یہ تصور کرلے کہ میں اس میت کا نمازِ جنازہ پڑھتا ہوں تو یہ کافی ہے، زبان سے الفاظ ادا کرنا ضروری نہیں۔ اگر کوئی زبان سے ادا کرنا چاہے تو عربی زبان میں یا غیر عربی زبان میں جس طرح آسان ہو، یوں کہے کہ: ''میں اس فریضہ کو اللہ کی عبادت کی نیت سے کعبہ رُخ ہو کر ادا کر رہا ہوں''، مقتدی صرف امام کی اقتدا کی نیت کا اضافہ کرتے ہوئے، مذکورہ بالا الفاظ کو ادا کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

الإمام والقوم ينوون ويقولون نويت أداء هذه الفريضة عبادة للّٰه تعالىٰ متوجهاًإلى الكعبة مقتدياً بالإمام.(۱)

ترجمہ:

امام اور قوم نیت کریں گے اور کہیں گے کہ میں اس فریضہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سمجھ کر، کعبہ رُخ ہو کر امام کی اقتدا کی نیت کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔



(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلوة على الميت: ۱/ ۱٦٤

نمازِ جنازہ میں نیت کے الفاظ

سوال نمبر(167):

کیا نمازِ جنازہ کے لیے زبانی نیت کرنا ضروری ہے؟ اگر دل میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی نیت ہو اور زبان سے الفاظ ادا نہ کرے تو نمازِ جنازہ درست ہوجائے گی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز چاہے کسی بھی قسم کی ہو پنجگانہ نماز ہو یا نمازِ جنازہ، اس کے لیے نیت شرط ہے، لہٰذا نیت کے بغیر کوئی بھی نماز درست نہیں ہوسکتی۔ فقہاے کرام کی تصریحات کے مطابق نیت سے مراد وہ عزم وارادہ ہے جو دل میں پختگی کے ساتھ موجود ہو۔

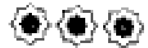
لہٰذا صورتِ مسئولہ کے حوالے سے نمازِ جنازہ کی صحت کے لیے دل میں نیت کرلینا کافی ہوگا۔ زبانی نیت کے الفاظ ادا کرنا ضروری نہیں، لیکن اگر زبان سے نیت کے الفاظ کی ادائیگی سے نماز کے استحضار میں اضافہ ہوتا ہو تو پھر زبان سے بھی کہنا بہتر ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والنية :هي الإرادة،والشرط أن يعلم بقلبه أيّ صلوة يصلي،أماالذكر باللسان فلا معتبر به، و يحسن ذلك لاجتماع عزيمته.(١)

ترجمہ:

نیت سے مراد ارادہ ہے اور شرط یہ ہے کہ جو نماز پڑھی جارہی ہے اس کا دل سے علم ہو، زبان کے ساتھ ذکر کرنے کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ (توجہ جمانے کے لیے) دونوں کو جمع کرنا بہتر ہے۔



(١) الهداية،كتاب الصلوة،باب شروط الصلوة......: ١/ ٩٥

نمازِ جنازہ کی نیت کا طریقہ

سوال نمبر(168):

بعض عربی الفاظ جیسے "نویت ان اودّی للّٰہ تعالی اربع تکبیرات... وغیرہ الفاظ سے لوگ نماز جنازہ کی نیت باندھتے ہیں۔شرعاً ان کا کوئی ثبوت ہے؟نیز نماز جنازہ سے پہلے ان کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ازروے شریعت نمازِ جنازہ کی نیت پر تلفظ کرنے کا ثبوت اگرچہ احادیث سے نہیں ملتا،لیکن فقہاے کرام نے اس پر تلفظ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے جس کے بارے میں فقہاے کرام سے مختلف عبارات منقول ہیں جیسے " اللّٰھم إنّی نویت أن أصلّی لك وأدعو لھذا المیّت" یا" نویت أداء ھذہ الصلوٰۃ" وغیرہ۔

لہٰذا نمازِ جنازہ سے پہلے استحضارِ قلب کے لیے نیت پر تلفظ کرنا ایک امرِ مستحسن ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وفي صلاۃ الجنازۃ ینوي الصلوۃ للّٰہ تعالی والدعاء للمیّت.(۱)

ترجمہ:

اور نمازِ جنازہ میں اللہ کے لیے نماز کی،اور میت کے لیے دُعا کی نیت کرے۔

ومحلھا القلب،والتلفّظ بھا مستحب .(۲)

ترجمہ:

اور نیت کا محل دل ہے،اور اس پر تلفظ کرنا مستحب ہے۔

❁❁❁

(۱) الھندیۃ،کتاب الصلاۃ،الباب الثالث في شروط الصلاۃ،الفصل الرابع فی النیّۃ: ۱/ ٦٦

(۲) البحر الرائق،کتاب الطھارۃ،قولہ(ونیتہ):۱/ ٥٠

نمازِ جنازہ میں قرأت کرنا

سوال نمبر(169):

نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اس میں مسنون دُعا کون سی ہے؟

بيّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے نمازِ جنازہ کے لیے اپنے مخصوص اوراد اور دُعائیں مقرر ہیں۔ جو ثنا، درود اور میت کے لیے مغفرت پر مشتمل ہیں۔ اس میں قرآن کی قرأت نہ کی جائے، کیوں کہ یہ محلِ قرأت نہیں، البتہ اگر کسی نے دُعا کی غرض سے سورہ فاتحہ پڑھی تو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن ماثور دُعائیں پڑھنا افضل ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولايقرأ فيها القران، ولو قرأ الفاتحة بنيّة الدّعاء فلابأس به، وإن قرأها بنيّة القراء ة لا يجوزلأنهامحل الدعاء دون القرأة.(۱)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ میں قرآن مجید کی قرأت نہ کرے اور اگر کوئی شخص دعا کی نیت سے سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ قرأت کی نیت سے پڑھ لے تو جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ نمازِ جنازہ دعا کا محل ہے (نہ کہ قرأت کا)۔

وعن رسول الله ﷺ كان يقول: اللّٰهمّ اغفر لحيّنا، و ميّتنا، وشاهدنا، وغائبنا، وصغيرنا، وكبيرنا، وذكرنا، وانثنا اللّٰهمّ من أحييته منّا فأحييه على الإسلام ،ومن توفيته منّا فتوفّه على الإيمان...... هذا إذاكان يحسن ذلك، فإن كان لايحسن يأتي أيّ دُعاءٍ شاء (۲)

ترجمہ:

آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ یہ دُعا پڑھا کرتے تھے کہ: اے اللہ ہمارے زندوں، مُردوں، حاضر، غائب، چھوٹے، بڑے، نر، مادہ سب کو بخش دیجئے۔ اے اللہ تم ہم میں سے جس کو زندہ رکھے تو اسلام کی حالت پر

(۱) الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت: ۱۶۴/۱

(۲) أيضا الفتاوى الهندية: ۱۶۴/۱

زندہ رکھ، اور ہم میں سے جس کو وفات دے تو ایمان کی حالت میں اس کو وفات ہو۔ یہ (مذکورہ دُعا پڑھنے کا حکم) اس صورت میں ہے کہ وہ ان دُعاؤں کو اچھی طرح پڑھ سکے اور اگر مذکورہ دُعائیں اچھی طرح نہ پڑھ سکے تو جو بھی دُعا چاہے پڑھ لے۔

❁❁❁

نمازِ جنازہ میں چار سے زائد تکبیرات

سوال نمبر(170):

نمازِ جنازہ میں اگر امام چوتھی تکبیر کہنے کے بعد سلام پھیرنے کی بجائے پانچویں تکبیر کہے تو مقتدی کیا کرے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نمازِ جنازہ میں چار سے زائد تکبیرات کہنا درست نہیں۔ اگر امام غلطی سے پانچویں تکبیر کہہ دے تو مقتدی پر اس کی اقتدا واجب نہیں، بلکہ انتظار کرے۔ جب امام سلام پھیرے تو مقتدی بھی سلام پھیرے۔ یہی مفتیٰ بہ قول ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولو كبر إمامه خمسا لم يتبع)؛لأنه منسوخ (فيمكث المؤتم، حتى يسلم معه إذا سلم)به يفتي.(۱)

ترجمہ:

اگر امام نے پانچویں تکبیر کہہ دی تو مقتدی اتباع نہ کرے، کیونکہ یہ منسوخ ہے، بلکہ انتظار کرے، جب وہ سلام پھیرے تو یہ بھی سلام پھیرے۔ اسی پر فتویٰ ہے۔

❁❁❁

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ:۳/۱۱۲

نمازِ جنازہ دوبارہ ادا کرنا

سوال نمبر(171):

بعض اولیا کے نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد جب میت دفنائی جائے تو کیا دوسرے اولیا دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھا سکتے ہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ایک مرتبہ جب ولی کی اجازت سے میت کی نماز جنازہ پڑھائی جائے تو دوبارہ پڑھانے کی اجازت نہیں، کیوں کہ پہلی بار پڑھانے سے فرض ادا ہو گیا اور نفل نمازِ جنازہ پڑھانا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وإن صلی الولي لم یجز لأحد أن یصلي بعده)؛ لأن الفرض یتأدی بالأول والنفل بھا غیر مشروع.(۱)

ترجمہ: اگر ولی نے نمازِ جنازہ پڑھائی تو اس کے بعد دوبارہ پڑھانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں، کیوں کہ پہلی نماز سے فرض ادا ہو گیا اور نفلی جنازہ جائز نہیں۔



نمازِ جنازہ بیٹھ کر پڑھنا

سوال نمبر(172):

نمازِ جنازہ کے کتنے ارکان ہیں؟ اور کون کون سے ہیں؟ نیز بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے، کہ کسی چیز کے ارکان اُس کے بنیادی اجزا ہوتے ہیں جن سے وہ چیز وجود میں آتی ہے۔

(۱) الهداية، كتاب الصلوة، باب الجنائز، فصل في الصلوة على الميت: ۱۹۲/۱

نماز جنازہ کے ارکان دو ہیں (۱) چار تکبیریں (۲) قیام۔
جہاں تک بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھنے کا تعلق ہے تو بلا عذر بیٹھ کر نمازِ جنازہ ادا کرنا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ورکنها) شیئان: (التکبیرات) الأربع......(والقیام) فلم تجز قاعدًا بلا عذر. (۱)

ترجمہ: اور نمازِ جنازہ کے ارکان دو چیزیں ہیں چار تکبیریں۔۔۔۔۔اور قیام، اور بلا عذر بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

❁❁❁

مکروہ وقت میں نمازِ جنازہ

سوال نمبر (173):

مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے نمازِ جنازہ ادا کی گئی تو یہ وقت مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر یہ وقت مکروہ ہے تو پھر نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں اگر نمازِ جنازہ تیار ہو جائے تو بلا کراہت جائز ہے۔ البتہ تیار ہونے کے بعد تاخیر کی بنا پر اوقاتِ مکروہہ میں جنازہ پڑھنا درست نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نمازِ جنازہ اگر مکروہ وقت میں تیار ہو جائے تو اس کو اوقاتِ صحیحہ تک متاخر کرنا بھی کراہت سے خالی نہیں۔

صورتِ مذکورہ میں اگر جنازہ اسی وقت تیار ہو کر ادا کیا گیا ہو تو پھر بلا کراہت جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

هذا إذا وجبت صلوة الجنازة، وسجدة التلاوة في وقت مباح وأخرتا إلى هذا الوقت، فإنه لا يجوز قطعاً. أما لو وجبتا في هذا الوقت وأديتا فيه جاز؛ لانها أديت ناقصة كما وجبت. (۲)

(۱) الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة: ۳/ ۱۰۵، ۱۰۶
(۲) الفتاوی الهندية، کتاب الصلوة، الباب الأول في المواقيت، الفصل الثالث في بيان الأوقات: ۱/ ۵۲

ترجمہ:

یہ تب ہے جب نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت مباح وقت میں واجب ہوجائیں، پھر اسی (مکروہ) وقت تک مؤخر کیے جائیں تو کسی صورت میں جائز نہیں۔ اگر اسی وقت میں واجب ہوکر ادا کیے جائیں تو جائز ہے، کیونکہ جیسے واجب تھی ویسے ادا ہوئی۔



نمازِ جنازہ میں امامت کا استحقاق

سوال نمبر(174):

جنازہ کے وقت اگر عالمِ دین موجود ہو تو اس کی موجودگی کی صورت میں ولی کا نمازِ جنازہ پڑھانا بہتر ہے یا اُس عالمِ دین کو نمازِ جنازہ پڑھانا چاہیے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے ولی کو مقدم کرنا واجب ہے اور محلّے کے امام کو مقدم کرنا مستحب ہے، جب وہ ولی سے افضل ہو، اس لیے اگر ولی خود عالمِ دین ہو تو ولی کا نمازِ جنازہ پڑھانا بہتر ہے۔ بصورت دیگر امامِ محلّہ یا کوئی دوسرا عالمِ دین ہو تو اس کو نمازِ جنازہ پڑھانا چاہیے۔ اگر ولی خود عالمِ دین ہو اور وہ کسی اور کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی اجازت دے دے تو پھر جس کو اجازت دی گئی ہو، وہ نمازِ جنازہ پڑھائے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

تقديم الولاة واجب، وتقديم إمام الحيّ مندوب فقط؛ بشرط أن يكون أفضل من الولي، وإلّا فالولي اولىٰ.(١)

ترجمہ:

اولیا کو مقدم کرنا واجب ہے اور محلے کے امام کو مقدم کرنا صرف مستحب ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ولی سے افضل ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ولی اولیٰ ہے۔

(١) الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة:٣/١٢٠

ولی کا جنازہ پڑھنے کے بعد دوسرے ولی کا پڑھنا

سوال نمبر(175):

ایک شخص کراچی میں فوت ہوا،اس کے جنازہ میں ایک بیٹے نے شرکت کی۔مرحوم کی لاش آبائی علاقے میں لانے کے بعد دوسرے ورثا جن میں بیٹے بھی ہوں،کو دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

نمازِ جنازہ دوبارہ پڑھنے کا حق صرف ولی کو حاصل ہے، بشرطیکہ پہلی نمازِ جنازہ ولی کی عدم موجودگی میں پڑھائی گئی ہو۔پھر اگر اولیا ایک سے زیادہ ہوں اور قرابت میں سب برابر ہوں تو صرف ایک ولی کے نمازِ جنازہ میں حاضر ہونے سے سب کا حق ختم ہو جاتا ہے۔دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی گنجائش نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وإن صلی الولي لم یجز لأحد أن یصلي بعده) لأن الفرض یتأدی بالأول والنفل بها غیر مشروع.(۱)

ترجمہ:

اگر ولی نے نمازِ جنازہ پڑھی ہو تو اس کے بعد دوبارہ پڑھنے کی کسی کو اجازت نہیں، کیوں کہ پہلی نماز سے فرض ادا ہو گیا اور جنازہ کی نفل نماز درست نہیں۔

❁❁❁

میت کو دفنانے کے بعد نکال کر دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھانا

سوال نمبر(176):

ایک فوجی دورانِ جنگ مارا گیا۔افسروں کے بقول میت کو نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد دفنایا گیا۔ایک ماہ کے بعد اُس کے ورثا اُس کی نعش قبر سے نکال کر اپنے علاقہ لے آئے۔اب اس پر دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

---

(۱) الهدایة،کتاب الصلوة،باب الجنائز،فصل في الصلوة علی المیت:۱/۱۹۲

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کو دفن کرنے کے بعد بلا عذرِ شرعی قبر سے نکالنا جائز نہیں اور نہ ہی اس پر دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے، البتہ اگر میت کے اولیا کے علاوہ کسی اور نے نمازِ جنازہ ادا کی ہو تو اولیا کے لیے دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جب میت کو تقریباً ایک ماہ کے بعد قبر سے نکالا ہے تو یہ فعل ناجائز ہونے کے باوجود اولیا دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ میت پھولا پھٹا نہ ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(فإن صلّى غيره)أي الولي (ممّن ليس له حق التقدّم) على الولي (ولم يتابعه) الولي (أعاد الولي) ولو على قبره إن شاء لأجل حقّه.(١)

ترجمہ:

اگر ولی کے علاوہ کوئی اور شخص جس کو ولی پر حق تقدم حاصل نہ ہو، میت پر نمازِ جنازہ پڑھا لے اور ولی نے اس کی متابعت نہ کی تو ولی کے لیے نمازِ جنازہ کا اعادہ جائز ہے، اگرچہ میت قبر میں مدفون بھی ہو، کیوں کہ یہ اس کا حق ہے۔

❁❁❁

نمازِ جنازہ میں بچوں کا بڑوں کے ساتھ کھڑا ہونا

سوال نمبر(177):

نمازِ جنازہ کی صف میں اگر بڑوں کے ساتھ نابالغ بچے کھڑے ہو جائیں تو نماز پر کوئی اثر پڑے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صفوں کے حوالے سے جو ترتیب عام نمازوں کے لیے ملحوظ ہے، وہی ترتیب نمازِ جنازہ کے لیے بھی ہے۔ اس لیے بچوں کی الگ صف بنانا زیادہ بہتر ہے، تاہم اگر کسی مصلحت کی وجہ سے بچوں کو مردوں کے ساتھ کھڑا کیا جائے تو جائز ہے اور بچوں کی محاذات نماز کے لیے مفسد نہیں، اس لیے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

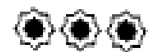
(١) الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صلوة الجنازة: ١٢٣/٣، ١٢٤

والدّليل على ذلك:

بخلاف محاذاة الصبي حيث لا تفسد لخلوه عما يوجب التشويش ،ولئن وجد فهو نادر، وهو أيضاً من جانب واحد.(۱)

ترجمہ:

اس کے برعکس بچوں کی صف میں برابر کھڑے ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں تشویش کی علت نہیں پائی جاتی اور اگر پائی جائے تو یہ نادر کے حکم میں ہے اور صرف ایک جانب سے پائی جاتی ہے (لہٰذا نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا)۔



اجتماعی نمازِ جنازہ پڑھنے کا طریقہ

سوال نمبر(178):

اگر کئی جنازے ایک ساتھ حاضر ہوں تو ان سب پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

اگر کئی جنازے ایک ہی وقت میں حاضر ہوں تو اُن پر نمازِ جنازہ ادا کرنے میں امام کو اختیار ہے، چاہے اُن سب پر نمازِ جنازہ ایک ساتھ پڑھائے یا ان میں سے ہر میّت پر علیحدہ علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھائے، دونوں طریقے جائز ہیں۔

والدليل على ذلك:

وإذا اجتمعت الجنائز، فالإمام بالخيار إن شاء صلّى على كلّ جنازة صلاة على حدة،وإن شاء صلّى عليها صلوٰة واحدة.(۲)

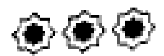
---

(۱) تبيين الحقائق،كتاب الصلاة،باب الإمام والحدث في الصلاة:۱/ ۳۵۲

(۲) التاتارخانية،كتاب الصلاة،القسم الثاني في كيفية الصلاة على الميت:۲/ ۱۱۹

ترجمہ:

اور جب کئی جنازے حاضر ہوں تو امام کو اختیار ہے کہ ہر میت پر علیحدہ علیحدہ نماز پڑھائے اور یا اُن سب پر ایک نماز پڑھائے۔



غائبانہ نمازِ جنازہ

سوال نمبر(179):

کیا جنازے کے دوران میت کا امام کے سامنے ہونا ضروری ہے؟ اگر دورانِ نماز میت کسی اور جگہ ہو تو اس طرح غائبانہ نمازِ جنازہ درست ہوگا یا نہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

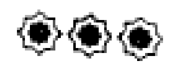
نمازِ جنازہ کی صحت کے لیے میت کی موجودگی شرط ہے اور طریقہ یہ ہے کہ میت امام کے سامنے ہو، لہٰذا اگر کہیں میت موجود ہی نہ ہو یا موجود ہو، مگر امام کے سامنے نہ ہو تو یہ درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاے احناف غائبانہ نمازِ جنازہ کے قائل نہیں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

ومن الشروط حضور الميت ،ووضعه ،وكونه أمام المصلي،فلا تصح على غائب.(١)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ کے شرائط میں سے میت کا حاضر کرانا ہے اور نمازی کے سامنے ہونا بھی، پس غائبانہ نمازِ جنازہ درست نہیں۔



(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل الخامس في الصلوة على الميت:١/١٦٤

غائبانہ نمازِ جنازہ کے متعلق احناف کا موقف

سوال نمبر(180):

ہمارے ہاں غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز وعدم جواز میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔جولوگ جواز کے حق میں ہیں،وہ نجاشی پر حضورﷺ کا نمازِ جنازہ پڑھنے سے استدلال کرتے ہیں۔اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہ حنفی کی رُو سے نمازِ جنازہ کی صحت کے لیے میت کا سامنے ہونا شرط ہے،اس لیے غائبانہ نمازِ جنازہ درست نہیں۔شاہ حبشہ پر حضور اقدسﷺ کا نماز پڑھنا،آپﷺ کی خصوصیت اور کرامت تھی،کیوں کہ نجاشی کے جنازہ کو اللہ پاک نے اپنی قدرت سے نبیﷺ کے سامنے حاضر کیا اور آپﷺ نے نماز پڑھائی اور صحابہ کرامؓ کی نماز ایسے امام کے پیچھے تھی جو میت کو دیکھ رہے تھے،اس لیے ان کی اقتدا بھی درست ہوئی۔اگر غائب میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہوتا تو حضور اقدسﷺ ان صحابہ پر نمازِ جنازہ ضرور پڑھتے جو کثیر تعداد میں مدینے سے باہر دور دراز علاقوں میں فوت ہوئے اور آپﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی تمنا کی،لہٰذا غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز کے لیے نجاشی کی نمازِ جنازہ کو دلیل کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وشرطها أيضاً حضوره ووضعه ......فلا تصح على غائب......وصلوة النبي على النجاشي لغوية أوخصوصية.قال ابن عابدين:أولأنه رفع سريره حتى رآه عليه الصلوة والسلام بحضرته، فتكون صلوة من خلفه على ميت يراه الإمام......وهذا غير مانع من الاقتداء.(۱)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ کی شرائط میں میت کا حاضر ہونا اور امام کے سامنے رکھنا بھی ہے۔۔۔۔اسی وجہ سے غائب پر (نمازِ جنازہ پڑھنا) جائز نہیں۔۔۔۔اور نجاشی پر حضورﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے مراد یا تو لغوی معنی پر محمول ہوگا یا یہ ان کی خصوصیت تھی۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:''یا اس کی چارپائی اتنی اٹھائی گئی

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار،کتاب الصلاة،باب صلاة الجنازة:۳/۱۰۴،۱۰۵

یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس کو اپنے سامنے دیکھ لیا، پس یہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ہے جو میت کو دیکھ رہا ہو۔۔۔ اور یہ اقتداء سے مانع نہیں ہے"۔

❁❁❁

نامعلوم خاتون کی میت پر نمازِ جنازہ

سوال نمبر (181):

ایک عورت سمندر کے قریب مُردہ حالت میں پائی گئی۔اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔اب اس کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

میّت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔تاہم میت ایسی حالت میں پائی جائے کہ اس کے اسلام کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی علامت موجود ہو، جس سے اس کا مسلمان ہونا یا کافر ہونا معلوم ہو سکے تو اس صورت میں قریبی آبادی کو دیکھ کر اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر قریبی آبادی مسلمانوں کی ہو تو پھر اس کو مسلمان تصور کر کے اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہوگا۔اور اگر قریبی آبادی کافروں کی ہو تو اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ ہوگا، اس صورت میں میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہ ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

لولم یدرأمسلم أم کافر، ولاعلامة، فإن في دارنا غسل وصلي علیه، وإلالا. قال ابن عابدین: علامة المسلمین أربعة: الختان، والخضاب،و لبس السواد وحلق العانة.(۱)

ترجمہ: اگر مسلمان یا کافر ہونے کا پتہ نہ چلے اور کوئی علامت بھی نہ ہو تو اگر ہماری ریاست میں ہو تو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز بھی پڑھی جائے گی ،ورنہ نہیں۔علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ: مسلمان ہونے کی علامتیں چار ہیں: ختنہ، خضاب، کالی پگڑی کا استعمال اور زیرِ ناف بالوں کا حلق کرنا۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازہ، مطلب في حدیث "کل سبب ونسب منقطع......۲/۹۳

نامعلوم لاش کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(182):

بہتے دریا سے نکالی گئی لاش پر مسلمانوں کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی، ایسی صورت میں اس کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

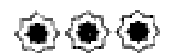
اگر کوئی اجنبی لاش مل جائے اور اس پر کوئی ایسی علامت نہیں جسے بنیاد بنا کر اس کا مسلمان ہونا یقینی ثابت ہو تو پھر دیکھا جائے گا کہ لاش اسلامی ریاست میں ملی ہے یا غیر اسلامی ریاست میں۔ اگر اسلامی ریاست میں ملی ہو تو غلبہ ظن کی وجہ سے مسلمان متصور کیا جائے گا، لہٰذا غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، اور اگر غیر اسلامی ریاست میں ملی ہو تو اسے کافر متصور کرے اس کے ساتھ کافروں والا معاملہ کیا جائے گا۔ فقہائے کرام نے چند بنیادی علامات بتائی ہیں، جنہیں بنیاد بنا کر مسلمان ہونے کی نشاندہی باآسانی کی جاسکتی ہے، جن میں سے زیرناف بالوں کی صفائی، ختنہ، کالی پگڑی اور خضاب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لو لم یدر أمسلم أم کافر، ولا علامة، فإن في دارنا غسل وصلي علیه، وإلا لا. قال ابن عابدین: علامة المسلمین أربعة: الختان، والخضاب، ولبس السواد وحلق العانة.(۱)

ترجمہ:

اگر مسلمان یا کافر ہونے کا پتہ نہ چلے اور کوئی علامت بھی نہ ہو تو اگر ہماری ریاست میں ہو تو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز بھی پڑھی جائے گی، ورنہ نہیں۔ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ: مسلمان ہونے کی علامتیں چار ہیں: ختنہ، خضاب، کالی پگڑی کا استعمال اور زیرناف بالوں کا حلق کرنا۔



(۱) ردالمحتار علیٰ الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ، مطلب في حدیث "کل سبب ونسب منقطع......: ۱۰۳/۳

نومولود کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(183):

ایک بچہ پیدا ہونے کے بعد فوراً مر جائے تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے کسی بچے کی پیدائش کے وقت بدن کا اکثر حصہ نکل آئے اور اس میں زندگی کے آثار موجود ہوں تو یہ بچہ زندہ شمار ہوگا۔اور اگر اکثر حصہ باہر نکلتے وقت مردہ ہو تو یہ بچہ مرا ہوا شمار ہوگا،لہٰذا جس بچے کی پیدائش ایسی حالت میں ہو کہ اس میں زندگی کے آثار پائے جائیں اور پھر مر جائے تو اس پر نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ویصلّي علی کل مسلم مات بعد الولادة صغیراً کان ،أو کبیراً .(۱)

ترجمہ:

جو مسلمان پیدائش کے بعد فوت ہو جائے تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی،خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

۞۞۞

مجنون کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(184):

ایک شخص جو پیدائش سے لیکر بڑھاپے تک جنون کی حالت میں رہا،یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آئی تو یہ شخص بچے کے حکم میں ہے یا بڑوں کے حکم میں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو شخص بچپن سے موت تک مسلسل مجنون رہا ہو تو چونکہ مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے،اس لیے اس کے جنازہ

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون، الفصل الخامس في الصلاة علی المیت:۱/۱٦۲

میں استغفار نہیں ہوگا۔استغفار گناہوں کے ازالہ کے لیے ہوتا ہے اور جنون کی وجہ سے گناہ کا اثر نہیں ہوتا۔
لہٰذا مذکورہ مجنون کا جنازہ بچوں کی طرح پڑھا جائے گا،لیکن اگر جنون بلوغ کے بعد عارض ہوا ہو تو اس صورت میں بلوغ کے بعد جو گناہ سرزد ہو چکے ہوں، وہ ساقط نہیں ہوں گے،اس لیے بالغ کا جنازہ پڑھایا جائے گا۔

والدّليل علىٰ ذالك:

قوله:(ولا يستغفر فيهالصبي ومجنون ومعتوه) هذا في الأصلي، فإن الجنون والعته الطارئين بعد البلوغ لايسقطان الذنوب السالفة.(۱)

ترجمہ:

اور جنازہ کی نماز میں بچے، مجنون اور پاگل کے لیے طلب مغفرت نہیں کی جائے گی۔ یہ اصلی مجنون کا حکم ہے، کیونکہ وہ جنون اور پاگل پن جو بالغ ہونے کے بعد عارض ہو،اس سے سابقہ گناہ ساقط نہیں ہوتے۔



پاگل عورت کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(185):

ایک عورت حدِ بلوغ کو پہنچنے کے کافی عرصے بعد پاگل ہو کر مرگئی تو نمازِ جنازہ میں اختلاف پیدا ہوگیا۔بعض نے کہا کہ مجنونہ کی نمازِ جنازہ بچوں کی طرح پڑھنی چاہیے، جبکہ بعض نے اس کے برعکس بتایا۔شریعت کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت کریں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بالغ مجنون کا جنازہ نابالغوں کی طرح ادا ہوتا ہے،لیکن یہ حکم تب ہے جب وہ شخص بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک مسلسل مجنون ہو۔اس کے برعکس وہ مجنون جو بالغ ہوجانے کے بعد مجنون اور پاگل ہوگیا ہو تو اس کا یہ جنون گناہوں سے مانع تو ہے،لیکن سابقہ گناہوں کے لیے مزیل نہیں، اس لیے یہ دعاے مغفرت کا محتاج ہے۔اس صورت میں مجنون کا جنازہ بالغوں کی طرح ادا کیا جائے گا۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃ الجنازۃ،مطلب:هل يسقط فرض الكفاية:۳/۱۱۳

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون کا جنون جب بلوغت کے بعد عارض ہوا ہے تو اس کی نمازِ جنازہ بڑوں کی طرح ادا کی جائے گی، تا کہ ایامِ صحت کی رعایت ملحوظ رہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

قولہ:(ولا یستغفر فیہا لصبي ومجنون ومعتوہ) ھذا في الأصلي، فإن الجنون والعتہ الطارئین بعد البلوغ لا یسقطان الذنوب السالفة.(۱)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ میں بچے، مجنون اور پاگل کے لیے دعاے مغفرت طلب نہیں کرے گا، یہ اصلی مجنون کا حکم ہے، اس لیے کہ جو جنون اور پاگل پن بلوغت کے بعد لاحق ہوا ہے، وہ سابقہ گناہوں کو ساقط نہیں کرتا۔ (اصلی مجنون وہ ہے جو پیدائشی یا بلوغ سے قبل مجنون چلا آرہا ہو)۔



خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(186):

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟ بعض روایات سے اس کی نفی معلوم ہوتی ہے اور بعض فقہاے کرام نے جواز کا حکم تحریر کیا ہے۔ مسئلے کی وضاحت کریں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ خودکشی کرنا حرام ہے، لیکن اہل السنّت والجماعت کے نزدیک کسی حرام کا ارتکاب موجبِ کفر نہیں، لہٰذا خودکشی کرنے والا مستقل گناہ گار ضرور ہے، مگر اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں اور جہاں کہیں روایات میں اس کی نفی آئی ہے، وہ تعزیر پر محمول ہے، تا کہ معاشرے میں کوئی ایسے قبیح فعل کا ارتکاب نہ کر سکے، ہاں اگر خودکشی کی کثرت ہو اور نمازِ جنازہ نہ پڑھنے سے تدارک کا امکان ہو، تو پھر بطورِ تعزیر چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ، مطلب: ھل یسقط فرض الکفایة:۳/۱۳۴

والدّلیل علیٰ ذلک:

(من قتل نفسه) ولو (عمدا يغسل ويصلي عليه) به يفتي.(١)

ترجمہ:

جس نے اپنے آپ کو قتل کیا، اگر چہ جان بوجھ کر ہو، اس کو غسل دیا جائے گا اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، اسی پر فتویٰ ہے۔



دورانِ جرم مارے جانے والے کی نمازِ جنازہ

سوال نمبر(187):

اگر کوئی شخص چوری یا ڈکیتی کے دوران مارا جائے تو اس کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جرائم کے دوران مارے جانے والے افراد پر نمازِ جنازہ بطورِ تعزیر نہیں پڑھی جائے گی، اس لیے معاشرے کے محترم حضرات ان کے جنازہ میں شرکت نہ کریں، بلکہ عام لوگ پڑھیں، تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے عبرت ہو، تاہم ان جرائم میں ملوث افراد اگر طبعی موت مر جائیں تو پھر معاشرے کے محترم حضرات کے لیے ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر نمازِ جنازہ پڑھانے میں کوئی قباحت نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وهي فرض على كل مسلم مات، خلا) أربعة: (بغاة، وقطاع طريق)(فلا يغسلوا، ولا يصلى عليهم (إذا قتلوا في الحرب) ولو بعده صلي عليهم.(١)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ ہر مسلمان میت پر پڑھنا فرض ہے، سوائے چار طبقات کے (ان میں سے) بغاوت کرنے والے

(١) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة: ١٠٨/٣

اور راستوں کو لوٹنے والے بھی ہیں۔ انہیں غسل نہیں دیا جائے گا اور ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، جب دوران جنگ مارے جائیں۔ اگر اس کے بعد ہو تو نماز پڑھی جائے گی۔

❁❁❁

اجرتی قاتل پر نماز جنازہ

سوال نمبر (188):

اگر کوئی شخص زندگی میں اجرتی قاتل ہو اور ڈاکہ زنی وغیرہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا رہا ہو تو ایسے شخص پر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی میت پر نماز جنازہ پڑھنے کے لیے صرف اس کا مسلمان ہونا شرط ہے، جب تک کسی شخص سے صریح کفر ثابت نہ ہو، اس وقت تک اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ محض اوامر میں کوتاہی اور نواہی کے ارتکاب سے کوئی مسلمان اسلام کے دائرے سے نہیں نکلتا، لہٰذا اگر کوئی شخص اجرتی قاتل ہو یا ڈاکہ زنی وغیرہ کا مرتکب ہو تو ایسے شخص پر نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے۔ ہاں اگر قتل یا ڈاکہ کے دوران قتل ہو تو خواص جنازہ نہ پڑھیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن أبی ھریرةؓ قال: قال رسول اللہﷺ :الجھاد واجب علیکم مع کلّ أمیرٍ برّاً کان أو فاجرا ... والصلوٰة واجبة علی کلّ مسلم برّاًکان أوفاجراً وإن عمل الکبائر.(۱)

ترجمہ:

ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ:'' جہاد تم پر ہر نیک اور فاجر امیر کے ساتھ واجب ہے۔۔۔اور نماز جنازہ ہر نیک اور فاجر مسلمان پر پڑھنا واجب ہے، اگر چہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔

❁❁❁

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب الجھاد، باب في الغزو مع أئمة الجور: ۳۴۳/۱

بے نمازی پر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال نمبر(189):

ایک شخص نے زندگی بھر سوائے عیدین کے کوئی اور نماز نہیں پڑھی۔اس کی نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی میت کی نمازِ جنازہ ادا ہونے کے لیے صرف اس کا مسلمان ہونا شرط ہے۔جب تک اس کے متعلق صریح کفر ثابت نہ ہو،اس کے علاوہ دوسرے جرائم کے ارتکاب سے کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا لہٰذا اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھے تو ایسے شخص پر نمازِ جنازہ پڑھنا ضروری ہے،البتہ علاقے کے ممتاز لوگ اس میں شریک نہ ہوں،تاکہ لوگ ایسی حرکتوں سے باز آئیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ" الجهاد واجب عليكم مع كلّ أمير برّاً كان أو فاجرا ......والصلوٰة واجبة علىٰ كل مسلم برّاً كان،أو فاجراً ،وإن عمل الكبائر.(١)

ترجمہ:

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ:''جہاد تم پر ہر نیک اور فاجر امیر کے ساتھ واجب ہے۔۔۔اور نمازِ جنازہ ہر نیک اور فاجر مسلمان پر پڑھنا واجب ہے،اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔

۞۞۞

نمازِ جنازہ میں شرکت کا ثواب

سوال نمبر(190):

جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں ان میں سے بعض لوگ تدفین سے پہلے چلے جاتے ہیں،جبکہ بعض

(١) سنن أبي داود، كتاب الجهاد،باب في الغزو مع ائمة الجور:١/٣٤٣

لوگ تدفین مکمل ہونے تک ٹھہرتے ہیں۔ دونوں کو ایک جیسا اجر ملتا ہے یا ان کے اجر میں فرق ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مسلمان میت کی نمازِ جنازہ اور تدفین وغیرہ فرض کفایہ کے زمرہ میں داخل ہیں، اس لیے شامل ہونے والوں کے لیے شریعت میں باقاعدہ اجر مقرر ہے، تاہم تدفین مکمل ہونے تک ٹھہرنے والے اور تدفین سے پہلے صرف نمازِ جنازہ پڑھ کر جانے والے ثواب میں برابر نہیں ہوسکتے، بلکہ جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کے بعد دفن کے مراحل مکمل ہونے تک وہاں رہیں گے، ان کو دو قیراط ثواب ملے گا اور جو لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کے بعد چلے جاتے ہیں، ان کو ایک قیراط اجر ملے گا اور ایک قیراط کا ثواب اُحد کے پہاڑ کے برابر ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن ثوبان مولی رسول اللّٰہ ﷺ أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: من صلی علی جنازة فله قیراط، فإن شهد دفنها، فله قیراطان، القیراط مثل أحد.(۱)

ترجمہ:

رسول اللہ ﷺ کے غلام ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص نمازِ جنازہ میں شریک ہوا، اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور جو اس کی تدفین میں بھی شریک رہا، اس کے لیے دو قیراط اجر ہے، ایک قیراط اُحد کے برابر ہے۔



کافر کے جنازہ میں شرکت کرنا

سوال نمبر(191):

کیا نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے یا کسی غیر مسلم کی نمازِ جنازہ میں بھی شرکت کی جاسکتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا تؤجروا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل في حصول ثواب القیراط بالصلوة علی المیت: ۳۰۷/۱

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ فقہی عبارات میں مسلمان کے مسلمان پر جن حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک "اتباع الجنائز" ہے، یعنی جب وہ فوت ہوجائے تو اس کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوجائے۔ فقہائے کرام نے کسی میت پر نماز جنازہ پڑھنے یا پڑھانے کے لیے میت کے اسلام کو شرط قرار دیا ہے، لہٰذا کسی کافر یا مرتد کی نمازِ جنازہ پڑھنا یا پڑھانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، اس لیے کہ نمازِ جنازہ میں میت کے لیے مغفرت کی دعا مانگی جاتی ہے اور مسلمان کا کسی کافر کے لیے مرنے کے بعد استغفار کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وشرطها) ستة (إسلام الميت وطهارته......).(۱)

ترجمہ:

نمازِ جنازہ کی شرائط چھ ہیں، ان میں سے میت کا مسلمان ہونا اور اس کا پاک ہونا ہے۔

❀❀❀

نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت کرنا

سوال نمبر(192):

ایک بیمار نے اپنے ہوش وحواس کی حالت میں ایک رشتہ دار کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت کی، لیکن اس کے باوجود اس نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی تو وصیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے نماز پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رو سے اگر کوئی اپنی زندگی میں کسی کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت کرے تو اس پر عمل کرنا ضروری نہیں، بلکہ سرے سے وصیت ہی باطل اور غیر معتبر ہے، کیوں کہ شریعت جنازہ پڑھانے کے حق دار کا تعین خود کرتی ہے، تاہم اگر ولی کی اجازت سے ہو تو موصی لہ یا کسی اور کے پڑھانے سے جنازہ درست رہے گا۔

---

(۱) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ: ۳/ ۱۰۳

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي الكبرى :الميت إذا أوصى بأن يصلي عليه فلا ن، فالوصية با طلة، وعليه الفتوى.(١)

ترجمہ:

میت جب کسی کو اپنی حیات میں وصیت کرتا ہے کہ فلاں شخص اس کی نمازِ جنازہ پڑھائے تو وصیت باطل ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔

ولمن له حق التقدم أن يأذن لغيره......ومن له ولاية التقدم فيها أحق ممن أوصىٰ له الميت بالصلوة عليه على المفتىٰ به.(٢)

ترجمہ:

جو نماز پڑھانے کا شرعاً حق دار ہو، وہ دوسرے کو اجازت دے سکتا ہے۔۔۔۔اور جس کو نماز پڑھانے کی ولایت حاصل ہو، مفتی بہ قول کے مطابق اس کا پڑھانا اس شخص سے بہتر ہے جس کے لیے میت نے وصیت کی ہو کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائے۔



مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال نمبر(193):

بعض لوگ مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں اور دلیل میں مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ پڑھنے کو پیش کرتے ہیں۔ برائے مہربانی اس مسئلہ کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں۔

بيّنوا تؤجروا

الجواب وبالله التوفيق:

احنافؒ کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، البتہ جہاں کہیں عذر ہو تو ایسی صورت میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

---

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل الخامس في الصلوة على الميت:١٦٣/١ (٢) نورالإيضاح، كتاب الصلوة،باب أحكام الجنائز،فصل السلطان أحق :ص١٢٨

جہاں تک مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا تعلق ہے تو چونکہ سعودی عرب اور بعض دیگر عرب ممالک میں حنابلہؒ کا مسلک رائج ہے اوران کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے، اس لیے مسجد حرام میں نمازِ جنازہ پڑھنا ہمارے لیے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

والدّلیل علیٰ ذالک:

(وکرهت تحريمًا)وقيل (تنزيهًا في مسجدجماعة هو)أي الميت (فيه) وحده،أومع القوم،(واختلف في الخارجة)عن المسجدوحده،أومع بعض القوم (والمختار الكراهةمطلقًا)أي في جميع الصور.(۱)

ترجمہ: (مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے)اور کہا گیا ہے کہ(مکروہِ تنزیہی ہے، جب میت ایسی مسجد میں ہو، جس میں جماعت ہوتی ہو) اکیلے ہو یا قوم کے ساتھ ہو (اور مشائخ نے میت کے مسجد سے باہر ہونے کی صورت میں اختلاف کیا ہے) میت اکیلے ہو یا بعض قوم کے ساتھ ہو۔ اور علامہ ابنِ عابدین نے فرمایا ہے کہ:"مختار قول مطلقاً کراہت کا ہے"۔



قبر میں میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال نمبر(194):

اگر میت کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفنایا جائے تو کتنے دنوں تک اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ نیز بعض لوگوں میں مشہور ہے کہ میت کو امانتاً دفن کیا جائے تو زمین اس کو نہیں کھاتی؟ ازروئے شریعت اس کی کیا حقیقت ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے میت پر نمازِ جنازہ کی ادائیگی اس کے حقوق میں شامل ہے۔ میت پر نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے شرط یہ ہے کہ میت کا بدن سامنے ہو، اگر میت پر نمازِ جنازہ ادا کیے بغیر اس کو دفن کیا گیا تو جب تک نعش کے پھٹنے کا یقین نہ ہو، اس وقت تک اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ نعش کے پھٹنے کے متعلق فقہاے کرام فرماتے ہیں کہ تین

(۱)الدر المختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الصلاۃ،باب صلاۃ الجنازۃ:۱۲۶/۳

دن تک نعش سلامت رہ سکتی ہے تین دن کے بعد اس پر نماز جنازہ ادا کرنا جائز نہیں، لیکن نعش کے پھٹنے کی مدت کا دارومدار زمین کی اندرونی تغیرات، موسمی تغیرات اور خود میت کے بدن کے مختلف احوال کی وجہ سے مختلف رہتی ہے، لہٰذا اگر کسی علاقہ میں موسم ایسا ہو، جہاں نعش کا زمین میں تین دن سے کم مدت میں پھٹنے کا اندیشہ ہو تو وہاں تیسرے دن بھی قبر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ: زمین انبیاء کی میت کو نہیں کھاتی، یہ بات کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

وفي " الأمالي " عن أبي يوسف ؒ أنه قال: يصلّي عليه إلى ثلاثة أيام...... وأمّا بعد الثلاثة لا يصلّي؛لأنّ الصلوٰة مشروعة علىٰ البدن ،وبعد مضي الثلاث ينشق ويتفرّق.(۱)

ترجمہ: امالی میں امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ میت پر تین دن تک نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔۔۔اور تین دن گزرنے کے بعد نہ پڑھے، کیوں کہ نماز جنازہ بدن پر مشروع ہے اور تین دن گزرنے کے بعد بدن پھٹ جاتا ہے اور جدا ہو جاتا ہے۔



نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دُعا

سوال نمبر(195):

نماز جنازہ کے فوراً بعد صفیں توڑ کر میت کے لیے دعا مانگی جاتی ہے۔ از روئے شریعت بعد از نماز جنازہ دعا مانگنا کیسا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا مانگنا خیر و برکت کا ذریعہ ہے اور روایات میں مختلف موقع محل کی دعائیں منقول ہیں اور دعا مانگنے کی ترغیب بھی آئی ہے، یہاں تک کہ دعا مانگنے کو عبادت کا مغز بتایا گیا ہے، لہٰذا ایسی تمام دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے جو حضور ﷺ سے ثابت ہیں اور نمازِ جنازہ خود دعا ہے، اس لیے نمازِ جنازہ کے بعد دعا کے لیے اہتمام

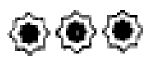
(۱) بدائع الصنائع، كتاب الصلوٰة ، فصل في بيان ما تصح به وتفسد: ۳٤۷/۲

کی ضرورت نہیں، بلکہ جنازہ سے فراغت حاصل کرتے ہی فوراً تدفین میں لگنا چاہیے، تاکہ تاخیر واقع نہ ہو، جو کہ بلاعذر موجبِ گناہ ہے، تاہم اگر صفیں توڑنے کے بعد بغیر التزام کے دُعا کی جائے تو یہ ممنوع نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وهي أربع تكبيرات بثناء بعد الأولىٰ، وصلوة على النبي ﷺ بعد الثانية، ودعاء بعد الثالثة، وتسليمتين بعد الرابعة)......وقيد بقوله:بعدالثالثة؛لأنه لايدعو بعدالتسليم كما في الخلاصة،وعن الفضلي لابأس به.(۱)

ترجمہ: نمازِ جنازہ چار تکبیرات ہیں۔ پہلی تکبیر کے بعد ثنا، دوسری کے بعد درود شریف اور تیسری کے بعد دعا پڑھے گا، اور چوتھی تکبیر کے بعد دو سلام۔۔۔۔ مصنفؒ نے دعا کو اپنے قول بعد الثالثة کے ساتھ مقید کیا اس لیے کہ سلام کے بعد دعا نہیں پڑھی جاتی، جیسا کہ خلاصہ میں ہے اور فضلیؒ سے منقول ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔



جوتوں سمیت نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال نمبر(196):

بعض لوگ نمازِ جنازہ جوتوں سمیت ادا کرتے ہیں۔کیا جوتوں سمیت نمازِ جنازہ ادا کرنا جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جوتے پہن کر نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ جوتے بھی پاک ہوں اور جس جگہ کھڑا ہے، وہ بھی پاک ہو۔ان میں سے کوئی ایک بھی ناپاک ہو تو نماز درست نہ ہوگی۔اس لیے کہ لباس اور مکان کی طہارت نماز کی شرائط میں سے ہے،لیکن اگر جوتے اتار کر اس کے اوپر کھڑے ہو کر نمازِ جنازہ پڑھی جائے تو اس صورت میں جوتے کے اوپر حصے کا پاک ہونا ضروری ہے،مکان اور جوتے کے نچلے حصے کا پاک ہونا ضروری نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو قام على النجاسة وفي رجليه نعلان أوجوربان لم تجز صلوته، ولو خلع نعليه وقام

(۱) البحرالرائق،كتاب الجنائز،فصل السلطان أحق بصلوته:۲/ ۳۲۰، ۳۲۱

فیهما جاز، سواء كان ممايلي الأرض منه نجسا أو طاهراً إذا كان مايلي القدم طاهرا.(١)

ترجمہ:

اگر ناپاکی کے اوپر کھڑا ہو اور جوتے یا جرابیں پہنی ہوں تو نماز جائز نہیں ۔ اگر جوتے اتارے ہوں اور ان کے اوپر کھڑا ہو تو جائز ہے، خواہ جوتے کا زمین سے لگا ہوا نچلا حصہ پاک ہو یا ناپاک، بشرطیکہ جوتے کا پاؤں سے لگا ہوا اوپر کا حصہ پاک ہو۔

❁❁❁

تصویر کے سامنے نمازِ جنازہ

سوال نمبر(197):

اگر نمازِ جنازہ کے دوران سامنے تصویر ہو تو نماز پر اس کا کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نمازی کے سامنے اگر تصویر ہو تو اس کی توجہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، حالانکہ نماز کا حسن اس کی باطنی توجہ اور استحضار ہے۔ نیز تصویر کے سامنے ہوتے ہوئے نماز پڑھنے سے تصویر کی تعظیم کا شبہ بھی پایا جاتا ہے۔
اس لیے صورتِ مسئولہ میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، اور فقہائے کرام نے کراہت کو تحریمی پر محمول کیا ہے، خصوصاً جب نمازی کے بالکل سامنے ہو، اس لیے اجتناب ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لأنه يشبه عبادتها فيكره، وأشدها كراهة أن تكون أمام المصلي.(٢)

ترجمہ: اس لیے کہ تصاویر (کو سامنے رکھ کر نماز پڑھنا) ان کی عبادت کے ساتھ مشابہت ہے جو کہ مکروہ ہے اور نمازی کے سامنے ہونا تو سخت کراہت پر محمول ہے۔

❁❁❁❁❁

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الثالث، الفصل الثاني في طهارة مايستر به العورة: ٦٢/١

(٢) تبيين الحقائق، كتاب الصلوة، باب مايفسد الصلوة ومايكره فيها: ٤١٤/١

فصل في الدفن وأحكام القبر

(میت کی تدفین اور قبر سے متعلقہ احکام)

جنازہ کے بعد دفن میں تاخیر کرنا

سوال نمبر(198):

ایک شخص اپنے علاقے سے باہر وفات پا گیا۔ دفنانے کے لیے لاش اپنے علاقے روانہ کی گئی، حتیٰ کہ لاش رات کو پہنچی اور نمازِ جنازہ بھی ادا کی گئی تو میت کو محض لوگوں کی دیدار کے لیے صبح تک رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

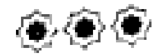
جب مردے کی تکفین اور جنازہ مکمل ہو جائے تو دفن میں تاخیر مکروہ ہے، البتہ ضرورت کی وجہ سے دیر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پس صورتِ مذکورہ میں نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد اگر رات کو رات دفن کرنے میں مشکلات نہ ہوں تو پھر محض لوگوں کو میت کا چہرہ دکھانے کے لیے صبح تک رکھنا مکروہ ہے، جس طرح قبر تیار ہونے کے بعد نمازِ جنازہ اس ارادے سے ملتوی کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوں تو یہ بھی مکروہ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي القنية: ولو جهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تاخير الصلوة ،ودفنه ليصلي عليه الجمع العظيم بعد صلوة الجمعة.(١)

ترجمہ:

اگر میت کی تجہیز جمعہ کی صبح کو مکمل ہوگئی ہے تو پھر نماز اور دفن میں اس وجہ سے تاخیر کرنا کہ جمعہ کی نماز کے بعد بڑی جماعت اس کی نماز میں شریک ہو، مکروہ ہے۔



(١) البحرالرائق، کتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بالصلوة:٢/٣٣٥

شوہر کا بیوی کو قبر میں اُتارنا

سوال نمبر(199):

کیا شوہر اپنی بیوی کو قبر میں اُتار سکتا ہے حالانکہ فقہ حنفی کی رُو سے موت کے بعد شوہر بیوی کے لیے اجنبی کے مانند ہوتا ہے؟

بینوا توجروا

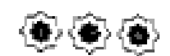
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بیوی کی موت کے بعد شوہر اس کے لیے اجنبی کے حکم میں ہوتا ہے اس لیے غسل دینا اور ہاتھ لگانا درست نہیں۔قبر میں اُتارنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو اپنا محرم اُتارے۔تاہم اگر کوئی محرم نہ ہو تو ضرورت کی بنا پر خاوند بھی قبر میں اُتار سکتا ہے، کیونکہ کفن حائل ہوتا ہے، البتہ محرم کی موجودگی میں شوہر کا بیوی کو قبر میں نہیں اُتارنا چاہیے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وذوالرحم المحرم أولى بإدخال المرأة من غيرهم، كذا في الجوهرة النيّرة، وكذا ذوالرحم غيرالمحرم أولى من الأجنبي فإن لم يكن فلابأس للأجانب وضعها كذا في البحرالرائق.(۱)

ترجمہ: عورت کو قبر میں اتارنے کے لیے محرم رشتہ دار دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ حقدار ہے۔اسی طرح جوہرہ نیرہ میں ہے۔پھر غیر محرم رشتہ دار اجنبی لوگوں سے زیادہ حقدار ہے، اگر غیر محرم رشتہ دار بھی نہ ہو تو اجنبی لوگوں کو عورت قبر میں رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔اِسی طرح البحرالرائق میں ہے۔



کئی مردوں کو اجتماعی قبر میں دفنانا

سوال نمبر(200):

وبائی امراض یا دورانِ جنگ ہلاکتیں زیادہ ہوں تو ہر میت کو الگ الگ دفنانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے کئی میتوں کو اجتماعی قبروں میں دفنایا جاتا ہے، یہ طریقہ اختیار کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۱) الفتاوى الهندية، الفصل السادس في القبر والدفن...: ۱/۱۶۶

الجواب وباللہ التوفیق:
شرعی نقطہ نظر سے میت کو دفن کرنے کے لیے الگ قبر بنانا چاہیے اور بلاضرورت ایک ہی قبر میں کئی میتوں کو دفنانا ممنوع ہے، البتہ جہاں کہیں ایسی صورت پیش آئے کہ ہر میت کے لیے الگ قبر کھودنا مشکل ہو یا اُن کو ورثا کے حوالہ کرنا ممکن نہ ہو یا دوسرے انتظامی مشکلات درپیش ہوں تو اجتماعی قبر میں کئی میتوں کو دفن کرنا جائز ہے۔
پھر قبر میں مردے رکھنے کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ سب سے پہلے مَردوں کو قبلہ کی جانب رکھے، پھر لڑکوں، پھر خنثٰی، پھر عورتوں کو قبر میں رکھنا چاہیے اور ہر دو میتوں کے درمیان مٹی کی آڑ بنادی جائے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:
ولا يدفن إثنان أو ثلاثة في قبرٍ واحدٍ، إلّا عند الحاجة، فيوضع الرجل ممّا يلي القبلة، ثمّ خلفه الغلام، ثمّ خلفه الخنثى ثمّ خلفه المرأة، ويجعل بين كلّ ميّتين حاجز من التراب. (۱)

ترجمہ:
ایک قبر میں دو یا تین میتیں دفن نہ کی جائیں، لیکن ضرورت کے وقت ایسا کرنا جائز ہے۔ پس ایسی حالت میں مرد کو قبلہ کی طرف رکھا جائے، پھر اس کے پیچھے لڑکا، پھر اس کے پیچھے ہیجڑا، پھر اس کے پیچھے عورت؛ اور ہر دو میتوں کے درمیان مٹی کی آڑ بنادی جائے۔



میّت کو امانتاً دفن کرنا

سوال نمبر (201):

میّت کو امانتاً دفن کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:
شرعی نقطہ نظر سے انسانی جسم خواہ زندہ حالت میں ہو یا مُردہ حالت میں ہو، قابل احترام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میّت کے ساتھ ہر وہ عمل جو موجب اہانت ہو، جائز نہیں، اس لیے میت کو ایک مرتبہ دفن کرنے کے بعد دوبارہ اس کو

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ۱۶۶/۱

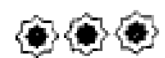
قبر سے نکالنا جائز نہیں، مگر یہ کہ وہ کسی مغصوبہ زمین میں مدفون ہو تو پھر اس کو نکالنے کی گنجائش ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولا ينبغي إخراج الميّت من المقبر بعد ما دفن ،إلّا إذا كانت الأرض مغصوبة، أو أخذت بشفعة.(۱)

ترجمہ:

دفن کرنے کے بعد میت کو قبر سے نہیں نکالنا چاہیے، لیکن اگر زمین مغصوبہ ہو یا کسی نے وہ زمین بطورِ شفعہ لے لی ہو (تو پھر اس قبر سے میت کے نکالنے کی اجازت ہے)۔



غیر مملوکہ زمین میں میّت کو دفن کرنا

سوال نمبر(202):

اگر کسی لاوارث میت کو کسی کی مملوکہ زمین میں، مالک کی اجازت کے بغیر دفن کیا جائے اور وہ زمین قبرستان کے لیے وقف نہ ہو اور مالک اس پر تعمیر کرنا چاہتا ہو تو اس قبر کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ میّت کو کسی غیر کی زمین میں دفن کرنا مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، لہٰذا اگر کسی کی مملوکہ زمین میں کسی میت کو مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر دفنایا گیا تو مالکِ زمین کو یہ حق حاصل ہے کہ اس میّت کو نکال کر دوسری جگہ دفنائے یا زمین کو ہموار کر کے استعمال میں لائے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذا دفن الميّت في أرض غيره بغير إذن مالكها، فالمالك بالخيار إن شاء أمر بإخراج الميّت، وإن شاء سوّى الأرض.(۲)

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن : ۱/۱۶۷

(۲) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز ، الفصل السادس في القبر والدفن : ۱/۱۶۷

ترجمہ:

جب میت کو کسی غیر کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر دفن کر دیا جائے تو اس زمین کے مالک کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو وہ میت کو نکالنے کا حکم کرے یا چاہے تو اس زمین کو برابر کر دے۔

❁❁❁

قبر کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال نمبر (203):

اگر کسی قبر کے ارد گرد گہرے گڑھے بن جائیں اور آئے روز اس میں پانی ٹھہرتا ہو اور پانی جمع ہونے کی وجہ سے قبروں کو نقصان پہنچتا ہو اور ان کے گرنے کا خطرہ ہو تو کیا ایسی صورت میں میت کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق میت کو دفن کرنے کے بعد اس کو نکالنا جائز نہیں، البتہ علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر میت کی قبر پر پانی غالب آجائے جس سے قبر کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس کے ساتھ میت بھی محفوظ نہ رہے تو اس صورت میں حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق میت کو نکالنا جائز ہے''۔ لہٰذا جہاں کہیں ایسی صورت پیش آجائے تو میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

إذا غلب الماء علی القبر، فقیل: یجوز تحویله.....فأفتی ابن عباسؓ بتحویله.(۱)

ترجمہ:

جب پانی قبر پر غالب آجائے تو کہا گیا ہے کہ اس کا منتقل کرنا جائز ہے۔۔۔۔اور ابن عباسؓ نے میت کے منتقل کرنے پر فتوی دیا ہے۔

❁❁❁

(۱) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح، کتاب الصلوة، باب أحکام الجنائز: ۵۰۷، ۵۰۸

تدفین کی تکمیل سے دو قیراط ثواب کا ملنا

سوال نمبر (204):

اگر کوئی شخص نمازِ جنازہ کی ادائیگی میں شریک ہو کر آدھی قبر بننے کے بعد واپس چلا گیا تو حدیث کی رُو سے دو قیراط ثواب کا مستحق ہوگا یا صرف ایک قیراط ثواب ملے گا؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

احادیث کی رُو سے اگر کوئی شخص کسی مسلمان میت کی نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک ہو تو اس کو دو قیراط ثواب ملتا ہے اور صرف نمازِ جنازہ کی ادائیگی کی صورت میں ایک قیراط ثواب ملے گا اور اگر کوئی شخص تدفین کے مراحل مکمل ہونے سے پہلے آدھی قبر بننے کے بعد واپسی اختیار کرے تو یہ شخص تدفین کے ثواب سے محروم رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ "من شهد الجنازة حتىّ يصلّي عليها، فله قيراط، ومن شهدها حتى تدفن، فله قيراطان.(۱)

ترجمہ:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص جنازہ کے وقت حاضر ہو اور میت پر نمازِ جنازہ پڑھ لے تو اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا اور جو شخص جنازہ میں حاضر ہو کر دفنانے تک شریک رہے تو اس کو دو قیراط ثواب ملے گا''۔

قوله: (حتىّ تدفن) ظاهره أنّ حصول القيراط متوقّف على فراغ الدفن، وهو أصحّ الأوجه.(۲)

ترجمہ:

ظاہر یہ ہے کہ قیراط کا حصول دفن سے فارغ ہونے پر موقوف ہے اور یہی اصح توجیہ ہے۔

❁❁❁

(۱) البخاري، محمد بن اسماعيل، صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن: ۱۷۷/۱

(۲) فتح الباري، كتاب الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن: ۵۵۶/۳

مسنون قبر

سوال نمبر(205):

زمین کی سختی اور نرمی کے اعتبار سے قبر کھودنے کے طریقوں میں اختلاف ہوتا ہے۔بعض لوگ لحد بنا کر مردوں کو دفناتے ہیں، لیکن بعض علاقوں میں زمین کی نرمی کی وجہ سے لحد بنانے میں مشکلات اور دشواریاں ہوتی ہیں،اس لیے شق (صندوقچی قبر) کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔شرعی نقطہ نظر سے قبر کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

لحد والی قبر بنانا اور کھودنا مسنون ہے اور لحد کی تعریف یہ ہے کہ زمین کھودنے کے بعد ایک جانب میت لٹانے کے لیے قبر بنائی جاتی ہے،لیکن جہاں کہیں زمین سخت نہ ہو،نرم ہو اور لحد بنانے میں مشکلات ہوں یا قبر گرنے کا اندیشہ ہو تو وہاں شق بنانے میں کوئی حرج نہیں۔شق کی تعریف یہ ہے کہ زمین کھودنے کے بعد درمیان میں کوئی قبر بنائی جائے اور ایسی قبر جو شق بنائی گئی ہو اور وہاں لحد بنانا ممکن نہ ہو تو اس کو خلافِ سنت کہنا صحیح نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

والسنة هو اللحد دون الشق......فإن كانت الأرض رخوة، فلا بأس بالشق.(١)

ترجمہ:

مسنون لحد ہے،شق نہیں۔اگر زمین نرم ہو تو پھر شق بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

❁❁❁

قبر کی شرعی مقدار

سوال نمبر(206):

قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہیے۔میت دفنانے میں ظاہری عمتیں کیا کیا ہیں؟

بینوا توجروا

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ١/١٦٥

الجواب وباللہ التوفیق:

انسان کائنات میں اشرف اور اکرم ہے اور اس کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ مرنے کے بعد مہذب طریقے سے دفنایا جائے، تاکہ اس کی بدبو سے دوسرے انسان محفوظ رہیں اور درندوں کے چیر پھاڑ سے بھی محفوظ ہو۔ظاہر ہے کہ یہ مقصد تب پورا ہوگا جب قبر گہری ہو۔

لہٰذا قبر کی گہرائی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عام انسان کی قامت کے برابر گہری ہو، اوسط درجہ سینے تک ہے اور ادنیٰ درجہ نصف قامت کے برابر ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

قوله:(مقدار نصف قامة) أو إلى حد الصدر، وإن زاد إلى مقدار قامة فهو أحسن...... والمقصود منه المبالغة في منع الرائحة و نبش السباع.(۱)

ترجمہ:

قبر کی گہرائی کی مقدار نصف قامت یا سینے تک ہے اور اگر قامت کے برابر گہری کھودی جائے تو بہتر ہے۔۔۔۔گہرائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بدبو نہ پھیلے اور درندوں سے بھی محفوظ رہے۔



خراب قبر کی مرمت

سوال نمبر(207):

جب قبر اس قدر پرانی ہوجائے کہ اُس کے آثار ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو کیا اس کی مرمت کی جاسکتی ہے؟ خصوصاً جب پاؤں تلے روندنے کا قوی اندیشہ بھی ہو۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

قبر پرانی ہوجانے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے خراب ہونے کی صورت میں دوبارہ مرمت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں،خصوصاً جب پاؤں تلے روندنے کا غالب اندیشہ بھی ہو،تاہم مرمت میں اسراف سے کام لینا یا زیب وزینت

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الصلوٰۃ،باب صلوٰۃ الجنازۃ،مطلب في دفن الميت:۱۳۹/۳

میں مبالغہ کرنا درست نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذا خربت القبور، فلا بأس بتطيينها، كذا في التاتارخانية، وهو الأصح وعليه الفتوى، كذا في جواهر الأخلاطي.(۱)

ترجمہ:

جب قبریں خراب ہوجائیں تو مٹی کا لیپ دینے میں کوئی حرج نہیں، یہ صحیح قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

قبر ہموار کرنا

سوال نمبر(208):

کیا شرعاً کسی قبر کو ہموار کرکے زمین کسی اور مقصد کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

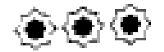
[illegible] اگر کسی قبر پر اتنی مدت گزر جائے کہ اس بات کا یقین ہوجائے کہ اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہوکر ریزہ ریزہ ہوچکی ہیں تو اس قبر میں کسی اور میت کو دفنانا، اس پر تعمیر کرنا اور فصل وغیرہ کاشت کرنا جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره، وزرعه، والبناء عليه.(۲)

ترجمہ:

اگر قبر پرانی ہوجائے اور میت ریزہ ریزہ ہوکر خاک بن جائے تو اس کی قبر میں کسی اور کو دفن کرنا جائز ہے اور فصل بونا اور اس پر تعمیر کرنا بھی جائز ہے۔



(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ۱/۱٦٦

(۲) البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلوته، تحت قوله: (ولا يخرج من القبر): ۲/۳٤۲

پختہ قبریں بنانا

سوال نمبر(209):

قبر کی پختہ تعمیر کرنے کا کیا حکم ہے؟ پہلے سے پختہ بنائی گئی قبر کا حکم بھی بیان کریں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

قبر ایک بالشت کی مقدار اونچی اور کوہان نما شکل بنانا مسنون ہے۔قبر کو پختہ بنانا مکروہ ہے،لہٰذا قبر کچی بھی ہو اور مذکورہ مقدار (ایک بالشت) سے زیادہ اونچی نہ ہو، مربع نما شکل نہ ہو، بلکہ کوہان نما شکل ہو، تاہم پہلے سے پختہ تعمیر شدہ قبر کو اپنی حالت پر چھوڑنا بہتر ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویسنم القبر قدر الشبر، ولا یربع، ولا یحصص، ولا بأس برش الماء علیه.(۱)

ترجمہ:

قبر کوہان نما ایک بالشت مقدار اونچی بنائی جائے، مربع شکل میں نہ بنائی جائے اور نہ چونے کی لپائی دی جائے البتہ اس پر پانی چھڑکنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔



میت کو قبر میں رکھنے کا طریقہ

سوال نمبر(210):

ہمارے ہاں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد بعض لوگ میت کا رُخ قبلہ کی طرف کرتے ہیں، جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میت کو لحد میں ایسا لٹاؤ کہ منہ سیدھا آسمان کی طرف ہو۔اصل حکم کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

بینوا توجروا

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوٰة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن:۱/۱٦٦

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اس کو دائیں کروٹ پر اس طرح لٹانا کہ منہ قبلہ کی طرف ہو، مسنون طریقہ ہے۔ اس طریقہ سے میت کو قبر میں رکھنا مستحسن اور شریعت کے مطابق ہے۔ میت کے منہ کو سیدھا آسمان کی طرف کرنا خلافِ سنت ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویوضع في القبر علی جنبه الأیمن مستقبل القبلة.(۱)

ترجمہ:

اور میت کو قبر میں اس طرح رکھا جائے کہ دائیں کروٹ پر لٹا کر منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔

❁❁❁

قبر پر تدفین کے بعد تلاوت

سوال نمبر(211):

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد قبر کی ایک جانب سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری جانب آخری رکوع پڑھا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کی ایک جانب سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری جانب آخری رکوع پڑھنا ایک مستحب عمل ہے جو کہ آثارِ صحابہ سے ثابت ہے اور میت کی ثابت قدمی اور سوال و جواب میں آسانی پیدا کرنے کے لیے مفید ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قبر کے اوپر اس کے پڑھنے کو مستحب سمجھتے تھے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله: (وجلوس) لما في سنن أبي داؤد: كان النبي ﷺ إذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره،

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن: ۱۶۶/۱

وقال: استغفروا لأخيكم واسئلوا الله له التثبت، فإنه الآن يُسأل. وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها.(١)

ترجمہ:

ابوداود میں روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوجاتے تو قبر پر کھڑے ہوکر فرمایا کرتے: ''اپنے بھائی کے لیے مغفرت طلب کرو اور اللہ سے ثابت قدمی کا سوال کرو، کیوں کہ اب اس سے سوال کیا جائے گا ابن عمرؓ دفن کے بعد قبر پر سورۂ بقرہ کا پہلا اور آخری حصہ تلاوت کرنا پسند کرتے تھے۔

❁❁❁

میت کو دفنانے کے بعد منتقل کرنا

سوال نمبر(212):

مردے کو دفنانے کے دس بارہ دن بعد قبر سے نکالنا اور کسی دوسری جگہ منتقل کرنا از روئے شریعت کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کو دفنانے کے بعد کسی اور جگہ منتقل کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے، البتہ اگر مردہ کو کسی ایسی زمین میں دفن کیا گیا ہو، جو کسی نے غصب کی ہو یا شفعہ کی بنا پر اس زمین میں کسی کا استحقاق ثابت ہوجائے تو پھر مالک زمین کو اختیار ہے کہ مردہ کو یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کرنے کا حکم دے یا زمین کو ہموار کر کے اس میں کاشت کرتا رہے، گویا مغصوبہ زمین سے مردہ کو نکالنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

والدّليل على ذلك:

(ولا يخرج منه) بعد إهالة التراب (إلا) لحق آدمي (بأن تكون الأرض مغصوبة أو أخذت بشفعة).(٢)

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة، مطلب في دفن الميت:٣/١٤٣

(٢) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة:٣/١٤٥

ترجمہ: مٹی ڈالنے کے بعد (میت کو قبر سے) نہیں نکالا جائے گا، ہاں اگر کسی کا حق متعلق ہو جائے، مثلاً زمین مغصوبہ ہو یا شفعہ کے ساتھ حاصل کر لی گئی ہو۔

❁❁❁

دفنانے سے قبل مٹی دم کر کے قبر میں ڈالنا

سوال نمبر(213):

نمازِ جنازہ کے بعد اپنی اپنی صفوں میں مٹی دم کرانے کے لیے ترتیب وار تقسیم کرتے ہیں اور پھر وہ مٹی قبر میں میت اتارنے سے پہلے پھینک دی جاتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق تدفین کے وقت تین مٹھی مٹی لے کر اس پر مندرجہ ذیل آیت مبارکہ پڑھنا سنت ہے ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے سر کی جانب سے ایک میت کی قبر پر کھڑے ہو کر تین مرتبہ مٹی پھینک دی۔

لہٰذا مذکورہ طریقے سے مٹی لینا تو ایک مستحب عمل ہے، چاہے ایک آدمی کرے یا زیادہ کریں، تاہم اہتمام کے ساتھ نمازِ جنازہ کے بعد لوگوں میں تقسیم کر کے ان سے دم کروانا خلاف سنت ہے اس کا ترک بہتر ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ بدعت کی شکل اختیار کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

عن أبي هريرةؓ أن رسول ﷺ صلی علی جنازة، ثم أتی قبرالمیت، فحثیٰ علیه من قبل رأسه ثلاثاً.(۱)

ترجمہ:

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی، پھر قبر پر گئے اور سر کی جانب سے تین بار مٹی پھینک دی۔

(۱) سنن ابن ماجة، أبواب ماجاء في الجنائز، باب ماجاء في حثو التراب في القبر: ص ۱۱۳

ويستحب لمن شهد دفن الميت أن يحثو في قبره ثلاث حثيات من التراب بيديه جميعا،ويكون من قبل رأس الميت ،ويقول في الحثية الأولى ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ﴾ وفي الثانية ﴿وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾ وفي الثالثة ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾.(۱)

ترجمہ:

جو شخص تدفین کے وقت حاضر ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ تین مٹھی بھر مٹی دونوں ہاتھوں سے قبر کے اندر پھینک دے اور یہ مٹی پھینکنے والا قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور پہلی مٹھی پر ﴿منها خلقناكم﴾، دوسری پر ﴿وفيها نعيدكم﴾ اور تیسری پر ﴿ومنها نخرجكم تارة اخرى﴾ پڑھے۔

❁❁❁

شرقاً غرباً قبر بنانا

سوال نمبر(214):

اگر جگہ کی تنگی یا کسی اور عذر کی بنا پر قبر شرقاً غرباً بنائی جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

واضح رہے کہ قبلہ علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے۔بعض علاقوں میں قبلہ شمالاً جنوباً اور بعض میں شرقاً غرباً ہے۔قبلہ جس سمت ہوگا، قبر بھی اس کے مطابق بنائی جائے گی،اس لیے میت کو دائیں پہلو پر لٹا کر چہرہ قبلہ رخ کرنا واجب ہے اور شرقاً غرباً قبر کھودنے سے میت کا چہرہ قبلہ رُخ نہیں رہے گا،اس لیے اس طرح قبر بنانے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔تاہم ضرورت کا دائرہ الگ ہے۔

والدّليل على ذلك:

(يوجه إليها) وجوبا، وينبغي كونه على شقه الأيمن.قال ابن عابدين: قلت: ووجهه أن ظاهره التسوية بين الحياة والموت في وجوب استقباله.(۲)

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل السادس في القبر والدفن:۱/۱٦٦

(۲) ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة،مطلب في دفن الميت:۳/۱٤۱

ترجمہ:

میت کا چہرہ قبلہ رُخ کرنا واجب ہے اور مناسب یہ ہے کہ دائیں پہلو پر ہو۔۔۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:''میرے خیال میں چہرے کے وجوب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور موت میں قبلہ کی طرف رُخ کرنے کے وجوب میں مساوات ہے''۔

❁❁❁

مسلمان میت کو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کرنا

سوال نمبر(215):

سویزرلینڈ میں مسلمانوں کو کفار کے قبرستان میں دفن کر کے دس سال بعد اس قبرستان کو منہدم کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک مسلمان میت کو کسی اور ملک منتقل کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے مسلمانوں کو کفار کے قبرستان میں دفن کرنا درست نہیں۔ جہاں تک میت کو منتقل کرنے کا مسئلہ ہے تو جب تک میت کی ہڈیاں بوسیدہ نہ ہو جائیں اس وقت تک اس کے قبر کو منہدم کرنا درست نہیں اور اسی طرح کسی میت کو دو میل سے زیادہ دور دفنانے کے لیے لے جانا بھی بغیر عذر کے مکروہ ہے۔

صورتِ مذکورہ میں کفار کے قبرستان میں مسلمان کی تدفین اور دس سال بعد میت کو وہاں سے نکالنا یہ دونوں امور ناجائز ہونے کی وجہ سے میت کو پہلے ہی سے کسی اور مسلمان ملک منتقل کرنا زیادہ بہتر ہے اور عذر کی وجہ سے دو میل سے دور لے جانے سے جو کراہت لازم ہوتی ہے وہ بھی لازم نہ ہوگی۔ اگر دفن کرلیا تو بھی مذکورہ عذر کی وجہ سے منتقل کرنا درست ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

يستحب في القتيل والميت دفنه في المكان الذي مات في مقابر أولئك القوم، وإن نقل قبل الدفن إلى قدر ميل أو ميلين فلا بأس به......وبعد مادفن لا يسع إخراجه بعد مدة طويلة أو قصيرة إلا بعذر.(۱)

(۱) الفتاوى الخانية على الهندية،كتاب الصلوة،باب في غسل الميت ومايتعلق به:۱/۱۹۵

ترجمہ:

میت اس قوم کے قبرستان میں دفن کرنا جہاں موت واقع ہوئی ہے، مستحب ہے۔اگر دفن سے پہلے میل یا دومیل تک دفنانے کے واسطے لے گئے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔۔تاہم دفن کے بعد چاہے زیادہ عرصہ گزرا ہو یا تھوڑا، نکالنے کی گنجائش نہیں،مگر شدید عذر کی بنا پر (جائز ہے)۔

❁❁❁

مسلمان کو کفار کے مقبرے میں دفن کرنا

سوال نمبر(216):

مسلمان کو کفار کے قبرستان میں دفن کرنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ کفار پر مسلسل اللہ کا عذاب نازل ہوتا رہتا ہےاور مسلمان اللہ کی رحمت کا مستحق ہے،لہٰذا مسلمان کو کفار اور کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔ نیک لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اولیاء اللہ کے ساتھ دفن ہوں،تاکہ ان کی برکت سے ان کو فائدہ ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إن الموضع الذي فیه الکافر تنزل فیه اللعن والسخط، والمسلم یحتاج إلی نزول الرحمة في کل ساعة فینزه قبره من ذلك.(۱)

ترجمہ:

وہ جگہ جہاں کافر ہو لعنت اور عذاب نازل ہوتا ہے،جبکہ مسلمان ہر لمحہ رحمت کا محتاج ہوتا ہے،اس لیے مسلمان کی قبر کو (عذاب سے) بچانا ضروری ہے۔

❁❁❁

(۱) المحیط البرهاني،کتاب الصلوة،الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز،نوع في الکافریموت وله ولي مسلم:۲/۳۲۶

نابالغ کی قبر پر سورۂ بقرہ کی آیتیں پڑھنا

سوال نمبر(217):

جب کوئی بالغ مرد یا عورت مرجاتی ہے تو قبر پر سورۂ بقرہ کی اول اور آخر آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔استدلال کے طور پر عبداللہ بن عمرؓ کی روایت بیان کی جاتی ہے۔آیا چھوٹے بچے کی قبر پر بھی مذکورہ آیتیں پڑھی جاسکتی ہیں یا یہ حکم صرف بالغ اور مکلف تک محدود ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

محدثین سے اس روایت کی تشریح میں مختلف اقوال مذکور ہیں۔چنانچہ بعض محدثین کی تشریح سے ان آیات کے پڑھنے کی علت میت کو ہدیہ پیش کرنا اور ایصالِ ثواب کرنا ظاہر ہے،اس وضاحت کی روشنی میں چھوٹے بچے مستثنیٰ ہوں گے،اس لیے کہ چھوٹے بچوں کی مغفرت تو ایک امرِ مسلم ہے۔یہی وجہ ہے کہ بچوں کی دعاے جنازہ بھی بڑوں سے مختلف ہوتی ہے۔بڑوں کی دعا میں مغفرت طلب کی جاتی ہے،جبکہ بچوں کی دعا میں ان کی شفاعت اور قیامت کے لیے ذخیرہ ہونے کا سوال ہوتا ہے۔مذکورہ علت کی بجائے بعض محدثین نے اس کی علت میت کے لیے قبر میں انس ومحبت کا ماحول پیدا کرانا بیان کیا ہے،تاکہ میت قبر میں مانوس ہو۔اس علت کے پیشِ نظر مذکورہ روایت کو عموم کی حیثیت سے لینا اور اپنے اطلاق پر محمول کرنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے،کیوں کہ جس طرح بالغ عالمِ برزخ میں اُنس کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح بچے بھی۔اور قواعد کی روشنی سے بھی اس کی تائید ملتی ہے،کیوں کہ منطوق مفہوم سے اقویٰ ہوتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ حدیث کے الفاظ میں بڑوں کی کوئی قید بھی نہیں لگائی گئی ہے،بلکہ مطلق ہے۔لہٰذا جہاں بڑوں کی قبروں پر سورۂ بقرہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہاں چھوٹوں کی قبروں پر بھی پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

حدثني عبد الرحمن بن العلاء بن اللجلاج عن أبيه قال: قال لي أبي: يا بني إذا أنا مت فالحدني لحدا وضعتني في لحدي فقل: بسم الله وعلى ملة رسول الله ثم سن علي الثرى سنا ثم اقرأ عند رأسي بفاتحة البقرة و خاتمتها فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ذلك.(۱)

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۱۹/ ۲۲۰

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن علاء اپنے والد (علاء) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: مجھے میرے والد (لجلاج) نے کہا: اے میرے بیٹے! جب میں مرجاؤں، تو میرے لیے لحد بنانا، جب تم مجھے لحد میں رکھو تو کہنا: "بسم اللّٰہ و علی ملۃ رسول اللّٰہ" پھر مجھ پر مٹی ہموار کرنا، پھر میرے سر کی جانب سورۃ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات تلاوت کرنا اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔

❁❁❁❁❁

فصل في التعزية

(تعزیت کا بیان)

تعزیت اور دعا کے آداب

سوال نمبر (218):

(۱)۔۔۔نماز جنازہ پڑھنے یا پڑھانے کے بعد میت کے لیے دعاے مغفرت مانگی جائے یا نہ مانگی جائے۔ مانگنے کی صورت میں اس دعاے مغفرت کی شرعی حیثیت کیا ہوگی اور نہ مانگنے کی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

(۲)۔۔۔میت کی تدفین وتلقین کے بعد میت اور دیگر اہل قبور کے لیے دعا مانگی جائے یا نہ مانگی جائے۔ مانگنے کی حالت میں اس کی شرعاً کیا حیثیت ہے اور نہ مانگنے کے اعتبار سے کیا حکم ہوگا؟

(۳)۔۔۔مذکورہ بالا حالتوں میں اگر دعاے مغفرت شرعاً درست ہے تو پھر ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی جائے یا بغیر ہاتھ اٹھائے دعا مانگی جائے؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیے۔

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

پہلے دونوں سوالات کے بارے میں شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ فوتگی پر میت کی طرح پسماندہ ورثا بھی دعا کے محتاج ہوتے ہیں، کیونکہ غم سے نڈھال ورثا قدم بہ قدم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر کوئی ان کا سہارا بن سکے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ایسے موقع پر مسلمانوں کے لیے دو ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں، جن میں ایک تعزیت اور دوسری میت کے لیے دعا ہے۔ جہاں تک ہمارے ہاں میت کے پسماندہ ورثا کے پاس جاتے ہیں تو یہ

تعزیت ہے، یعنی پسماندہ ورثا کو صبر کی تلقین کے مترادف ہے۔ حضرت رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

"مامن مؤمن يعزي أخاه بمصيبة إلا كساه الله سبحانه من حلل الكرامة يوم القيامة". (١)

ترجمہ:

''نہیں ہے ایسا مومن جو مصیبت میں کسی بھائی کی تعزیت کرے، مگر اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن شرافت کا لباس پہنائیں گے''۔

تعزیت چونکہ ورثا کو تسلی دینا اور ان کے لیے صبر واستقامت کی دعا ہے، اس لیے اس میں بسا اوقات محض جا کر شریک رہنے سے میت کے ورثا کی تسلی ہو جاتی ہے۔ تاہم فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں یوں کہنا چاہیے کہ: اللہ تعالیٰ تمھاری میت کو بخش دے اور تجھے صبر نصیب کرے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی شامل ہوں، جو حضرت رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں:

"وأحسن ذلك تعزية رسول الله ﷺ إن لله ما أخذ، وله ما أعطى، وكل شيء عنده بأجل مسمى". (٢)

ترجمہ:

''اور تعزیت کا بہتر طریقہ رسول اللہ ﷺ کے ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو واپس لیا اور اس کے لیے ہے، جو دیا اور ہر چیز کے لیے اس کے ہاں وقت مقرر ہے''۔

چونکہ تعزیت سے تسلی دلانا مقصود ہے، اسی لیے اس میں تکرار مناسب نہیں اور نہ تین دن کے بعد جانا چاہیے، تاکہ پسماندہ گان کو غم کا دوبارہ تذکرہ نہ ہو۔ اگر کوئی دور رہتا ہو تو تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں اس کا تعزیت کے لیے حاضر ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ تعزیت کا بہترین وقت تدفین کے بعد ہے، لیکن جہاں کہیں مصیبت سے زیادہ متاثر ہو تو تدفین سے پہلے بھی تعزیت کی جا سکتی ہے۔ تعزیت کے لیے غیر مسلم کے پاس جانا بھی جائز ہے۔

(۲) دوسری چیز میت کے لیے دعا ہے، اس کے لیے کسی خاص وقت کا تعین معلوم نہیں۔ تعزیت کرتے وقت مردے کے لیے دعا مانگنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

جنازہ چونکہ خود ایک دعا ہے، ایسے وقت میں دعا کرنے کا ایک ماثور طریقہ موجود ہے، اس کے ہوتے ہوئے

(١) سنن ابن ماجة، أبواب ماجاء في الجنائز، باب ماجاء في ثواب من عزى مصابا: ص ١١٦

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ١/ ١٦٧

اپنی طرف سے دعا کے لیے دوسرے طریقے ایجاد کرنے یا اس میں اضافے کرنے سے عبادت کی مقررہ حقیقت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اس لیے جنازہ کے فوراً بعد باقاعدہ دعا کرنے کا اہتمام کرنا" زیادت علی الشرع " کے مترادف ہے۔ فقہائے کرام لکھتے ہیں:

"ولا يقوم بالدعاء بعد صلوة الجنازة؛ لأنه دعا مرة؛ لأن أكثرها دعاء".(۱)

ترجمہ:

''نماز جنازہ کے بعد دعا نہیں کریں گے، کیونکہ ایک بار دعا ہوگئی، اس لیے کہ اس کا اکثر حصہ دعا ہے۔

لیکن تشابہ کا احتمال صفوف کی کیفیت باقی رہنے تک ہے، اس لیے ہمارے شیخ حضرت مولانا عبدالحق نور اللہ مرقدہ اور ہمارے شیخ و مرشد حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم بعد کسر الصفوف (صفیں توڑنے کے بعد) دعا کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں فرماتے۔ تاہم اگر ایسی صورت میں بھی لوگ دعا کو ایک لازمی چیز قرار دیں اور اس کے بغیر جنازہ ایک ناقص دعا متصور کیا کریں تو پھر دُعا چھوڑنا بہتر ہے۔ اور تدفین کے بعد دعا پر اکتفا کیا جائے، کیونکہ تدفین کے بعد دعا کرنا حضرت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، جیسا کہ امام ابوداؤد کے حوالہ سے مروی ہے:

"عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي ﷺ إذا فرغ من دفن الميت، وقف عليه، فقال استغفروا لأخيكم واسئلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسئال".(۲)

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب آپ ﷺ فارغ ہوتے میت کی تدفین سے تو کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لیے مغفرت مانگو اور اس کی ثابت قدمی کی دعا کرو، کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔

ایسی صورت میں دوسرے مردگان بھی دعا میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میت کے لیے دعا کرنے کے بارے میں شامی کی عبارت ہے:

والسنة زيارتها قائماً، والدعاء عندها قائما، كما كان يفعله ﷺ في الخروج إلى البقيع ...... ثم يدعوا قائماً طويلاً، وإن جلس يجلس بعيداً.(۳)

---

(۱) الفتاوى البزازية على الهندية، كتاب الصلاة، الباب الخامس والعشرون في الجنائز: ۸۰/۴

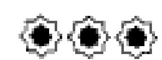
(۲) سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف: ۱۰۳/۲

(۳) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب: في زيارة القبور: ۱۵۱/۳

ترجمہ: اور سنت یہ ہے کہ میت کی زیارت اور اس کے ہاں دعا کھڑے ہو کر کی جائے، جس طرح کی نبی کریم ﷺ جنت البقیع کی طرف تشریف لیجا کر کیا کرتے۔۔۔ پھر کھڑے ہو کر لمبی دعا کرتے اور اگر بیٹھنا چاہتے تو دور جا کر بیٹھ جاتے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ اس عبارت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''اس سے دعا کا جائز ہونا ثابت ہے اور ہاتھ اٹھانا مطلقاً آدابِ دعا سے ہے تو یہ سب درست ہوا''۔

علاوہ ازیں فتح الباری کے حوالے سے حضرت رسول اللہ ﷺ کا میت کے لیے دعا کرنے میں رفع الیدین کی روایت بھی ثابت ہے۔''فأخبر النبي ﷺ حين أصبح فجاء حتى وقف على قبره فصف الناس معه ثم رفع يديه فقال: اللهم الق طلحة يضحك إليك و تضحك إليه ''اس لیے دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا حدیث سے موافقت کے علاوہ دعا کے آداب سے بھی موافقت رکھتا ہے۔(۱)



غیر مسلم کی تعزیت کرنا

سوال نمبر(219):

اگر کہیں غیر مسلم فوت ہو جائے تو اس کے رشتہ داروں کے پاس جا کر ان کو تسلی دینا اور تعزیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی کافر وفات ہو جائے تو مسلمانوں کا اس کے ورثا اور اقربا کے ساتھ تعزیت کرنا مرخص ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا نیک سلوک ہے اور کفار کے ساتھ عام نیک سلوک کرنے سے مسلمانوں کو منع نہیں کیا گیا ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مناسب ہے کہ کافر کے فوت ہونے کی صورت میں اس کے رشتہ دار کے ساتھ تعزیت کی جائے اور اس کو تسلی دی جائے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وفي النوادر: جار يهودي، أو مجوسي مات ابن له، أو قريب ينبغي أن يعزيه.(۲)

(۱) فتح الباري، الجنائز، الإذن بالجنازة: ۳/٤٥٤ (۲) ردّ المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع: ۹/۵۵۷

ترجمہ:

یہودی یا مجوسی پڑوسی کا بیٹا یا کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے تو مناسب ہے کہ اس کی تعزیت کرے۔

❁❁❁

تعزیت دفن سے پہلے یا بعد میں

سوال نمبر(220):

تعزیت دفن سے پہلے کرنا چاہیے یا بعد میں۔اگر دونوں جائز ہیں تو بہتر کونسی ہے؟عام طور پر دفن کرنے کے بعد لوگ تعزیت کرتے ہیں،تاہم بعض لوگ پہلے بھی کر لیتے ہیں تو اس طرح تعزیت کرنا کیسا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

تعزیت کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دفن کے فوراً بعد کی جائے،لیکن اگر صدمہ اس قدر سخت ہو کہ ورثا کو بے چین کر رکھا ہو تو پھر تعزیت قبل از دفن بھی کی جاسکتی ہے،بلکہ بہتر ہے،کیونکہ تعزیت تسلی دینے کا نام ہے اور تسلی میں جتنی جلدی ہو،مناسب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وهي بعد الدفن أولى منها قبله، وهذا إذا لم يرمنهم جزع شديد، فإن رؤي ذلك قدمـ التعزية.(۱)

ترجمہ:

دفن کے بعد تعزیت کرنا تدفین سے پہلے کی تعزیت سے بہتر ہے۔اور یہ اس وقت ہے جب اہلِ میت پر جزع فزع کے آثار شدت کے ساتھ نہ ہوں،اگر وہ بہت زیادہ بے چین اور بے قابو ہو رہے ہوں تو تدفین سے پہلے تعزیت کرنی چاہیے۔

❁❁❁

(۱)الفتاوى الهندية،كتاب الصلاة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل السادس في القبر والدفن:۱/۱٦۷

ایک مرتبہ سے زیادہ تعزیت کرنا

سوال نمبر(221):

اگر کوئی شخص ایک بار کی بجائے دوبار یا بار بار تعزیت کرتا رہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

تعزیت پسماندگان کی تسلی کے لیے ہوتی ہے۔اس لیے ایک مرتبہ تسلی دینے اور دعا کرنے سے تعزیت ہوجاتی ہے۔بار بار تعزیت کرنے سے غم کی تذکیر اور تازگی ہوتی ہے،جس کی وجہ سے تکلیف میں اضافہ ہوتا ہے،لہٰذا ایک مرتبہ تعزیت کرنے کے بعد دوبارہ تعزیت کرنا مناسب نہیں۔تاہم تعزیت کا مقصد چونکہ پسماندگان کو تسلی دلانا مقصود ہوتا ہے،لہٰذا اگر ان کا دوبارہ جانا مزید تسلی اور اطمینان کا باعث ہو تو دوبارہ جانے میں کوئی حرج نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذاعزی أهل المیت مرة،فلا ینبغي أن یعزیه مرة أخری.(۱)

ترجمہ: اہلِ میت کے ساتھ ایک بار تعزیت کرنے کے بعد دوبارہ تعزیت مناسب نہیں۔

۞۞۞

عیدین میں دوبارہ تعزیت کرنا

سوال نمبر(222):

بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جب کسی کے ہاں فوتگی ہوتی ہے تو فوتگی کے بعد پہلی عید پر لوگ اُن کے گھر اور حجرے میں دُعا کے لیے جمع ہوتے ہیں۔شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

میت کے لواحقین و پسماندگان کے ساتھ غمخواری کرنا ایک امرِ مستحسن ہے،تاہم اگر کسی نے ایک مرتبہ تعزیت

(۱)الفتاوی الهندیة،کتاب الصلاة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل السادس في القبر والدفن:۱/۱۶۷

کی ہوتو دوبارہ تعزیت کرنے کو فقہائے کرام نے مکروہ لکھا ہے، لہٰذا ہمارے علاقے میں رائج یہ رسم قطعاً نامناسب اور قابلِ ترک ہے کہ فوتگی کے بعد آنے والی پہلی عید پر پسماندگان کے ہاں جا کر دوبارہ تعزیت کرتے ہیں، خصوصاً عید کی خوشی میں اہلِ میت کے ہاں جا کر اُن کے غم کو دوبارہ تازہ کرنا اور اُن کی خوشی کو غم میں تبدیل کرنے کی قباحت کسی سے مخفی نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

التعزیة لصاحب المصیبة حسن، کذا في الظهیریة، وروی الحسن بن زیاد إذا عزّی اهل المیّت مرّةً، فلا ینبغي أن یعزیه مرّةً أخری. (۱)

ترجمہ:

مصیبت زدہ کے ساتھ تعزیت کرنا ایک امرِ مستحسن ہے اور اسی طرح ظہیریہ میں ہے اور حسن بن زیاد نے نقل کیا ہے کہ جب کسی نے اہلِ میت کے ساتھ ایک دفعہ تعزیت کی تو اس کے لیے دوبارہ تعزیت مناسب نہیں۔

❁❁❁

تعزیت کے ایام

سوال نمبر(223):

میّت کی وفات کے بعد پسماندگان کے ساتھ کتنے دنوں تک تعزیت کی جاسکتی ہے۔ اگر مقررہ وقت تک کوئی رشتہ دار وغیرہ نہ پہنچ سکا تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفیق:

تعزیت کا اصل مقصد میّت کے پسماندگان کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کا اظہار ہے، اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ پسماندگان سے تسلّی کی بجائے اُن کی تکلیف کا سبب نہ بنے۔ اسی وجہ سے شریعت میں تین دن گزرنے کے بعد تعزیت کرنا دُرست نہیں۔ اگر کوئی شخص دور دراز علاقے کا رہائش پذیر ہو یا کوئی وارث تین دن گزرنے کے بعد پہنچا تو ایسی صورت میں تین دن گزرنے کے بعد بھی تعزیت کی جاسکتی ہے۔

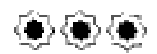
(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ۱/۱٦۷

والدّلیل علیٰ ذلک:

ووقتها من حين بموت إلى ثلاثة أيام، ويكره بعدها إلّا أن يكون المعزّي أوالمعزّى اليه غائباً.
فلابأس بها.

ترجمہ:

تعزیت کا وقت (میت کے) موت سے تین دن تک ہے اور تین دن کے بعد مکروہ ہے، لیکن تعزیت کرنے والا یا جن کے ساتھ تعزیت کی جائے، غائب ہو تو پھر (مذکورہ مدت گزرنے کے باوجود بھی تعزیت کرنے میں) کوئی مضائقہ نہیں۔



تین دن کے بعد تعزیت کرنا

سوال نمبر (224):

تین دن گزر جانے کے بعد تعزیت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعت کی رو سے تعزیت کی مدت تین دن تک ہے اور تین دن کے بعد تعزیت مکروہ اس لیے ہے کہ شریعت تین دن سے زیادہ غم منانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور تین دن کے بعد تعزیت سے غم کی یاد تازہ ہوتی ہے، تاہم اگر تعزیت کرنے والا غائب ہو یا پسماندگان موجود نہ ہوں تو پھر تین دن کے بعد بھی تعزیت کی گنجائش ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ووقتها من حين بموت إلى ثلاثة أيام، ويكره بعدها إلاأن يكون المعزى أوالمعزى إليه غائباً فلا بأس بها.(۲)

---

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوٰة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن: ۱/۱٦۷

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة،الباب الحادي والعشرون في الجنائز،الفصل السادس في القبروالدفن:۱/۱٦۷

ترجمہ: تعزیت کا وقت (میت کے) موت سے تین دن تک ہے اور تین دن کے بعد مکروہ ہے، لیکن تعزیت کرنے والا یا جن کے ساتھ تعزیت کی جائے، غائب ہو تو پھر (مذکورہ مدت گزرنے کے باوجود بھی تعزیت کرنے میں) کوئی مضائقہ نہیں۔

❁❁❁

تین دن تک مسلسل تعزیت کرنا

سوال نمبر(225):

ہمارے ہاں ایک رسم مشہور ہے کہ محلّہ کے لوگ پیش امام کی قیادت میں فجر کی نماز کے بعد اہل میت کے گھر اجتماعی دعا کرتے ہیں اور یہ عمل تین دن تک مسلسل دہرایا جاتا ہے۔تعزیت کا یہ طریقہ شریعت سے متصادم تو نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اہل میت کو تسلی دینا، صبر کی تلقین کرنا اور ان کے حق میں دعا کرنا مسنون عمل ہے۔تعزیت کا مقصد یہ ہے کہ اہل میت یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ غم میں اہل تعزیت برابر کے شریک ہیں۔اس کے برعکس اگر تعزیت مشقت اور تکلیف کا باعث ہو اور اہل میت کے لیے زحمت بن رہی ہو تو یہ مسنون تعزیت کے خلاف ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔

صورتِ مسئولہ میں برابر تین دن تک ہر دن فجر کی نماز کے بعد اہل میت کے گھر جا کر دعا کرنا، تکرارِ تعزیت ہے جس کی وجہ سے اہل میت کو بے جا تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے تکرارِ تعزیت کو غیر مستحسن اور مکروہ قرار دیا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(وتكره التعزية ثانيا)وفي التاتارخانية: لا ينبغي لمن عزى مرة أن يعزي مرة أخرى.(١)

ترجمہ: دوبارہ تعزیت کرنا مکروہ ہے۔تاتارخانیہ میں ہے کہ کسی کے لیے ایک بار تعزیت کرنے کے بعد دوبارہ تعزیت کرنا مناسب نہیں۔

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة،باب صلاة الجنائز،مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت:٣/١٤٩

تعزیت کے وقت تلاوت کرنا

سوال نمبر(226):

اگر کوئی مسلمان مرجائے تو اس کے ورثا کو تعزیت کرتے وقت خصوصی اہتمام کے ساتھ کسی مولوی صاحب کو یا ایسے شخص کو جس کو کوئی سورت زبانی یاد ہو، لے جاتے ہیں، پھر تلاوت کر کے اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تعزیت کا یہ طریقہ شریعت کی رُو سے درست ہے یا غلط؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

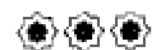
شرعی نقطۂ نظر سے میت کے گھر جا کر اس کے ورثا کو صبر کی تلقین کرنا، میت کے لیے دعا کرنا اور اس کے غم میں شریک ہو کر خیر خواہی اور ہمدردی کا اظہار کرنا سنت نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔ میت کے لیے مطلق ایصال ثواب تلاوت کی شکل میں جائز ہے، لیکن تعزیت کا ایک خاص معلوم طریقہ ہے، اس میں اپنی طرف سے لازمی اضافہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ دین میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ سنت کی اتباع ضروری ہے۔ ہاں جہاں کہیں تعزیت کی محفل میں بیٹھتے ہوئے خلافِ شرع امور زیر بحث رہیں تو ان سے بچنے کے لیے قرآن کی تلاوت کا نسخہ اپنانا مستحب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

والتعزية أن يقول: أعظم اللّٰه أجرك، وأحسن عزاءك، وغفرلميتك.(۱)

ترجمہ:

تعزیت کا طریقہ ہے کہ یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا اجر بڑھا دے، تیرے غم کو اچھا (یعنی ختم اور ہلکا) کر دے، اور تیری میت کی مغفرت فرما دے۔



(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنائز، مطلب في دفن الميت:۳/۱٤۷

فصل في زيارة القبور

(قبروں کی زیارت کا بیان)

تین دن قبرستان جانا

سوال نمبر(227):

میت کی تدفین کے بعد مسلسل تین دن تک اہلِ میت اور اس کے اقربا اہتمام کے ساتھ قبر پر جاتے ہیں اور جو رشتہ دار نہیں جاتے، ان سے ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبرستان جانا زائرین کے لیے باعثِ عبرت وثواب ہے اور اہلِ قبر کے لیے بھی مفید ہے، لیکن اس مستحب عمل کے ساتھ اپنی طرف سے قیودات لگانا، جن کا شریعت میں کوئی ذکر نہ ہو، قابلِ اعتبار نہیں، بلکہ دین میں زیادت کے مترادف ہے۔

لہٰذا قبرستان جانے کے لیے تین دن کا تعین اور جو رشتہ دار نہیں جاتے، ان سے ناراضگی کا اظہار، ان امور کا دین سے کوئی واسطہ نہیں، اس لیے مسنون طریقہ سے زیارتِ قبور درست ہے اور مذکورہ مروجہ طریقہ مناسب نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن عائشةؓ قالت: قال رسول اللّٰه ﷺ: "من أحدث في أمرنا هذا ماليس منه، فهو رد". (۱)

ترجمہ:

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ: ''جس نے ہمارے دین میں اس طرح اضافہ کیا کہ جو دین میں نہ ہو تو وہ نا قابلِ اعتبار ہے''۔



(۱) صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة: ۲/۷۷

خواتین کا قبرستان جانا

سوال نمبر(228):

نوجوان لڑکیوں کا والدین کی قبروں کی زیارت کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

بعض علمائے کرام کے نزدیک اگرچہ عورتوں کا قبروں پر جانا مباح ہے، بشرطیکہ شرعی پابندیاں ملحوظ ہوں، لیکن اس پُرفتن دور میں عورتوں کے قبرستان جانے سے مختلف مفاسد پیدا ہونے کا قوی امکان ہوتا ہے، پردے کا لحاظ نہیں کرتیں اور نوحہ خوانی وغیرہ کر کے غیر شرعی امور کا ارتکاب کرتی ہیں، اس لیے عورتوں کا قبرستان جانے سے نہ جانا بہتر ہے، خاص کر غیر محارم کے مزارات پر جانے سے گریز کریں۔ ہاں جہاں کہیں والدین یا کسی محرم کی قبر پر جانا ہو تو احتیاطی پہلو اختیار کرنے کے بعد جانے کی گنجائش ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(وبزيارة القبور......ولوللنساء) وقيل تحرم عليهن ،والأصح أن الرخصة ثابتة لهن.(١)

ترجمہ:

قبروں کی زیارت جائز ہے۔۔۔۔اگرچہ عورتیں ہوں۔ کہا گیا ہے کہ:'' عورتوں کی زیارتِ قبور حرام ہے''۔ صحیح قول یہ ہے کہ ان کے لیے بھی اجازت ثابت ہے۔

❁❁❁

عورتوں کا تین دن تک قبر کے پاس تلاوت کرنا

سوال نمبر(229):

بعض عورتیں مردہ کو دفنانے کے بعد مسلسل تین روز تک سورج نکلنے سے پہلے میت کی قبر کے پاس تلاوت کرتی ہیں۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ سورج نکلتے وقت مردہ گھبراتا ہے۔ یہ عقیدہ اور عمل شرعاً کیسا ہے؟

(١) ردالمحتار على الدرالمحتار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة، مطلب في زيارة القبور:٣/ ١٥٠

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

وفات کے بعد میت کے ایصالِ ثواب کی نیت سے قرآن پڑھنا اور صدقہ خیرات کرنا جائز ہے، لیکن اس مقصد کے لیے قبر کے پاس جانا ضروری نہیں، بلکہ کہیں بھی بیٹھ کر تلاوت کرنے سے ثواب میت تک پہنچتا رہتا ہے۔ جہاں تک خواتین کا قبروں کی زیارت کا مسئلہ ہے تو اگر آداب کی رعایت رکھتے ہوئے جائیں اور مقصود غم کو تازہ کرنا نہ ہو، بلکہ محض ایصالِ ثواب اور ترحم وشفقت ہو تو عمر رسیدہ عورتوں کے لیے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس میں تین دن کی تخصیص کرنا اور خاص صبح کے وقت اس نیت سے جانا کہ سورج نکلتے وقت میت گھبراتا ہے، خلافِ سنت ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ جوان عورتوں کے لیے قبروں کے پاس جانے کو بھی فقہائے کرام نے مکروہ فرمایا ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

قوله:(وبزيارة القبور)أي لابأس بهابل تندب كما في البحرعن المجتبى......قوله: ولوللنساء، وقيل تحرم عليهن، والأصح أن الرخصة ثابتة لهن.......وقال الخيرالرملي:......وإن كان للاعتباروالترحم من غيربكاء......فلابأس إذا كن عجائز،ويكره إذاكن شوابّ،كحضورالجماعة في المساجد، وهو توفيق حسن.(١)

ترجمہ:

اور قبروں کی زیارت میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ مستحب ہے، جیسا کہ بحر میں ہے۔۔۔۔۔اور عورتوں کے بارے میں بعض کے ہاں حرمت کا قول ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے لیے بھی رخصت ثابت ہے۔ اور علامہ خیر الرملی فرماتے ہیں کہ: ”اگر ایصالِ ثواب اور شفقت کی وجہ سے بغیر نوحہ اور رونے کے ہو تو کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ عورتیں بوڑھی ہوں۔ اور جوان عورتوں کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ مساجد میں جماعت کے لیے ان کی حاضری مکروہ ہے اور یہ سب سے بہترین تطبیق ہے“۔



(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة،مطلب في زيارة القبور:١/ ١٥٠،١٥١

قبروں پر غلاف چڑھانا اور طواف کرنا

سوال نمبر(230):

اولیاے کرام کی قبروں پر غلاف چڑھانا اور طواف کرنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ جمعہ کے دن خاص کر اپنے مریضوں کو اولیاے کرام کی قبروں پر لے جاتے ہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

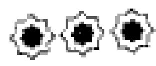
قبر کی زیارت سے غرض اگر صاحب قبر سے مرادیں مانگنا ہو یا مشکلات حل کرانا ہو تو شرعاً یہ قطعی طور پر ممنوع اور حرام ہے، البتہ اگر زیارت عبرت، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کا استحضار اور صاحب قبر کے لیے دعاے مغفرت کی نیت سے ہو تو یہ باعث اجر ہے۔ مذکورہ اغراض کے علاوہ قبروں پر غلاف چڑھانا، عرس کرنا اور وہاں ٹھہرنے کی شرعاً کوئی حقیقت نہیں اور ایسے تمام امور بدعت کے زمرے میں آتے ہیں، جن سے احتراز ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن ابن مسعودؓ: أن رسول الله ﷺ قال: "كنت نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها فإنها تزهد في الدنيا وتذكر في الآخرة.(١)

ترجمہ:

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے تمھیں زیارتِ قبور سے روکا تھا، پس تم زیارت کرو، اس لیے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا کرتی ہے"۔



(١) سنن ابن ماجة،أبواب ماجاء في الجنائز،باب ماجاء في زيارة القبور:ص:١١٢،١١٣

قبرستان پرسلام کا جواب

سوال نمبر(231):

قبرستان پر گزرتے ہوئے کون سی دعا پڑھی جائے۔نیز السلام علیکم کا جواب بعد میں خود دینا ضروری ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبرستان پر گزرتے وقت السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا اهل القبور، اہل الدیار اور دوسری مسنون دعائیں پڑھنا سنت ہے۔مسنون دعاؤں میں" السلام علیکم یا أهل القبور یغفراللہ لنا ولکم أنتم لنا سلف ونحن بالاثر وانا انشاء اللہ لکم لا حقون" وغیرہ کی دعائیں پڑھنا چاہیے۔تاہم مُردوں کی طرف سے واپس سلام کا جواب خود دینا درست معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ احادیثِ مبارکہ میں یہی منقول ہے کہ کوئی بھی آدمی کسی صاحب قبر پر اس حالت میں نہیں گزرتا کہ وہ سلام کرے اور وہ اس کو دنیا میں پہچانتا تھا تو صاحب قبر بھی اس کو پہچانتا ہے اور سلام کا جوب بھی دیتا ہے، لہٰذا سلام کا جواب خود دینا ضروری نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ما من عبد یمر بقبررجل کان یعرفه في الدنیا، فیسلم علیه إلاعرفه وردّ علیه السلام.(۱)

ترجمہ:

جب کوئی آدمی کسی قبر سے گزرے اور وہ اس کو دنیا میں جانتا تھا، اور اس کو سلام کرے تو وہ اس کو جانتا ہے اور سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔

یقول السلام علیکم یاأهل القبور یغفر اللہ لنا ولکم أنتم لناسلف ونحن بالأثر.(۲)

ترجمہ:

اور کہے گا اے قبروالو! تم پر سلام ہو، اللہ تمھیں اور ہمیں بخش دے، تم آگے چلے گئے اور ہم تمھارے پیچھے ہیں۔

(۱) کنزالعمال، الباب الثالث فی أمور بعد الدفن، الفصل الثالث في زیارۃ القبور، رقم(٤٢٥٥٦): ١٥/ ٦٤٦

(۲) الفتاوی الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب السادس عشر في زیارۃ القبور: ٥/ ٣٥٠

فصل في متفرقات الجنائز

(جنائز کے متفرق مسائل کا بیان)

میت کی وصیت کے بغیر ورثا کا نمازوں کا فدیہ ادا کرنا

سوال نمبر(232):

ایک آدمی مر گیا اور اس کے ذمہ نمازوں کی قضا واجب ہے۔ کوئی وصیت نہیں کی اور نہ ہی کوئی مال چھوڑا ہے، تو کیا ورثا کا اس کی طرف سے فدیہ دینا ضروری ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص کے ذمہ قضا نمازیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ مرنے سے پہلے قضا لائے۔ اگر زندگی میں قضا نہ لا سکا تو پھر اپنے ورثا کو فوت شدہ نمازوں کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرے، اس صورت میں اگر میت کا مال موجود ہو تو ورثا پر اس کے ثلث مال سے فدیہ دینا واجب ہوگا۔ ہر نماز کے بدلے میں پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کریں۔ اگر مرحوم نے وصیت نہ کی ہو اور یا ترکہ نہ چھوڑا ہو تو پھر ورثا پر اس کی طرف سے فدیہ دینا لازم نہیں، البتہ اگر دیں گے تو یہ ان کی طرف سے تبرع اور احسان ہوگا۔

والدليل على ذلك:

وإن لم يوص لورثته وتبرع بعض الورثة يجوز، ويدفع عن كل صلوة نصف صاع حنطة منوين.(۱)

ترجمہ:

اگر میت نے وصیت نہیں کی اور ورثا میں سے کوئی احسان کے طور پر فدیہ دینا چاہے تو جائز ہے اور ہر نماز کے بدلے نصف صاع گندم، یعنی پونے دو سیر ادا کرے گا۔

❁❁❁

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت: ۱/ ۱۲۵

ایصالِ ثواب کے لیے نماز پڑھنا

سوال نمبر(233):

اگر کوئی شخص نفل نماز پڑھ کر اس کا ثواب تمام مسلم امت کو بخش دے اور دل میں یہ ہو کہ پوری امت کی مغفرت ہوجائے۔ازروئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

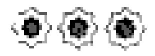
تمام امتِ مسلمہ کے گناہوں کی مغفرت کے لیے استغفار اور صلوۃ حاجت پڑھنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ مستحسن ہے۔زندہ لوگوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی ثواب پہنچتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی مالی عبادت، یعنی صدقہ وغیرہ کر کے اس کا ثواب مسلمانوں کے نام کردے تو سب مسلمانوں کو اس کا اجر پہنچے گا اور خود کرنے والا بھی اجر سے محروم نہ ہوگا

والدّلیل علیٰ ذلک:

من صام أو صلیٰ أو تصدق و جعل ثوابه لغیره من الأموات، والأحیاء جاز.(۱)

ترجمہ:

جو شخص روزہ رکھے یا نماز پڑھے یا صدقہ کرے اور اس کا ثواب زندہ اور مردوں کے نام کردے تو ایسا کرنا جائز ہے۔



ماہِ رمضان اور جمعہ کے دن عذابِ قبر میں تخفیف

سوال نمبر(234):

علمائے کرام سے سنتے آرہے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن یا ماہِ رمضان میں وفات پائے گا، اس کو عذابِ قبر نہیں ہوگا۔اگر یہ درست ہے تو پھر جمعہ کے دن مرنے کا اعتبار ہے یا دفن ہونے کا؟ وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا توجروا

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ، مطلب فی القراءۃ للمیت:۱۵۲/۳

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبر کا عذاب حق ہے۔کافر اور گناہ گار مسلمان کو عذاب ہوگا،لیکن جمعہ اور رمضان میں مرنے والے مسلمانوں کو عذاب نہیں ہوگا۔یہ فضیلت روح نکلنے کے ساتھ خاص ہے،لیکن امام نسفیؒ کی تحقیق کے مطابق جمعہ کے دن بالعموم عذاب نہیں ہوگا،اس صورت میں جمعہ کے دن دفن ہونے والا بھی اس فضیلت میں داخل ہوگا،کیونکہ امام نسفیؒ کے قول کے مطابق جمعہ کے دن عذاب قبر اٹھ جائے گا۔پھر کافر پر لوٹ آئے گا اور مسلمان پر قیامت تک نہیں لوٹے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال أهل السنة والجماعة: عذاب القبر حق......لكن إن كان كافرا، فعذابه يدوم إلى يوم القيامة ،ويرفع عنه يوم الجمعة ،وشهر رمضان......والمؤمن العاصي يعذب ويضغط،لكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها،ثم لايعود.(١)

ترجمہ:

اہلِ سنت والجماعۃ فرماتے ہیں کہ قبر کا عذاب حق ہے۔۔۔۔لیکن اگر کافر ہو تو اس کا عذاب قیامت تک جاری رہے گا اور جمعہ کے دن اٹھ جائے گا اور رمضان کے مہینے میں بھی۔۔۔۔اور مومن گناہ گار کو عذاب ہوگا،لیکن جمعہ کے دن اور رات کو اُٹھ جائے گا،پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔



جنازہ اٹھانے کا مسنون طریقہ

سوال نمبر(235):

جنازہ اُٹھانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا ضرورت کے وقت مقررہ طریقہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟اور خلافِ سنت ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

(١) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب الصلاة،باب الجمعة،مطلب:مااختص به يوم الجمعة:٣/٤٤

الجواب وباللہ التوفیق:

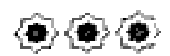
اس میں کوئی شک نہیں کہ کندھا دیکر چار آدمیوں کا جنازہ اُٹھانا سنت ہے، لیکن جہاں کہیں راستہ تنگ ہو اور کندھا دیکر گزرنا دشوار ہو تو پھر کندھے سے اتار کر ہاتھوں کے سہارے سے دو آدمیوں کے لے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عذر کی بنا پر ایسا کرنے سے خلاف سنت لازم نہ ہوگا، تاہم جہاں کوئی عذر نہ ہو، وہاں کندھا دیکر لے جانا زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ بغیر عذر کے دو آدمیوں کا اس طرح لے جانا کراہت سے خالی نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

سنّ في حمل الجنازه أربعة من الرجال......يكره حملها بين العمودين بأن يحملها رجلان أحدهما مقدمها والآخر مؤخرها إلا عند الضرورة.(۱)

ترجمہ:

چار آدمیوں کا جنازہ اٹھانا سنت ہے۔ جنازہ دو بازوؤں کے درمیان اس طرح اٹھانا مکروہ ہے کہ دو آدمی اٹھائے، ایک آگے سے اور دوسرا پیچھے سے پکڑ کر اٹھائیں، مگر ضرورت کی بنا پر مکروہ نہیں (مثلاً جگہ کا تنگ ہونا)۔



میت کے گرد ذکر کرنا

سوال نمبر(236):

بعض علاقوں میں مردے کو غسل دے کر لے جاتے وقت چارپائی پر رکھ کر اس کے اردگرد دائرہ بنا کر ذکر کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ میت کو غسل دے کر اس کے قرب وجوار میں ذکر اور تلاوت کرنا جائز ہے، لیکن جس وقت غسل دیا جا رہا ہو، اس وقت بلند آواز سے ذکر کرنا مناسب نہیں۔ یہ بھی واضح ہو کہ عموماً ایسی محافل میں عورتوں اور

---

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الصلوة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة: ۱/ ۱۶۲

غیر محرم مردوں کا بے جا اختلاط ہوتا ہے جو جائز نہیں۔ خیال رکھنا چاہیے کہ مستحب عمل کی ادائیگی سے کسی حرام کا ارتکاب لازم نہ آئے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وأصحابنا كرهوا القراءة بعد موته حتى يغسل (١)

ترجمہ: اور ہمارے علمانے مرنے کے بعد اور غسل سے پہلے میت کے پاس تلاوت کو مکروہ قرار دیا ہے۔

❁❁❁

قرآنی آیات یا کلمہ والی چادر کا میت پر ڈالنا

سوال نمبر(237):

ہمارے علاقے میں غسل اور تکفین کے بعد میت کے اوپر سبز رنگ کی چادر ڈالی جاتی ہے، جس پر قرآنی آیات یا کلمہ لکھا ہوتا ہے۔ ازروئے شریعت اس کی کیا حیثیت ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مردے کے بے اختیار ہونے کی وجہ سے ایسی چادر جس پر کلمہ یا قرآنی آیت لکھی گئی ہو، میت کے اوپر ڈالنا مناسب نہیں، کیونکہ اس میں بے احترامی کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

كتابة القرآن على ما يفرش ويبسط مكروهة ...... بساط أو مصلىٰ كتب عليه "الملك لله" يكره بسطه، والقعود عليه واستعماله.(٢)

ترجمہ:

کسی چیز پر قرآن لکھنا جو بستر بنائی جائے یا ویسے بچھائی جائے، مکروہ ہے۔۔۔۔۔چادر یا جائے نماز جس پر "الملک" لکھا ہوا ہو، اس کا بچھانا اور اس پر بیٹھنا اور اس کا استعمال مکروہ ہے۔

(١) رد المحتار على الدر المختار، باب صلاة الجنازة، مطلب في القرأة عند الميت: ٣/٨٤

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد: ٥/٣٢٣

میت کا چہلم

سوال نمبر(238):

میت کی فوتگی کے دن سے جب چالیس دن پورے ہوجاتے ہیں تو اہلِ میت کھانے کی دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ میت کے لیے ایصالِ ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا، خیرات کرنا اور نوافل پڑھنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ باعثِ اجر بھی ہے، لیکن فوتگی کے پہلے دوسرے اور تیسرے دن میت کے گھر میں کسی بھی مقصد کے لیے کھانا تیار کرنا اور لوگوں کو کھلانا مکروہ ہے۔اسی طرح ہفتہ مکمل ہوجانے کے بعد یا پہلے جمعرات اور جمعہ کے دن اس کو لازم سمجھ کر کرنا یا اپنی طرف سے تاریخ متعین کرنا بھی مکروہ ہے۔چہلم، یعنی چالیسویں دن میت کے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا تیار کرنا ایک معاشرتی رسم ہے اور ہمارے معاشرے میں اسے خاص چالیسویں دن کیا جاتا ہے، لہٰذا اس سے احتراز ضروری ہے۔شریعت میں کوئی ضروری نہیں کہ چالیسویں کا اہتمام ہو، البتہ اگر بغیر کسی تعین کے صدقہ کیا جائے یا کسی کو کھانا کھلا دیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ یتیموں کا مال نہ ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث. وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم.(۱)

ترجمہ:

اور (فوتگی کے) پہلے (دوسرے اور) تیسرے دن کھانا تیار کرنا مکروہ ہے۔اور ہفتے کے بعد اور خاص مواقع پر کھانا قبروں کے پاس لے جانا بھی مکروہ ہے۔

ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت؛ لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة.وروى الإمام أحمد وابن ماجة بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله، قال: كنا نعد

(۱) ردّالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلوة، باب صلوة الجنازة، مطلب في كراهية الضيافة من أهل الميت:۳/۱۴۸

الاجتماع إلی أهل المیت و صنعهم الطعام لهم من النیا حة.(۱)

ترجمہ:

اہلِ میت سے کھانے کی ضیافت کرانا مکروہ ہے، کیونکہ ضیافت خوشی میں ہوتی ہے، غم میں نہیں اور یہ ایک قبیح بدعت ہے۔امام احمد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ جریر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ ہم اہلِ میت کے پاس جمع ہونا اوران کا کھانا تیار کرنا نوحہ شمار کرتے تھے (جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے)۔



مسجد میں نمازِ جنازہ کا اعلان

سوال نمبر(239):

مسجد کے لاؤڈ سپیکر میں میت کے جنازہ کا اعلان کرنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مساجد عبادت کے لیے بنائی گئی ہیں، اس لیے مسجد میں ہر اس عمل کی گنجائش ہوگی، جو عبادات کے قبیلہ سے ہو، چونکہ نمازِ جنازہ بھی ایک عبادت ہے تو اس کے لیے لوگوں کو بلانا جائز ہے۔حضور اکرم ﷺ نے نجاشی کی موت کا برملا اعلان کرتے ہوئے لوگوں کو نمازِ جنازہ پڑھنے کی تلقین کی تھی۔

لہٰذا مساجد میں لاؤڈ سپیکر میں جنازہ کا اعلان جائز ہے۔تاہم اگر لاؤڈ سپیکر کا مائیک مسجد سے باہر ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن جابر قال: قال النبي ﷺ حین ما ت النجاشي "مات الیوم رجل صالح، فقوموا فصلوا علی أخیکم أصحمة.(۲)

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الجنازۃ، مطلب في کراهیة الضیافة من أهل المیت: ۱۴۸/۳

(۲) صحیح البخاري، کتاب المناقب، باب بنیان الکعبة: ۵۴۷/۱

ترجمہ:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے، کہ نجاشی کی موت کے وقت حضورﷺ نے فرمایا: "آج ایک نیک آدمی کا انتقال ہوا ہے، سب اس کی نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ"۔

❁❁❁

نمازِ جنازہ کا اعلان کرنا

سوال نمبر(240):

کوئی شخص فوت ہو جائے تو اس کی نمازِ جنازہ کے لیے اعلان کرنا کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنا، اس کے حقوق میں شامل ہے۔ لوگوں کو نمازِ جنازہ میں شرکت کا موقع فراہم کرنے کے لیے اعلانات کرانا اور انہیں اطلاع دینا ایک مستحسن امر ہے، لہٰذا لوگوں کی رغبت اور سہولت کو دیکھ کر نمازِ جنازہ کے اعلانات کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویستحب أن یعلم جیرانه،وأصدقاؤه،حتّی یؤدواحقه بالصلاة علیه والدعاء له،کذا في الجوهرة النیّرة،وکره بعضهم النداء في الأسواق ،والأصح أنه لا بأس به،کذا في محیط السرخسي(۱)

ترجمہ:

اور میت کے پڑوسیوں اور دوست احباب کو خبر دینا مستحب ہے، تاکہ اس کا نمازِ جنازہ پڑھ کر اس کا حق ادا کریں اور اس کے لیے دعا کریں۔ اسی طرح جوہرہ میں ہے اور بعض علما نے بازاروں میں اعلان کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ اسی طرح سرخسی کی محیط نامی کتاب میں ہے۔

❁❁❁

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الصلوٰة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر: ۱/۱۵۷

جنازگاہ میں میت کا چہرہ دیکھنا

سوال نمبر(241):

نمازِ جنازہ سے پہلے یا بعد میں میت کا چہرہ دیکھنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟ عام طور پر لوگ میت کا چہرہ جنازگاہ میں اجتماعی طور پر دیکھتے ہیں، وضاحت کریں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

میت کا چہرہ نماز سے پہلے یا نماز کے بعد دیکھنا جائز ہے، لیکن دفنانے کے بعد جائز نہیں۔

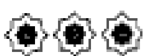
صورتِ مسئولہ میں جنازگاہ میں میت کا چہرہ دیکھنے میں کوئی قباحت نہیں، البتہ نماز پڑھ لینے کے بعد چہرہ دیکھنے کے بہانے تدفین میں دیر کرنا مناسب نہیں، اس لیے نمازِ جنازہ سے پہلے دیکھنا مناسب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولا بأس بأن يرفع ستر الميت ليرى وجهه، وإنمايكره ذلك بعد الدفن.(۱)

ترجمہ:

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میت (کے چہرے) سے پردہ اٹھایا جائے، تاکہ (لوگ) اس کا چہرہ دیکھیں، البتہ نماز کے بعد مکروہ ہے۔



نفلی عبادات کا ایصالِ ثواب

سوال نمبر(242):

کیا اذان، اقامت اور نفلی نمازیں والدین کے لیے ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور مالی عبادات، یعنی صدقات وغیرہ کے ایصالِ ثواب کا کیا حکم ہے؟

بینوا تؤجروا

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب السادس عشرفي زيارة القبور:٥/٣٥١

الجواب وباللہ التوفیق:

ایصالِ ثواب کی نیت سے جو نیک اعمال کیے جاتے ہیں تو ان کا اجر خود عامل بھی حاصل کرتا ہے اور جن لوگوں کے ایصالِ ثواب کے لیے یہ اعمال کیے ہیں، ان کو بھی ثواب پہنچتا ہے، البتہ محض بدنی عبادات کے ایصالِ ثواب میں اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم فقہائے احناف بدنی عبادت کے ایصالِ ثواب کے جواز کے بھی قائل ہیں۔

جملہ عبادات کا ثواب دوسروں کے لیے مفید ہے اور جس طرح والدین کے لیے ایصالِ ثواب کرنا درست ہے، اسی طرح دوسرے رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کی نیت کرنے سے بھی ان کو ثواب پہنچتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من صام أو صلی أو تصدق، وجعل ثوابه لغيره من الأموات، والأحياء جاز، ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة. (۱)

ترجمہ:

جس نے روزہ رکھا، نماز پڑھی یا صدقہ کیا اور اس کا ثواب مردہ اور زندہ لوگوں میں سے کسی کو بخش دے تو یہ جائز ہے اور اس کا ثواب اہلِ سنت والجماعۃ کے نزدیک ان تک پہنچے گا۔

❁❁❁

فرائض اور واجبات کا ایصالِ ثواب

سوال نمبر (243):

جس طرح ایصالِ ثواب نوافل میں جائز ہے تو کیا فرائض بھی کوئی شخص کسی کے نام بخش سکتا ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

ایصالِ ثواب جس طرح نوافل کا جائز ہے، اسی طرح فرائض اور واجبات ادا کرنے کے بعد کسی کو بخشنے میں بھی کوئی قباحت نہیں، اگرچہ عمل کرتے وقت یہ نیت نہ ہو، بلکہ بعد میں ارادہ بنا ہو۔ فرائض بخشوانے کے بعد یہ فرائض دوبارہ

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة للميت: ۱۵۲/۳

ادا کرنا ضروری نہیں، کیونکہ یہ توہم پیدا ہو سکتا ہے کہ جب فرائض کسی اور کو بخش دیں تو اس کے ذمہ ان فرائض کا دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا، لیکن فی الواقع اس کا ذمہ فارغ ہو چکا ہے اور کسی کو بخشنا اس کی طرف سے تبرع اور احسان ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الأصل أن كل من أتى بعبادةٍ مّا له، جعل ثوابها لغيره، وإن نواها عند الفعل لنفسه. قال ابن عابدين عن البحر: إطلاقهم شامل للفريضة، لكن لايعود الفرض في ذمته.(۱)

ترجمہ:

قاعدہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو بھی عبادت اپنے لیے کرے تو اس کا ثواب کسی اور کو بخش سکتا ہے، اگرچہ اس نے بوقتِ عمل نیت اپنے لیے کی ہو۔ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ: ''ان اعمال کا اطلاق فرائض پر بھی ہوتا ہے، لیکن ایصالِ ثواب کرنے سے یہ فرض اس کے ذمے واپس نہیں لوٹتا''۔

❁❁❁

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے مسجد میں رقم لگوانا

سوال نمبر(244):

میت کے ایصالِ ثواب کے لیے مسجد کی تعمیر میں رقم دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صدقاتِ واجبہ کے مصارف متعین ہونے کی وجہ سے انہی مصارف پر خرچ کرنا ضروری ہے، اسی وجہ سے غیر فقیر کو دینا درست نہیں، کیونکہ ایسے صدقات میں تملیک ہوتی ہے اور مسجد میں خرچ کرنے سے تملیک کی شرط پوری نہیں ہوتی، لیکن جہاں تک صدقاتِ نافلہ کا تعلق ہے تو اس کے لیے کوئی متعین مصرف نہیں، اس لیے فقیر، غنی، مسجد وغیرہ میں خرچ کرنا جائز ہے اور مسجد کی تعمیر پر خرچ کرنا تو افضل بھی ہے کہ صدقہ جاریہ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لايجوز صرف جميع الصدقات المفروضة والواجبة إليه......لعموم قوله تعالى: ﴿إنما

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، باب الحج عن الغير: ۱۰/۴

الصدقات للفقراء﴾......وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛لانهاتجري مجرى الهبة.(۱)

ترجمہ:

تمام فرض اور واجب صدقات غنی کو دینا جائز نہیں۔۔۔۔۔اس قول کے عموم کی وجہ سے صدقاتِ واجبہ صرف فقرا کے لیے خاص ہیں۔۔۔۔اور صدقاتِ نافلہ غنی کو دینا بھی جائز ہے، یہ ہبہ کے قائم مقام ہیں (صدقاتِ نافلہ کا خرچ دیگر جگہوں میں جائز ہے)۔

❁❁❁

ایصالِ ثواب کا بہترین طریقہ

سوال نمبر(245):

ایصالِ ثواب کا بہترین طریقہ کون سا ہے، جس سے مردے کو زیادہ سے زیادہ ثواب اور فائدہ ہو؟ اور میت کے ایصالِ ثواب کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کی نیت بھی کرسکتا ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کوئی کسی میت کو خیر خواہی کی بنیاد پر کسی نیک عمل کے ثواب پہنچانے کا متمنی ہو تو میت کے لیے بنیادی چیز قرضوں کی ادائیگی ہے، اگر اس پر کسی کا حق اور قرضہ نہ ہو تو پھر کسی فقیر کو صدقہ کے طور پر رقم دینا میت کے ایصالِ ثواب کی نیت سے زیادہ بہتر ہے۔ صدقہ دیتے وقت اگر تمام مسلمان مرد و عورتوں کے ایصالِ ثواب کی نیت کرے گا تو سب کو ثواب پہنچے گا اور اس میت کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی، یہ ایصالِ ثواب کا بہترین طریقہ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والأفضل لمن يتصدق نفلاً أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛ لأنها تصل إليهم،ولا ينقص من أجره شيء.(۲)

(۱) بدائع الصنائع،كتاب الزكوة،فصل في الذي يرجع إلى المؤدى إليه:۲/۴۷۵،۴۷۶

(۲) ردالمحتارعلى الدرالمختار،كتاب الصلوة،باب صلوة الجنازة،مطلب في القراءة للميت:۳/۱۵۱،۱۵۲

ترجمہ:

نفلی صدقہ دینے والے کے لیے بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مرد وعورتوں کی نیت کرے، کیونکہ ثواب سب کو پہنچتا ہے اور اس کے اجر میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوگی۔

❁❁❁

زندگی کے تمام اعمالِ صالحہ کا ایصالِ ثواب

سوال نمبر(246):

ایک شخص اپنی زندگی کے تمام اعمالِ صالحہ تمام زندہ اور مُردہ مسلمانوں کو بخشنے کی نیت کرے تو خود اس شخص کے ثواب میں کمی آتی ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اہلِ سنّت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص تمام زندہ اور مُردہ مسلمانوں کو ایصالِ ثواب کر سکتا ہے۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو شخص نفلی صدقہ کرتا ہو تو اس کو تمام مسلمانوں کی ایصالِ ثواب کی نیت کرنی چاہئے اور اس شخص کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی،لیکن بعض حضرات اس میں فرائض ونوافل کی کوئی قید نہیں لگاتے۔ان حضرات کی رائے کو دیکھتے ہوئے، اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے تمام اعمال دوسرے کو بخش دے تو یہ دُرست ہے اور ایسا کرنے سے اس شخص کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

صرّح علماءنا في باب الحجّ عن الغير، بأنّ للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة، أو صوماً، أو صدقةً، أو غيرها، بل في زكوٰة التاتارخانية عن المحيط: الأفضل لمن يتصدّق نفلاً أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء......وأنّه لافرق بين الفرض والنفل.(۱)

(۱) ردالمحتار، كتاب الصلوٰة ، باب الجنازة،مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له : ۱۵۱/۳، ۱۵۲

ترجمہ: باب الحج عن الغیر میں علمانے اس بات کی تصریح کی ہے کہ انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ایصالِ ثواب دوسروں کے لیے کرسکتا ہے، چاہے وہ نماز ہو، روزہ ہو یا صدقہ یا اس کے علاوہ ہو، بلکہ تاتارخانیہ کے باب زکوٰۃ میں بحوالہ محیط منقول ہے کہ ''نفلی صدقہ دینے والے کے لیے افضل یہ ہے کہ صدقہ کرنے والا تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کی نیت کرے، کیوں کہ یہ اُن کو پہنچتا ہے اور اُس کے اجر میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔۔۔۔اور فرض اور نفل میں کوئی فرق نہیں''۔

❁❁❁

مردوں کو ایصالِ ثواب کا حکم

سوال نمبر(247):

شریعت میں ایصالِ ثواب کا کیا تصور ہے؟ اگر ایک شخص کوئی نفل عبادت تمام مسلمانوں کو بخش دے تو کیا ہر مسلمان مردے کو کھمل ثواب ملتا ہے یا اُس ثواب کو اُن تمام مُردوں میں تقسیم کیا جائے گا؟ نیز بخشنے والے کو ثواب ملتا ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

ہر انسان موت کے بعد نیک اعمال کا محتاج رہتا ہے اور نیک اعمال کا مُردوں تک پہنچنا تب ممکن ہے، جب کوئی مسلمان کسی عمل کا ثواب اُن کو بخش دے۔ اگر کوئی شخص ایصالِ ثواب کے وقت تمام مسلمانوں کی نیت کرے تو تمام مسلمانوں کو برابر ثواب ملتا ہے اور خود بخشنے والا بھی اس عمل کے ثمرات سے محروم نہیں رہتا، اسی وجہ سے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ: ''جب کوئی شخص نفل عبادت کے ایصالِ ثواب کا ارادہ رکھتا ہو تو بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مُردوں کی نیت کرے''۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الأفضل لمن يتصدّق نفلاً أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛ لأنها تصل إليهم، ولا ينقص من أجره شيء.(۱)

(۱) ردالمحتار، كتاب الصلوٰة، باب الجنازة، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له: ۳/۱۵۱، ۱۵۲

ترجمہ: نفلی صدقہ دینے والے کے لیے بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مردو عورتوں کی نیت کرے، کیونکہ ثواب سب کو پہنچتا ہے اور اس کے اجر میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوگی۔

❁❁❁

میت کا پیٹ چاک کر کے اعضا باہر نکالنا

سوال نمبر(248):

بیرونِ ملک رہائش پذیر شخص جب فوت ہو جائے تو اس کو ملک منتقل کرنے سے پہلے قانونی کارروائی پوری کرنے میں وقت لگتا ہے جس میں میت کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، اس صورت حال سے بچنے کے لیے میت کے پیٹ کو چیر کر اندرونی اعضا باہر نکال دیے جاتے ہیں۔ از روئے شریعت میت کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے۔ انسان کی تعظیم جس طرح اُس کی زندگی میں ضروری ہے، مرنے کے بعد بھی اُس کے ساتھ زندہ انسان والا معاملہ کیا جائے گا، لہٰذا اس کے نعش کو چیر پھاڑ نا جائز نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے اقدام کا سبب نہ بنیں، جن کی وجہ سے مردے کے جسم کی بے حرمتی ہو۔ بہتر یہ ہے کہ میت کو منتقل نہ کیا جائے، تاکہ چیر پھاڑ سے محفوظ رہے۔ ہاں جہاں کہیں قانونی تقاضوں کی تکمیل ہو تو وہ انسان کے دائرہ سے ماورا ہے۔

اس لیے صورتِ مسئولہ میں میت کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس کے جسم کو چیر پھاڑ نا جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

عن عائشةؓ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قال: كسر عظم الميت ككسره حيًا.(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مردہ کی ہڈیاں توڑنا (گناہ کے اعتبار سے) زندہ شخص کی ہڈیوں کے توڑنے کی مانند ہے“۔



(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان: ۱۰۲،۱۰۱/۲

کتاب الزکوٰۃ

(مباحثِ ابتدائیہ)

تعارف اور حکمتِ مشروعیت:

لفظِ زکوٰۃ بنیادی طور پر تزکیہ وصفائی اور نشوونما و ترقی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اس عزیز مال کو خرچ کرتا ہے جس پر اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار ہے اور مشقت و تکلیف سے کمایا گیا ہے تب بخل کی گندگی اور حبِ مال کی مہلک بیماری اس کے اندر سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان میں بھی شدت وصلابت اور ترقی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظامِ زکوٰۃ اسلام کے ان امتیازات میں سے ہے جو سراسر ہمدردی، ایثار اور خیر پر مشتمل ہے، جس میں ایک طرف اپنے خالقِ حقیقی اور محسن و منعم کے ان گنت احسانات کا شکر ادا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کے ناتواں اور حاجت مند لوگ اس سے مستفید ہو کر معاشرے میں عزت کی زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یوں دولت کی ریل پیل اور چہک ومہک محض چند ہاتھوں تک محدود رہنے کی بجائے تقسیمِ دولت کے اس منصفانہ نظام سے غربا فقرا کی ضروریات کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے اور امیر وفقیر کے مابین وجود میں آنے والی فطری کشمکش، نفرت وعداوت میں بدلنے کی بجائے محبت و ایثار میں بدل جاتی ہے، جس سے معاشرے میں غریب کے استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کا رجحان ختم ہو کر معاشی استحکام کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو ایک مضبوط معیشت اور ریاست کی تشکیل کا بنیادی عنصر اور کلید شمار ہوتی ہے۔ (۱)

زکوٰۃ کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

زکوٰۃ لغت میں کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام لغوی معانی کی زکوٰۃ کے اصطلاحی معنی کے ساتھ گہری مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے چند مشہور معانی یہ ہیں: طہارت و پاکیزگی، نماء یعنی بڑھوتری، زیادتی برکت، مدح اور ذکرِ خیر۔

اصطلاحِ شریعت میں زکوٰۃ کا معنی ہے: "تمليك جزء مال عيّنه الشارع من مسلم فقير غير هاشمي ولا مولاه مع قطع المنفعة عن المملّك من كل وجه لله تعالى"

(۱) احکام اسلام عقل کی نظر میں، حصہ اول، کتاب الزکوۃ، ص: ۳-۹۴۰۹، بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ: ۲/ ۳۷۳، حجة الله البالغة، مبحث في أبواب من الزكوة: ۲/ ۳۹

خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے مال کے ایسے مخصوص حصے کا کسی مسلمان فقیر کو مالک بنانا، جس حصے کو شارع (پیغمبرِ خدا ﷺ) نے خود متعین کر دیا ہو، بشرط یہ کہ وہ مسلمان فقیر نہ تو ہاشمی ہو، نہ ہاشمی کا آزاد کردہ غلام ہو اور نہ اس سے زکوٰۃ دینے والے کو (بالواسطہ یا بلاواسطہ) کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو۔

مختصراً ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں:

"تمليك مال مخصوص لشخص مخصوص".(۱)

مخصوص مال کا مخصوص آدمی کو مالک بنانا۔

زکوٰۃ سے ملتی جلتی اصطلاحات:

(۱) صدقہ......: ہر وہ چیز یا مال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی کو دے دیا جائے، صدقہ کہلاتا ہے، چاہے اس چیز یا مال کو خود شریعت نے واجب کیا ہو یا واجب ہوئے بغیر دے دیا جائے۔ صدقہ کا مفہوم زکوٰۃ یعنی صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ سب کو شامل ہے، اسی وجہ سے زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) عطیہ......: عطیہ اس چیز یا مال کو کہتے ہیں، جو اللہ کی رضا، باہمی محبت واُلفت یا کسی اور نیک مقصد کے لیے کسی کو بلاعوض دے دیا جائے۔ عطیہ کا مفہوم اس اعتبار سے زکوٰۃ وصدقہ سے زیادہ وسیع ہے۔(۲)

زکوٰۃ سے متعلقہ اصطلاحات:

(۱) مزکی، مصدِّق، متصدِّق، مؤدِّی......: زکوٰۃ دینے والے شخص کو مذکورہ تمام ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲) مؤدَّیٰ إلیہ، مصدَّق، متصدَّق......: جس شخص کو زکوٰۃ دی جائے اس کو مذکورہ ناموں سے ذکر کیا جاتا ہے۔

(۳) عامل یا ساعی......: حکومت یا قاضی وغیرہ کی طرف سے زکوٰۃ لینے کے لیے مقرر کیے جانے والے شخص کو عامل یا ساعی کہتے ہیں۔

---

(۱) الدر المختار على صدر رد المحتار، كتاب الزكوة:۳/۱۷۰-۱۷۳، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الزكوة:۵۸۷

(۲) الموسوعة الفقهية، مادة زكوة:۲۳/۲۲۶

زکوٰۃ کی مشروعیت اور فرضیت:

زکوٰۃ کی فرضیت قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہر ایک سے ثابت ہے۔ اکثر فقہاء و محدثین کے ہاں زکوٰۃ کی فرضیت ہجرت کے دوسرے سال صوم رمضان کی فرضیت سے پہلے ہوئی۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں بتیس مواضع پر زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم نماز کے ساتھ متصل آیا ہے، یعنی نماز کے بعد اسلام کا سب سے اہم رکن زکوٰۃ ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ (۱)

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ﴾ (۲)

ان (مال داروں) کے مالوں سے زکوٰۃ لے کر ان کے ظاہر و باطن کو پاک کرو۔ اور انکے لیے دعائیں کرو۔

کتب حدیث میں زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کے احکام سے متعلق مستقل ابواب قائم کیے گیے ہیں۔ اسی طرح علامہ کاسانیؒ نے اجماع امت اور قیاس ہر ایک سے زکوٰۃ کی فرضیت پر مستقل بحث کی ہے۔ (۳)

کتاب الزکوٰۃ کا اجمالی خلاصہ:

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ: زکوٰۃ اصل میں دو قسم کی ہے: فرض اور واجب۔ فرض زکوٰۃ وہ ہے، جو مال کے بدلے ہو اور واجب زکوٰۃ وہ ہے، جو انسانی جان کے شکرانے کے طور پر واجب ہو، جس کو صدقہ فطر بھی کہتے ہیں۔ پھر مال کی زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں۔ سونے، چاندی، سامانِ تجارت اور جانوروں کی زکوٰۃ کو ''زکوٰۃ'' ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ سبزیوں، میووں اور غلہ جات کی زکوٰۃ وغیرہ کو ''عشر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۴)

زکوٰۃ کا حکم شرعی:

زکوٰۃ کی فرضیت قطعی ہونے کی وجہ سے اس کی فرضیت سے انکار کرنے والا فقہائے کرام کے ہاں بالاتفاق کافر ہے، البتہ فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے اجتماعی طور پر ادائیگی سے انکار کرنے والے افراد کو احادیث مبارکہ اور ابوبکر صدیقؓ کے اثر اور فیصلے کی روشنی میں زجراً مارنا بھی جائز ہے۔ حنفیہ کے راجح قول کے مطابق زکوٰۃ کی فرضیت علی الفور ہے، یعنی نصاب کی بقدر مال پر سال گزر جانے کے باوجود زکوٰۃ کی ادائیگی میں بلا عذر تاخیر کرنا گناہ اور سبب فسق

(۱) البقرۃ:۴۳ (۲) التوبۃ:۱۰۳ (۳) بدائع الصنائع، کتاب الزکوٰۃ:۲/۳۷۱

(٤) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ: ٢/ ٣٧١

ہے، تاہم تاخیر کے باوجود ادائیگی سے ذمہ فارغ ہوجاتا ہے۔(۱)

زکوٰۃ کا سبب:

زکوٰۃ کا سبب مالِ نامی، یعنی بڑھنے والا ایسا مال ہے جس پر مکمل سال گزر جائے۔(۲)

شرائطِ زکوٰۃ:

دوسری عبادات کی طرح زکوٰۃ کے فرض ہونے کے لیے بھی شریعت نے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں۔ یہ شرطیں بنیادی طور پر دو طرح کی ہیں: ایک اس شخص سے متعلق، جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور دوسری خود اُس مال سے متعلق، جس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔

زکوٰۃ ادا کرنے والے سے متعلق شرائط:

(۱) مسلمان ہونا......: کافر اور مرتد شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

(۲) زکوٰۃ کی فرضیت کا علم ہونا......: تاہم یہ اس شخص کے لیے ہے جو دار الحرب میں اسلام لایا ہو۔

(۳) بالغ ہونا......: حنفیہ کے ہاں نابالغ پر نہ تو خود زکوٰۃ واجب ہے اور نہ ہی اس کے مال سے ولی کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حق ہے۔

(۴) عاقل ہونا............: دائمی پاگل شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں اور نہ ہی اس کے مال سے ولی کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حق ہے۔

(۵) آزاد ہونا......: غلام شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(۶) مقروض نہ ہونا......: قرض یا حقوق العباد میں سے کسی مالی حق کی موجودگی میں اس قرض اور حق کی بقدر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ چاہے قرض کا مطالبہ فی الحال ہو رہا ہو یا اس کے لیے کوئی وقت مقرر ہو۔(۳)

(١) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها: ١/ ١٧٠، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في كيفية فرضها: ٢/ ٣٧٣_٣٧٦، الموسوعة الفقهية، مادة زكوة: ٢٣/ ٢٣٠، ٢٣١

(٢) بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في سبب فرضيتها: ٢/ ٣٧٦، الدر المختار، كتاب الزكوة: ٣/ ١٧٤

(٣) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها: ١/ ١٧١، ١٧٢، بدائع الصنائع، كتاب

زکوۃ، فصل فی شرائط الفرضیۃ:۲/۳۷۷_۳۸۳، الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۳/۱۷۳، ۱۷۴

واضح رہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مقیم ہونا شرط نہیں، لہٰذا مسافر پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۱)

مال سے متعلق شرائط:

پہلی شرط......ملکیت کا پایا جانا:

جو مال کسی معین شخص کی ذاتی ملک میں نہ ہو، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، مثلاً: موقوفہ اموال میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ یہ حکم اس مال کا بھی ہے جس کو جنگ کے دوران دشمن چھین کر اس پر زبردستی قبضہ کرلے۔

دوسری شرط......مکمل ملکیت (ملکِ تام) کا پایا جانا:

ملکِ تام سے مراد یہ ہے کہ وہ مال اس کی ملکیت میں بھی ہو اور قبضہ وتصرف میں بھی۔ اگر کسی مال میں صرف ملکیت ہو، لیکن قبضے اور تصرف کا حق نہ ہو، جیسے قبضہ سے پہلے مہر یا مرتہن کے ہاتھ میں رکھی ہوئی رہن، تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اسی طرح ملکیت کے بغیر صرف تصرف اور قدرت سے بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، جیسے مقروض کے پاس موجود قرض مال پر زکوۃ واجب نہیں۔

مالِ ضمار کی حقیقت اور حکم:

ملکیت کے ساتھ ''تام'' کی قید لگانے سے معلوم ہوا کہ جو مال کسی شخص کی ملکیت میں تو ہو لیکن وہ اس میں تصرف اور اس سے انتفاع پر قادر نہ ہو تو جمہور حنفیہ کے ہاں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اگرچہ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ ایسے اموال میں بھی زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ فقہائے کرام ایسے مال کو مالِ ضمار کہتے ہیں، جیسے: گم شدہ یا بھاگا ہوا جانور یا غلام، گم شدہ مال، دریا میں ڈوب جانے والا مال، کسی بادشاہ یا جابر شخص کا غصب کیا ہوا مال، ایسا قرض جس کے بارے میں قرض خواہ کے پاس کوئی دلیل اور گواہ نہ ہو اور مقروض اس کا منکر ہو، کسی صحرا یا کھلی جگہ میں وہ دفن شدہ مال جس کی جگہ معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل فی الشرائط التی ترجع إلی المال:۲/۳۹۰، الفتاوی التاتارخانیۃ، کتاب الزکوۃ، الفصل العاشر:۲/۲۱۸

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل فی الشرائط التی ترجع إلی المال:۲/۳۸۹، ۳۹۰، الفتاوی الهندیۃ، حوالہ بالا:۱/۱۷۲، الهدایۃ مع فتح القدیر، کتاب الزکوۃ:۲/۱۲۱، ۱۲۲

دیون، یعنی کسی کے ذمہ واجب الادا قرض کی زکوٰۃ:

جو سامان یا رقم دوسروں کے ہاں بطور دین یا قرض باقی ہو، اس میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے متعلق درج ذیل اصول کی رعایت رکھنی ضروری ہے۔

(۱) اگر مدیون دین کا انکار کرتا ہو اور ثبوت فراہم نہ ہو تو اس کو مالِ ضمار کہتے ہیں، لہٰذا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر ایسا مال اتفاقاً مل جائے یا گواہ فراہم ہو جائے تو ایسی صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) مدیون دین کا انکار کر رہا ہو، لیکن اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو یا قاضی کو اس دین کا علم ہو تو اس صورت میں مشہور قول کے مطابق اس دین کی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن عدالت کی پیروی، گواہوں کو گواہی کے لیے تیار کرنے کی سعی اور عدالت سے انصاف کی توقع چونکہ موجودہ دور میں ایک مشکل کام ہے، اس لیے فقہائے متاخرین نے اس صورت کو بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

(۳) اگر مدیون کبھی تو اقرار کر رہا ہو اور کبھی انکار، تو جب تک قاضی کی عدالت میں گواہی یا اس کے ذاتی اقرار سے دین کی ادائیگی کا فیصلہ نہ ہو، اس وقت تک اس دین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ فیصلے اور حکم نامے سے قبل محض عدالت میں حاضری اور پیروی سے زکوٰۃ کا حکم نہیں لگے گا۔

(۴) اگر دین کسی ایسے شخص پر ہو جو اس کا اقرار کر رہا ہو تو چاہے وہ تنگ دست ہو یا خوش حال، بہر صورت اس دین کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۵) ایسا مقروض جو اقرار تو کر رہا ہو، لیکن دیوالیہ ہو گیا ہو تو جب تک عدالت اس کی تفلیس، یعنی دیوالیہ ہونے کا فیصلہ نہ کرے، اس دین میں زکوٰۃ واجب ہوگی، تاہم حسن بن زیادؒ کے ہاں اس مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لیے کہ صاحبِ دین اس مال سے نفع نہیں اٹھا سکتا اور اگر عدالت نے اسے مفلس قرار دے دیا، تب امام محمدؒ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، امام ابوحنیفہؒ کے ہاں واجب ہوگی۔(۱)

دیون کی کون سی قسموں میں زکوٰۃ واجب ہے؟

امام ابوحنیفہؒ نے بدل اور عوض کے اعتبار سے دین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، جن میں سے ہر ایک کا حکم

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/ ۳۹۰، ۳۹۱، الهداية مع فتح القدير، كتاب الزكوة: ۲/ ۱۲۱۔۱۲۴

بھی الگ الگ ہے۔

(۱) دَینِ قوی...... یہ وہ دَین ہے، جو بطورِ قرض دیا گیا ہو یا سامانِ تجارت کی قیمت ہو اور مدیون اس کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی تنگ دست اور دیوالیہ نہ ہو، بلکہ دین ادا کرنے کے لائق ہو۔ دین کی مذکورہ قسم میں بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہے، تاہم زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم تب لگے گا، جب نصابِ زکوٰۃ کا پانچواں حصہ، یعنی چالیس درہم مدیون سے وصول ہو جائیں تو وہ ان چالیس دراہم میں سے گزشتہ سالوں کے بقدر ایک ایک درہم زکوٰۃ دے دے گا۔ اسی طرح جتنا قرض وصول ہوتا رہے گا، اسی کے بقدر زکوٰۃ دی جائے گی۔

(۲) دَین متوسط...... دینِ متوسط سے مراد غیر تجارتی اموال کی قیمت ہے، جیسے رہائشی مکان یا استعمال کی چیز کی قیمت وغیرہ۔ ملازم کی اجرت اور مکان کے کرایہ کو بھی فقہاے کرام نے اسی زمرہ میں رکھا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے اس دَین کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ: جب اس دین سے مکمل ایک نصاب، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا دوسو درہم کے مساوی پیسے حاصل ہو جائیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ: محض نصاب کے بقدر پیسوں کی وصولی سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جب تک اس پر مکمل سال نہ گزر جائے۔ علامہ ابن ہمامؒ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، جب کہ علامہ کاسانیؒ نے دوسرے قول کو "اصح الروایتین" لکھا ہے۔

(۳) دَین ضعیف...... اس سے مراد وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں نہ ہو، خواہ اس میں اس کے عمل کو دخل ہو، جیسے: مہر، بدلِ خلع یا صلح عن القصاص یا اس کے عمل کو کوئی دخل نہ ہو، جیسے میراث یا وصیت۔ مذکورہ دین میں بالاتفاق اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں، جب تک مکمل نصاب کے بقدر دین کی وصولی کے بعد اس پر ایک مکمل سال نہ گزر جائے۔

دین کی مذکورہ تین اقسام کا مذکورہ حکم صرف امام ابوحنیفہؒ کے ہاں ہے۔ صاحبین کے ہاں دین کی تمام اقسام میں قبضہ سے پہلے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور قبضہ کے بعد چاہے وصول ہونے والا دین نصاب کے برابر ہو یا نہیں، بہر صورت اس سے زکوٰۃ کی مقررہ مقدار ادا کی جائے گی، تاہم حنفیہ کے ہاں فتویٰ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہے۔(۱)

تیسری شرط...... مال کا نامی ہونا:

شریعتِ مطہرہ نے زکوٰۃ انہیں اموال میں واجب قرار دی ہے جن میں تجارت یا پرورش کے ذریعے اضافہ

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوٰۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/۳۹۲، فتح القدير، كتاب الزكوة: ۲/۱۲۳، الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها: ۱/۱۷۴، ۱۷۵

ممکن ہو، یعنی اس مال کی موجودہ حالت اس لائق ہو کہ اس کے ذریعے معاشی بڑھوتری ہوسکتی ہو۔ (۱)

چوتھی شرط......حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونا:

حاجتِ اصلیہ سے مراد ضروری اور استعمال کی چیزیں ہیں، جیسے: رہائشی مکانات، استعمال کے کپڑے، سواری کے جانور یا گاڑی، حفاظت کے ہتھیار، زیبائش و آرائش کے سامان، سونے چاندی کے علاوہ بقیہ قیمتی دھاتوں کے مستعمل برتن وغیرہ، کہ ان سب میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ صنعتی آلات و آرائش اور وہ مشینیں جو سامان تیار کرتی ہیں اور خود باقی رہتی ہیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ کرائے کی گاڑی بھی اسی حکم میں داخل ہے، البتہ وہ آلات اور اشیا جو کسی چیز کی تیاری میں استعمال کرنے کے بعد اس چیز کا حصہ بن جاتے ہوں، جیسے رنگ اور تیل وغیرہ تو ایسی اشیا میں سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مطالعہ کی کتابیں بھی ضرورت کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں (۲)۔

پانچویں شرط......سال کا گزرجانا:

فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ مختلف مالوں میں زکوٰۃ کا جو نصاب شریعت نے مقرر کیا ہے، اس کے مالک ہونے کے بعد سال گزرجائے، تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ زرعی پیداوار اور پھلوں میں کٹائی چنائی کے فوراً بعد عشر نکالنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر سال کے درمیان مقدارِ نصاب میں کمی ہوجائے، لیکن اختتامِ سال پر مقدارِ نصاب یا اس سے زیادہ مال موجود ہو تو تمام موجودہ مال کی زکوٰۃ واجب ہوگی، درمیان میں کمی کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر سال کے درمیان مال میں اضافہ ہوجائے تو اگر اضافہ شدہ مال اصل نصاب کی جنس سے ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس اضافی مال پر سال کا گزرنا شرط نہیں، بلکہ اصل جنس کے ساتھ ملاکر زکوٰۃ ادا کی جائے گی، چاہے یہ اضافہ اس اصل نصاب کی تجارت ہو یا توالد وتناسل کا نتیجہ ہو یا کسی اور خارجی سبب، یعنی میراث، وصیت یا ہبہ وغیرہ کی وجہ سے یہ اضافہ ہوا ہو، سب کا حکم ایک ہی ہوگا، تاہم اگر اضافہ شدہ مال (مالِ مستفاد) اصل نصاب کے جنس سے نہ ہو تو اسے الگ

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلی المال: ۳۹٤/۲، الفتاوی الهندية، کتاب الزکوۃ، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها: ۱۷٤/۱

(۲) بدائع الصنائع حواله بالا: ۳۹٤/۲، الهداية مع فتح القدير، کتاب الزکوۃ: ۱۱۹/۲ـ۱۲۱، الفتاوی الهندية، کتاب الزکوۃ، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها: ۱۷۲/۱

شمار کر کے ایک مستقل سال تک مؤخر کیا جائے گا۔(۱)

چھٹی شرط......مالِ نصاب کا قرض سے خالی ہونا:

انسان کے ذمے جو "دیون اور واجبات" ہوتے ہیں، ان میں سے کون سے زکوٰۃ کے وجوب میں مانع ہیں اور کون سے مانع نہیں، اس سلسلے میں حنفیہ کے ہاں بنیادی اصول درج ذیل ہیں۔

(۱) ہر وہ دین یا قرض جس سے متعلق انسانوں میں سے کوئی مطالبہ کرنے والا موجود ہو تو وہ زکوٰۃ کے نصاب کی تکمیل میں مانع بنتا ہے۔ یہ دین یا قرض بندوں کا حق بھی ہو سکتا ہے، جیسے: قرض، مبیع کی قیمت، کسی جنایت یا زخم وغیرہ کا جرمانہ وتاوان، بدلِ خلع، قتلِ عمد میں صلح کے بدلے واجب ہونے والا مال وغیرہ۔ مذکورہ دیون چاہے فی الحال واجب الادا (معجّل) ہوں یا تاخیر کے ساتھ (مؤجل)، اور چاہے نقود میں سے ہوں یا مکیل وموزون ہوں یا کپڑوں، حیوانات یا کسی اور جنس سے ہوں۔

اسی طرح اگر کوئی دَین ایسا ہو جو بنیادی طور پر تو اللہ تعالیٰ کا حق ہو، لیکن بندوں میں سے کوئی اس کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو تو ایسا دَین بھی طرفین کے ہاں بہر صورت زکوٰۃ کے نصاب کی تکمیل میں مانع بنے گا۔ جیسے کسی شخص نے کئی سالوں تک زکوٰۃ نہیں دی ہو تو یہ زکوٰۃ اس کے ذمے ایک ایسا دین ہے، جس کا مطالبہ سلطان، امام یا قاضی کی جانب سے ممکن ہے، اس لیے یہ دین بھی زکوٰۃ سے مانع ہے۔

نذور، کفارات، صدقہ فطر اور وجوب حج جیسے دیون کا مطالبہ کرنا چونکہ بندوں کی جانب سے ممکن نہیں، اس لیے یہ زکوٰۃ سے مانع نہیں۔

عورت کے مہر کے بارے میں حنفیہ کے ہاں راجح قول یہ ہے کہ: جو مہر مؤجل ہو لیکن شوہر اس کو ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہو تو ایسا مہر زکوٰۃ کے وجوب میں مانع نہیں۔ زمین کی پیداوار، یعنی عشر کے وجوب پر دَین کا کوئی اثر نہیں۔ اس کی تفصیل باب العشر میں آجائے گی۔(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلی المال: ۲/۳۹۹۔۴۰۱، الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوۃ، الباب الأول في تفسیرها وصفتها وشرائطها: ۱/۱۷۵

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في شرائط الفرضیة: ۲/۳۸٤۔۳۸۷، الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوۃ، الباب الأول في تفسیرها وصفتها وشرائطها: ۱/۱۷۲، ۱۷۳، الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الزکوۃ: ۳/۱۷٦۔۱۷۸

ساتویں شرط.......:

ہر مال ایک مکمل نصاب کے برابر ہو۔ جس میں ہر ایک کی مقدار درج ذیل ہے۔(۱)

سونے چاندی کا نصاب:

سونے کی وہ مقدار جس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، بیس دینار (مثقال) ہے، جس کی مقدار رائج الوقت اوزان کے مطابق ساڑھے سات تولہ، یعنی 87.48 گرام ہے۔ چاندی کی مقدار دوسو درہم ہے، جس کی رائج الوقت مقدار ساڑھے باون تولہ یعنی 612.36 گرام ہے۔ ہندوستان کے اکثر علما کا فتویٰ اس پر ہے۔(۲)

سونا چاندی جس شکل میں بھی ہو، زکوۃ کے وجوب کے سلسلے میں سب کا حکم ایک ہے، البتہ سونے چاندی کو ڈھالنے اور زیورات وغیرہ بنانے میں کچھ نہ کچھ ملاوٹ چونکہ ناگزیر ہوتی ہے، اس لیے فقہاے کرام کا خیال ہے کہ: اگر سونے چاندی کی مقدار غالب اور کھوٹ کی مقدار کم ہوتو وہ مکمل سونا چاندی ہی سمجھا جائے گا اور اگر کھوٹ غالب ہوتو بحکم سامانِ تجارت ہے، لہٰذا اس کی قیمت کو دیکھا جائے گا۔ اگر اس کی قیمت سونے چاندی کی نصاب تک پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔ اور اگر خالص اور کھوٹ کا حصہ برابر ہوتو احتیاط اسی میں ہے کہ زکوۃ ادا کی جائے۔ اسی طرح اگر سونا چاندی مخلوط ہوتو اس میں بھی غالب چیز کے اعتبار سے نصاب کا حکم لگایا جائے گا۔(۳)

سونے اور چاندی کے ناقص نصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کا حکم:

جہاں کہیں دو ناقص نصاب موجود ہوں، یعنی کچھ سونا اور چاندی ہو یا اس کے ساتھ کچھ مالِ تجارت ہو یا نقد رقم ہوتو ایسی صورت میں اگر دونوں ناقص نصابوں کو ملا کر کسی ایک جنس کا نصاب پورا ہوتا ہوتو پھر ادنیٰ نصاب کا اعتبار کر کے اس میں زکوۃ واجب رہے گی۔ ایسی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے ہاں دونوں ناقص نصابوں کی قیمت لگا کر دیکھا جائے گا، اگر وہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب رہے گی۔ ہماری کتابوں میں یہی قول مفتیٰ بہ چلا آرہا

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰

(۲) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الأول في زكوة الذهب والفضة: ۱/۱۷۸، ۱۷۹، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في بيان مقدار النصاب في الذهب والفضة: ۲/۴۰۵، اوزان شرعيه، رائج الوقت اوزان کے مطابق نقشہ، ص: ۶۲

(۳) الفتاوی الهندية حوالہ بالا: ۱/۱۷۹، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في بيان صفة النصاب: ۲/۴۰۶، ۴۰۷، وفصل في صفة نصاب الذهب: ۲/۴۱۰، الهداية وفتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في الفضة: ۲/۱۶۲

بے یقین موجودہ دور میں اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کسی سے مخفی نہیں۔اس سے ایسی خواتین اور مردوں پر بھی زکوٰۃ اور قربانی واجب رہے گی جن کی معاشی حالت اور قوتِ خرید انتہائی کمزور ہو۔اس کی بنیادی وجہ اقتصادی میدان میں فراتفری اور اقتصاد کے پہیہ میں تبدیلی ہے،چنانچہ اس قول کی بنیاد پر آج معاشرے کی اٹھانوے فیصد خواتین اس مشکل کا شکار ہیں،کیونکہ ایک تولہ سونا اور چند سو روپے سے ان کا ہاتھ شاذ و نادر خالی ہوتا ہے۔اس نازک مرحلہ پر علمائے کرام کو باریک بینی سے کام لینا چاہیے،تاکہ معاشرے کی اکثریت وجوب کے ہوتے ہوئے عمل نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار نہ ہوں۔

اس حوالے سے اگر علمائے کرام امام ابوحنیفہؒ کے قول کی بجائے صاحبین کی رائے پر نظر رکھیں تو شاید اس سے مشکلات میں کچھ حد تک کمی محسوس ہو،کیونکہ صاحبین کے نزدیک ضم میں قیمت کی بجائے اجزا کا اعتبار ہے،لہٰذا مثال کے طور پر سونے کے ایک ثلث نصاب (ڈھائی تولہ سونا) کے ساتھ چاندی کے نصاب کے دو ثلث یا اس کی قیمت کی موجودگی ضروری ہوگی۔مبسوط سرخسی اور ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہؒ سے بھی اس قسم کا ایک قول مروی ہے۔

چونکہ حالات کی تبدیلی سے ائمہ کرام کے اقوال میں ترجیحی سلوک بدلتا رہتا ہے،اس لیے اپنے ہی مذہب میں سے کسی مجتہد کے قول پر عمل کرنے میں زیادہ سہولت ہے،خاص کر جہاں کہیں امام ابوحنیفہؒ سے خود بھی روایت موجود ہو۔

مذکورہ قول جامعہ عثمانیہ کے ہاں مفتیٰ بہ ہے،جو ماہنامہ العصر شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء،ذی الحج ۱۴۲۶ھ میں دارالافتاء کے عنوان کے تحت درج ہے۔(۱)

کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ:

چوں کہ فی زمانہ کاغذی نوٹوں اور مروجہ کرنسیوں نے زمانہ قدیم کے سکوں،یعنی درہم و دینار کی جگہ لے لی ہے اس لیے فقہائے کرام کے ہاں بالاتفاق ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی،تاہم جو شرطیں سونے اور چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ہیں،وہی اس میں بھی ہوں گی اور جس طرح سونے چاندی سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔اسی طرح نوٹوں کے ذریعے بھی زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔موجودہ دور میں چاندی کا نصاب بہ مقابلہ سونے کے بہت کم قیمت کا ہوتا ہے،اس لیے چاندی کی قیمت سے کرنسیوں کے نصاب کو مربوط کرنے میں فقرا کا فائدہ ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ

---

(۱) الفتاوی الهندية حواله بالا: ۱۷۹/۱، الهداية مع فتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في العروض: ۱۶۹/۲، المبسوط: ۱۹۳/۲

میں وہی پہلو قابل ترجیح ہے، جس میں فقرا کو نفع ہو۔(۱)

سامانِ تجارت میں زکوٰۃ اور اس کا نصاب:

شریعت نے جن اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، ان میں ایک ''سامانِ تجارت'' بھی ہے۔ سامان تجارت سے مراد ہر وہ مال ہے جس کو تجارت کی نیت سے خریدا گیا ہو، چاہے کوئی سامان ہو، زمین ہو، کوئی مکیلی یا موزونی چیز ہو یا جانور وغیرہ ہوں۔ مالِ تجارت میں بھی زکوٰۃ واجب ہونے کی وہی شرطیں ہیں جو دوسرے اموال میں ہیں، البتہ حدیث میں اس کے نصاب کی صراحت نہیں ملتی، اس لیے فقہائے کرام نے اس میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے سونے اور چاندی کے نصاب کو اس کے لیے معیار بنایا ہے، تاہم سونے اور چاندی کے نصاب میں چونکہ موجودہ دور میں بہت زیادہ تفاوت ہے، اس لیے فقرا کی رعایت کرتے ہوئے چاندی کے نصاب کو معیار بنانا زیادہ مناسب ہے۔

مالِ تجارت نصاب سے کم ہو اور کچھ سونا چاندی ہو تو یہ مالِ تجارت بھی سونے چاندی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے گا، اگر ان کی مجموعی قیمت سے چاندی کا نصاب پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔(۲)

سامانِ تجارت بننے کی شرائط اور چند احکام:

(۱) دراہم و دنانیر کے علاوہ بقیہ تمام اشیا اس وقت سامانِ تجارت کہلائیں گے جب ان میں تجارت کی نیت کی جائے۔ تجارت کی نیت صراحتاً بھی ہو سکتی ہے اور دلالتاً بھی۔ صراحتاً یہ ہے کہ چیز خریدتے وقت ہی اس میں تجارت اور نفع کی نیت کی جائے، چاہے سامانِ تجارت سے خریدلے یا کسی اور چیز سے خریدلے۔ دلالتاً نیت یہ ہے کہ کسی چیز کو تجارت کی نیت کے بغیر سامانِ تجارت کے بدلے میں خرید لیا جائے، اس لیے کہ جو حکم اصل کا ہوتا ہے، وہ بدل کا بھی ہوتا ہے۔

دراہم و دنانیر ثمن خلقی ہونے کی وجہ سے نیت کے بغیر بھی سامانِ تجارت ہیں، جب کہ عشری اور خراجی زمین میں زراعت کے ہوتے ہوئے ان میں تجارت کی نیت نہیں کی جا سکتی۔

(۲) نیت کے ساتھ ساتھ عملِ تجارت بھی ہو، محض تجارت کی نیت سے ملکیت میں موجود مال، مالِ تجارت نہیں بن سکتا۔

(۱) الفتاوی الهندية، حواله بالا: ۱۷۹/۱، بدائع الصنائع، فصل في بيان صفة النصاب: ۴۰۸/۲، قاموس الفقه، مادة زكوة: ۶۹/۴، ۷۰

(۲) الهداية مع فتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في العروض: ۱۶۵/۲ـ۱۶۷، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في صفة نصاب أموال التجارة: ۴۱۵/۲ـ۴۱۷، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل الثالث: ۱۷۹/۲، الفتاوى الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض: ۱۷۹/۱

(۳) سامانِ تجارت کی قیمت کا اعتبار اس شہر کے اعتبار سے ہوگا جس میں سامانِ تجارت موجود ہو۔ اگر شہر میں دراہم ودنانیر یا مختلف سکے استعمال ہوں تو نقدِ غالب کا اعتبار کیا جائے گا۔(۱)

سامانِ تجارت میں بھی سال کا گزرنا ضروری ہے۔(۲)

اگر مال سال کے درمیان بالکل ہی ختم ہو جائے اور روپیہ پیسہ بھی نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور دوبارہ مالکِ نصاب ہونے کے بعد از سرِ نو سال گزرنے کا حساب کیا جائے گا، لیکن اگر کچھ سامانِ تجارت کا دوسرے تجارتی سامان سے تبادلہ کیا تو اس کو مال ختم ہونا نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی از سرِ نو سال گزرنے کا انتظار کیا جائے گا۔(۳)

جانوروں میں زکوٰۃ:

جانوروں کے نصاب اور زکوٰۃ سے متعلق خود حضور اکرم ﷺ نے قولی احادیث اور تفصیلی خطوط کے ذریعے وضاحت فرمائی ہے۔ نصاب اور مقدار تو مختلف جانوروں سے متعلق الگ الگ ہے، لیکن کچھ احکام ایسے ہیں جن میں تمام مویشی مشترک ہیں۔ پہلے ان احکام کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) مویشیوں میں مویشیوں والی زکوٰۃ کی شرح سے زکوٰۃ تب واجب ہوگی جب اس کی پرورش کا مقصود دودھ کا حصول اور افزائشِ نسل ہو۔ ایسے جانور جو بار برداری یا نقل وحمل کے لیے رکھے جائیں یا جن کو ذبح کر کے گوشت اور غذا بنانا مقصود ہو، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح جو جانور افزائشِ نسل کی بجائے خرید وفروخت اور تجارت کے لیے رکھے جائیں تو ان میں مالِ تجارت کے حساب سے، یعنی قیمت لگا کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) پورے سال یا سال کے اکثر حصے میں اس کے چارے کا انتظام مالک کو نہ کرنا پڑے، بلکہ وہ عوامی چراگاہوں اور کھلے میدانوں سے چر کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہوں۔

(۳) جانوروں کے نصاب میں ضروری ہے کہ ایک ہی نوع کے جانوروں کا مکمل نصاب ہو، مثلاً کچھ اونٹ ہوں اور کچھ

(۱) فتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في العروض: ۲/ ۱۶۶، ۱۶۷، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/ ۳۹۵۔۳۹۷ وفصل في صفة نصاب التجارة: ۲/ ۴۱۷، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل الثالث: ۲/ ۱۷۹، ۱۸۰

(۲) الفتاوى الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض: ۱/ ۱۷۹

(۳) الفتاوى الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى: ۱/ ۱۸۰، الفتاوى التاتارخانية، الفصل الخامس في انقطاع حكم الحول: ۲/ ۱۸۹

بکریاں تو دونوں کو ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا، البتہ ایک ہی نوع کے جانوروں میں صفات کا مختلف ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

(۴) مویشیوں میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے ضروری ہے کہ مکمل نصاب کی مقدار کے برابر جانور تمام کے تمام چھوٹے نہ ہوں، بلکہ کم از کم ایک جانور کا ان میں سے بڑا ہونا ضروری ہے۔ بڑے ہونے کی کم از کم مقدار ایک سال یا اس سے زائد عمر کا ہونا ہے۔ طرفین کے ہاں تمام مویشی اگر ایک سال سے کم ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کے ہاں انہی بچوں میں سے ایک بچہ مقررہ مقدار کے مطابق دیا جائے گا، جب کہ امام زفرؒ کے ہاں ایک سال سے کم عمر مویشیوں میں بھی بالکل اسی طرح زکوٰۃ واجب ہوگی، جس طرح بڑے جانوروں میں واجب ہوتی ہے۔ حنفیہ کے ہاں فتویٰ طرفین کے قول پر ہے۔ یہ صورت تب ممکن ہوسکتی ہے جب سال کے درمیان بڑے جانور مر جائیں یا فروخت کیے جائیں اور صرف چھوٹے جانور رہ جائیں۔

(۵) زکوٰۃ کے وجوب میں مویشیوں کے نر یا مادہ ہونے کا اعتبار نہیں، بلکہ مقررہ مقدار کے ہر قسم جانوروں پر ایک سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۶) ایسا جانور جو دو مختلف جنس کے جانوروں کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو، اس میں ماں کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر کوئی جانور ماں کے اعتبار سے وحشی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۱)

(۷) جن صورتوں میں شریعت نے مادہ کو بطور زکوٰۃ واجب کیا ہے تو ان صورتوں میں اسی سن و سال کا نر جانور دینا کافی نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ ایسے جانور کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کی قیمت کا نر جانور دیا جائے، البتہ گائے، بکری اور بھیڑ وغیرہ میں نر و مادہ دونوں برابر ہیں۔

(۸) زکوٰۃ میں دینے کے لیے جس جانور کا انتخاب کیا جائے، وہ اوصاف اور عمدگی کے اعتبار سے درمیانہ اور اوسط درجے کا ہو۔ (۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في صفة نصاب السائمة: ۴۳۶/۲-۴۳۸، الفتاوى الهندية، الباب الثاني في صدقة السوائم، الفصل الأول في المقدمة: ۱۷۶/۱

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في صفة الواجب في السوائم: ۴۴۲/۲

اونٹوں کا نصاب اور مقدار:

اونٹوں کی زکوٰۃ کا جدول حنفیہ کے ہاں درج ذیل ہے۔

تعداد	واجب شدہ مقدار
۱ تا ۴ اونٹ	کچھ بھی واجب نہیں۔
۵ تا ۹ اونٹ	ایک بکری واجب ہوگی۔
۱۰ تا ۱۴ اونٹ	دو بکریاں واجب ہوں گی۔
۱۵ تا ۱۹ اونٹ	۳ بکریاں واجب ہوں گی۔
۲۰ تا ۲۴ اونٹ	۴ بکریاں واجب ہوں گی۔
۲۵ تا ۳۵ اونٹ	ایک سالہ اونٹنی (بنتِ مخاض) واجب ہوگی۔
۳۶ تا ۴۵ اونٹ	دو سالہ اونٹنی (بنتِ لبون)
۴۶ تا ۶۰ اونٹ	تین سالہ اونٹنی (حقہ)
۶۱ تا ۷۵ اونٹ	ایک چار سالہ اونٹنی (جذعہ)
۷۶ تا ۹۰ اونٹ	۲، دو سالہ اونٹنیاں (۲ بنت لبون)
۹۱ تا ۱۲۰ اونٹ	۲، تین سالہ اونٹنیاں (۲ حقے)
۱۲۱ تا ۱۲۴ اونٹ	یہی اوپر والا، یعنی ۲ حقے
۱۲۵ تا ۱۲۹ اونٹ	۲ حقے اور ایک بکری
۱۳۰ تا ۱۳۴ اونٹ	۲ حقے اور ۲ بکریاں
۱۳۵ تا ۱۳۹ اونٹ	۲ حقے اور ۳ بکریاں
۱۴۰ تا ۱۴۴ اونٹ	۲ حقے اور ۴ بکریاں
۱۴۵ تا ۱۴۹ اونٹ	۲ حقے اور ایک بنت مخاض
۱۵۰ تا ۱۵۴ اونٹ	۳ حقے
۱۵۵ تا ۱۵۹ اونٹ	۳ حقے اور ایک بکری
۱۶۰ تا ۱۶۴ اونٹ	۳ حقے اور ۲ بکریاں

۱۶۵ تا ۱۶۹ اونٹ	۳ حقے اور ۳ بکریاں
۱۷۰ تا ۱۷۴ اونٹ	۳ حقے اور ۴ بکریاں
۱۷۵ تا ۱۸۵ اونٹ	۳ حقے اور ایک بنت مخاض
۱۸۶ تا ۱۹۵ اونٹ	۳ حقے اور ایک بنت لبون
۱۹۶ تا ۱۹۹ اونٹ	۴ حقے
۲۰۰ تا ۲۰۴ اونٹ	۴ حقے یا ۵ بنت لبون

اس کے بعد کا طریقہ بالکل وہی ہے جو ۱۵۰ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، تاہم یاد رہے کہ ہر ۵۰ کے بدلے ایک حقہ اور ہر ۴۰ کے بدلے ایک بنت لبون واجب ہوتی ہے۔(۱)

گائے، بیل اور بھینس وغیرہ کی زکوٰۃ:

گائے بھینس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ ان کا کم سے کم نصاب تیس (۳۰) مویشی ہیں۔ پھر ہر تیس مویشی پر ایک تبیع یا تبیعہ، یعنی وہ گائے یا بیل واجب ہوگا جو عمر کے دوسرے سال میں ہو اور ہر چالیس پر ایک مسنہ واجب ہوگی، یعنی وہ گائے یا بیل جو عمر کے تیسرے سال میں ہو۔

اکتالیس سے لے کر انسٹھ (۵۹) تک جمہور فقہا، صاحبین اور امام ابوحنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق ایک مسنہ کے علاوہ اور کچھ بھی واجب نہیں۔ علامہ کاسانیؒ نے اس قول کو اعدل الروایات کہا ہے۔ تفصیلی جدول کچھ یوں ہے۔

تعداد	واجب شدہ مقدار
۱ تا ۲۹	کچھ بھی واجب نہیں۔
۳۰ تا ۳۹	تبیع یا تبیعہ یعنی دوسرے سال میں داخل ہونے والی گائے یا بھینس
۴۰ تا ۵۹	مفتیٰ بہ قول کے مطابق صرف ایک مسنہ واجب ہے۔
۶۰ تا ۶۹	۲ تبیعہ واجب ہیں۔
۷۰ تا ۷۹	ایک تبیعہ اور ایک مسنہ واجب ہیں۔

اس سے آگے تیس اور چالیس کی یہی ترتیب چلے گی۔

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الثاني، الفصل الثاني في زكوة الإبل: ۱/ ۱۷۷، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في صفة الواجب في مال التجارة: ۲/ ۴۲۸- ۴۳۰-(۲) الفتاوى الهندية، الفصل الثالث في زكوة البقر: ۱/ ۱۷۷، ۱۷۸، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في نصاب البقر: ۲/ ۴۳۱، ۴۳۲

بکریوں میں زکوٰۃ:

بکریوں میں زکوٰۃ کی تفصیل خود رسول اللہ ﷺ کے مختلف خطوط سے ثابت ہے۔ تفصیلی جدول درج ذیل ہے:

تعداد	واجب شدہ مقدار
۱ تا ۳۹	کچھ بھی واجب نہیں۔
۴۰ تا ۱۲۰	ایک بکری واجب ہے۔
۱۲۱ تا ۲۰۰	دو بکریاں واجب ہیں۔
۲۰۱ تا ۳۹۹	تین بکریاں واجب ہیں۔
۴۰۰ تا ۴۹۹	چار بکریاں واجب ہیں۔

اسی طرح ہر سو (۱۰۰) بکریوں کے بدلے ایک بکری کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یاد رہے کہ بھیڑ بکری وغیرہ کا حکم زکوٰۃ وغیرہ میں ایک ہے۔(۱)

گھوڑوں میں زکوٰۃ کا حکم:

جمہور فقہا کے ہاں اونٹوں، گائے بیل اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ بقیہ کسی بھی چیز میں زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے ان سب کے ہاں گھوڑوں میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں، چاہے وہ سائمہ ہوں یا غیر سائمہ۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں افزائش نسل کے لیے پالے گئے گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، تاہم حنفیہ کے ہاں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ یہی حکم سواری اور جہاد کے گھوڑوں کا بھی ہے۔

جو گھوڑے خالص تجارت کی نیت سے رکھے جائیں، ان میں زکوٰۃ کے وجوب پر تمام امت کا اجماع و اتفاق ہے، تاہم زکوٰۃ قیمت لگا کر دی جائے گی۔ گدھے، خچر، چیتے اور تربیت یافتہ کتے اگر تجارت کی نیت سے رکھے جائیں تو ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۲)

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الثاني في صدقة السوائم، الفصل الرابع في زكوة الغنم: ۱/۱۷۸، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في نصاب الغنم: ۲/۴۳۲، ۴۳۳

(۲) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الثاني في صدقة السوائم، الفصل الخامس في مالاتجب فيه الزكوة: ۱/۱۷۸، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في زكوة الخيل: ۲/۴۴۵-۴۴۷

زکوٰۃ میں نیت کی حیثیت:

دوسری عبادتوں کی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے بھی نیت کرنا ضروری ہے۔ حق داروں کو زکوٰۃ دیتے وقت بھی نیت کی جا سکتی ہے اور زکوٰۃ کا مال الگ کرتے وقت بھی، ان میں سے کسی ایک وقت نیت کر لینا کافی ہے۔

زکوٰۃ اگر کسی شخص کے حوالے کی جائے کہ وہ اسے فقرا میں تقسیم کر دے تو اصل مالک کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ تقسیم کرنے والے کے لیے نیت کرنا ضروری نہیں، چاہے تقسیم کرنے والا مسلمان ہو یا کوئی ذمی وغیرہ ہو۔

نیت سے مراد دل میں یہ ارادہ کرنا ہے کہ میرے مال میں جو حصہ زکوٰۃ واجب ہے، میں اس کو ادا کر رہا ہوں۔ زبان سے نیت کرنا یا فقیر کو دیتے وقت زکوٰۃ کی وضاحت ضروری نہیں۔ اگر کسی شخص نے وکیل کو پیسے دیتے وقت یہ کہا کہ یہ میری طرف سے کسی کو بطور ہبہ، صدقہ یا قرض دے دو، پھر وکیل کو بتائے بغیر اس نے زکوٰۃ کی نیت کر لی اور ابھی تک وکیل نے یہ مال کسی کو نہیں دیا ہو تو زکوٰۃ کی نیت درست ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی نیت تو زکوٰۃ کی ہو، لیکن وہ کسی مستحق کو دیتے وقت ہبہ یا قرض وغیرہ کے الفاظ استعمال کرے، تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اس لیے کہ آخذ، یعنی لینے والے کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ کا مال ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں یہ بھی لکھا ہے کہ: فقیر کو دیتے وقت اگر کوئی بھی نیت نہ ہو، لیکن دینے کے بعد زکوٰۃ کی نیت کر لی تو ایسی صورت میں اگر وہی مال ابھی تک فقیر کے پاس موجود ہو تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

حنفیہ کے ہاں اگر کوئی شخص پورا مال یا اس کا کچھ حصہ صدقہ کر دے تو اتنے حصے کی زکوٰۃ اس سے معاف ہو جائے گی، اگرچہ اس نے زکوٰۃ کی نیت نہ کی ہو۔(۱)

زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی:

حنفیہ کے ہاں اگر کوئی شخص مالکِ نصاب ہو تو اس کے لیے ایک سال یا اس سے زیادہ کی پیشگی زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ابھی ایک ہی نصاب کا مالک ہو، لیکن وہ کئی نصابوں کی زکوٰۃ اس توقع پر ادا کرے کہ شاید آئندہ اس کا مالک ہو جائے مثلاً ساڑھے سات تولہ تو اس کے پاس موجود ہو، لیکن وہ زکوٰۃ مثلاً بیس تولہ کی دے دے تو ایسا کرنا درست ہے۔ آئندہ اگر وہ واقعی اتنی مقدار سونے کا مالک ہو گیا تو اب اس سے زائد مقدار کی زکوٰۃ

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الاول: ۱/ ۱۷۰، ۱۷۱، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في شرائط الركن: ۲/ ۴۵۸ـ ۴۶۰، الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الزكوة: ۳/ ۱۸۷ـ ۱۸۹، مراقي الفلاح مع الطحطاوي، كتاب الزكوة، ص: ۵۸۸، ۵۸۹

ادا نہیں کرنی ہوگی، تاہم زکوٰۃ کی قبل از وقت ادائیگی سے متعلق تین شرطیں ضروری ہیں۔

(۱) جس نصاب کی ادائیگی پیشگی کی گئی ہے، اس پر سال پورا ہو۔

(۲) اختتامِ سال پر یہ نصاب مکمل رہے۔

(۳) سال کے درمیان کبھی اس کو نوبت نہ آئے کہ نصاب بالکل ہی ختم ہو جائے۔

ان میں سے کوئی بھی شرط نہ پائی جائے تو قبل از وقت ادا کردہ زکوٰۃ صدقہ نافلہ بن جاتی ہے۔ قبل از وقت ادائیگی میں سال دو سال کی کوئی قید نہیں، دس بیس سال کی بھی ادا کردے تو کوئی حرج نہیں۔ (۱)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں شک:

حنفیہ کے ہاں اگر کسی شخص کو یہ شک ہو جائے کہ اس نے زکوٰۃ ادا کردی ہے یا نہیں؟ تو ایسے شخص پر دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ (۲)

زکوٰۃ میں اصل شے کی جگہ قیمت کی ادائیگی:

حنفیہ کے ہاں صدقاتِ واجبہ کی تمام صورتوں اور قسموں (صدقۃ الفطر، عشر، نذر اور کفارات) میں اصل شے کی جگہ قیمت کی ادائیگی کافی ہے۔ چونکہ زکوٰۃ کا مقصد فقرا کی ضروریات کی تکمیل ہے اور یہ بمقابلہ اصل مالِ زکوٰۃ کے قیمت کے ذریعے زیادہ صحیح طور پر اور آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے، اس لیے قیمت کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی ایک منصفانہ حکم ہے۔ اس کے علاوہ قیمت کی ادائیگی میں زکوٰۃ دہندہ کے لیے بھی آسانی اور مختلف اخراجات اور نقل و حمل سے خلاصی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ (۳)

اگر قیمت کے علاوہ کسی اور جنس سے زکوٰۃ ادا کرنی ہو (مثلاً گندم کی جگہ چاول) تو اصل واجب شدہ جنس کی

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها......: ۱/۱۷۶، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في حولان الحول وفصل في بيان شرائط الجواز: ۲/۴۸۶-۴۹۰، الفتاوی التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل السادس في تعجيل الزكوة: ۲/۱۹۱

(۲) الفتاوی الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى: ۱/۱۸۰

(۳) الفتاوی الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى: ۱/۱۸۱، الهداية مع فتح القدير، كتاب الزكوة، فصل وليس في الحملان والفصلان......: ۲/۱۴۴، ۱۴۵

قیمت لگا کر اس قیمت کے بقدر دوسرے جنس سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔(۱)

کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟

چوپایوں اور مویشیوں کی زکوٰۃ میں بالاتفاق زکوٰۃ ادا کرتے وقت قیمت کا اعتبار ہوگا، البتہ سونے چاندی اور مال تجارت میں امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک ادا کرتے وقت اور امام ابو حنیفہؒ کے ہاں "یوم الوجوب" یعنی جس دن زکوٰۃ واجب ہو جائے، اس دن کی قیمت معتبر ہوگی۔ سامان زکوٰۃ کی قیمت اور نرخ کا اعتبار اس جگہ کے اعتبار سے ہوگا، جہاں خود سامان موجود ہو۔ جہاں مالک موجود ہو، اس جگہ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔(۲)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں تملیک کی ضرورت:

فقہائے کرام کے ہاں فقراء و مساکین پر زکوٰۃ کی جو رقم خرچ کی جائے، ان میں تملیک، یعنی مالک بنانا ضروری ہے۔ ایسی تمام صورتیں جن میں مالک بنانے کی کیفیت نہ ہو یا جس مصرف میں رقم خرچ کی جارہی ہو، اس میں مالک بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ چنانچہ مسجد اور پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی مرمت، نہر و آب رسانی کے نظم اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں بھی زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی۔

زکوٰۃ کی رقم سے غلہ خرید کر فقراء کے حوالہ کر دیا جائے یا کھانا بنا کر ان کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو یہ بھی کافی ہے، لیکن اگر جمع کر کے ان کو کھانا کھلا دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لیے کہ فقہی اعتبار سے یہ اباحت ہے، نہ کہ تملیک، اور زکوٰۃ ادا ہونے کے لیے تملیک ضروری ہے۔(۳)

کسی فقیر کا قرض معاف کرنے سے قرض کی ادائیگی کا حکم:

چونکہ زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے، اس لیے حنفیہ کے ہاں اگر کوئی شخص واجب شدہ زکوٰۃ کے بدلے زکوٰۃ کی نیت سے اپنے مدیون کا قرض معاف کرا دے یعنی اس کو قرض سے بری کر دے تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، بلکہ اس

---

(۱) الفتاوی الهندية ،الباب الثالث في زكوٰة الذهب......،الفصل الثاني في العروض ،قبيل مسائل شتى:۱/ ۱۸۰

(۲) الفتاوی الهندية ،الباب الثالث في زكوٰة الذهب والفضة والعروض،الفصل الثاني في العروض:۱/ ۱۸۰،الدر المختار مع ردالمحتار، كتاب الزكوة،باب زكوٰة الغنم:۳/ ۲۱۰،۲۱۱

(۳) بدائع الصنائع، كتاب الزكوة،فصل في ركن الزكوة:۲/ ۴۵۶،۴۵۷،الهداية مع فتح القدير، كتاب الزكوة،باب من يجوز دفع الصدقه إليه ومن لايجوز:۲/ ۲۰۷،۲۰۸

کا طریقہ یہ ہے کہ مدیون اور مقروض کو بلا کر اس کو زکوٰۃ کا مال دے دے اور پھر اپنے قرض کے بدلے اس سے واپس لے لے۔ مدارس کے طلبہ کے ساتھ بھی تملیک کا مذکورہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔(۱)

چند متفرق احکام:

(۱) حنفیہ کے ہاں ٹیکس کو زکوٰۃ میں شمار کرنا درست نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص حکومت یا کسی اور ادارے کو مختلف مدات میں ٹیکس ادا کرے تو اس کے لیے ٹیکس کے علاوہ زکوٰۃ کی واجب شدہ مقدار بھی ادا کرنی ہوگی، کیوں کہ اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔(۲)

(۲) صدقاتِ واجبہ میں ادائیگی کے وقت لوگوں کو فرض کی ادائیگی پر برانگیختہ کرنے اور ان کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دینے کے واسطے اعلان واظہار بہتر ہے، جبکہ نفلی صدقات میں اخفا اور پوشیدگی زیادہ بہتر ہے۔(۳)

جن چیزوں سے زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے:

حنفیہ کے ہاں درج ذیل صورتوں میں زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے۔

(۱) اگر کسی شخص کا مال اس کی تعدی اور قصد وارادے کے بغیر ہلاک ہوجائے تو اس پر واجب شدہ زکوٰۃ بھی ساقط ہوجاتی ہے، اگرچہ ادائیگی پر قدرت یا بیت المال کے محصل کی طلبی کے باوجود زکوٰۃ ادا نہ کی ہو، تاہم اگر قصداً مال کو ضائع کردے تو اس پر ضائع کردہ مال کی زکوٰۃ واجب رہے گی۔(۴)

(۲) اگر کوئی شخص اپنا پورا مال صدقہ کردے تو پورے مال کی، اور نصاب کا کچھ حصہ صدقہ کردے تو اتنے حصے کی زکوٰۃ اس سے ساقط ہوجائے گی، اگرچہ اس نے زکوٰۃ کی نیت نہ کی ہو۔(۵)

---

(۱) مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الزكوة، ص:۵۸۹، ۵۹۰، فتاوى قاضي خان علىٰ هامش الهندية، كتاب الزكوة، فصل في هبة الدين من المديون بنية الزكوة:۱/۲۶۳، ۲۶۴

(۲) ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الزكوة، باب العاشر، مطلب ماوردفي ذم العشار:۳/۲۴۴

(۳) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول:۱/۱۷۱

(۴) الفتاوى الهندية، الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى:۱/۱۸۰، ۱۸۱، الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل الحادي عشر في الأسباب المسقطة للزكوة:۲/۲۲۱

(۵) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول:۱/۱۷۱

(۳) مقروض شخص کو قرض معاف کرنے سے اس قرض پر واجب شدہ زکوٰۃ کی مقدار استحساناً معاف ہوجاتی ہے، چاہے اس نے زکوٰۃ کی نیت کی ہو یا نہیں۔(۱)

(۴) حنفیہ کے ہاں زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد ادائیگی سے پہلے اگر کسی شخص کی وفات ہوجائے تو زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی، تاہم اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت کی ہو تو ورثہ پر ثلث مال میں سے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

(۵) اگر کوئی شخص مرتد ہوجائے تو ارتداد سے اس پر واجب شدہ زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے، کیوں کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور مرتد شخص عبادات کا مکلف نہیں۔(۲)

زکوٰۃ میں حیلہ کا حکم:

زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ کرنا امام محمدؒ کے ہاں بہر صورت مکروہ ہے، حنفیہ کے ہاں اسی قول پر فتویٰ ہے، البتہ ایک مرتبہ زکوٰۃ واجب ہوجائے تو اس کے بعد کسی بھی طریقے سے زکوٰۃ کو ساقط کرنا حرام اور ناجائز ہے جس پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔(۳)

حیلہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص صاحبِ نصاب بن جائے تو زکوٰۃ سے بچنے کے لیے وہ سال کے آخری حصہ میں وہ مال کسی کو ہبہ کردیتا ہے اور سال مکمل ہوجائے تو چند دن بعد اس سے اپنا وہ مال واپس لے لیتا ہے۔

❁❁❁❁❁

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول: ۱/۱۷۱، فتاویٰ قاضي خان علیٰ هامش الهندية، كتاب الزكوة، فصل في هبة الدين من المديون بنية الزكوة: ۱/۲۶۳، ۲۶۴

(۲) الفتاوی التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل الحادي عشر في الأسباب المسقطة للزكوة: ۲/۲۲۳، ۲۲۴، بدائع الصنائع، كتاب الزكوة، فصل في بيان مايسقط الزكوة بعد الوجوب: ۲/۴۹۱، ۴۹۲

(۳) الفتاوی التاتارخانية، كتاب الزكوة، الفصل الحادي عشر في الأسباب المسقطة للزكوة: ۲/۲۲۴، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، كتاب الزكوة، ص: ۵۹۱

فصل في شرائط الزكوة

(زکوٰۃ کی شرائط کا بیان)

گھریلو سامان پر زکوٰۃ

سوال نمبر(249):

ایک شخص کی شادی ہونے والی ہے،اس کے باپ نے اس کے لیے شادی کا سامان خریدا ہے جس کی قیمت نصاب کی مقدار سے زیادہ ہے۔کیا ایسے سامان پر زکوٰۃ واجب ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جو سامان گھریلو استعمال کے لیے خریدا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں،خواہ اس کی قیمت مقدارِ نصاب سے زائد ہو یا نہ ہو۔چونکہ شادی کا سامان وغیرہ گھر کی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا ہے،اس لیے مذکورہ سامان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وليس في دور السكنى، وثياب البدن، وأثاث المنازل، ودواب الركوب، وعبيد الخدمة، وسلاح الاستعمال زكوة.(۱)

ترجمہ:

اور رہائشی گھروں، بدن کے کپڑوں، گھر کے سامان (عام استعمال کی چیزوں) اور سواری کے جانوروں، خدمت والے غلاموں اور استعمال ہونے والے اسلحہ میں زکوٰۃ نہیں۔



(۱) الهداية، كتاب الزكوة:۱/۲۰۲

جی پی فنڈ کی زکوٰۃ

سوال نمبر(250):

ایک شخص سرکاری ملازم ہے، اس کا جی، پی، فنڈ سرکاری خزانہ میں پڑا ہے جو کہ ابھی تک اس کو نہیں ملا۔ جب یہ فنڈ اسے مل جائے تو اس پر زکوٰۃ علی الفور واجب ہوگی یا سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

''جی پی فنڈ'' ملازم کی ملکیت میں نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں اس کو مالکانہ تصرفات کا اختیار ہوتا ہے، اس لیے یہ ''دینِ ضعیف'' کے حکم میں ہو کر وصولی کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں۔ ہاں جب کسی شخص کی ملک میں رقم آجائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب رقم اپنی ملکیت میں آجائے تو فوری طور پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، بلکہ جب سال پورا گزر جائے تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والمرادبکونه حولیاأن یتم الحول علیه،وهوفي ملکه لقوله علیه السلام:لازکوة في مال حتی یحول علیه الحول. (۱)

ترجمہ: اور سال گزرنے سے مراد یہ ہے کہ نصاب ملک میں ہو اور اس پر پورا سال گزر جائے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: مال پر زکوٰۃ نہیں جب تک اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔



قیمتی پتھر کی زکوٰۃ

سوال نمبر(251):

ایک شخص نے انگوٹھی میں ایک قیمتی پتھر اپنے ساتھ رکھا ہے جس کی مروجہ قیمت زکوٰۃ کی مقدار نصاب سے کئی

(۱) البحرالرائق،کتاب الزکوة،تحت قوله:(وملك نصاب حولي):۲/۳۵٦

کمازیادہ ہے تو کیا سال گزرنے پر اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہی عبارات کے مطابق جواہرات اور قیمتی پتھروں میں زکوٰۃ واجب نہیں، اگر چہ ان کی قیمت مقدار نصاب سے زائد ہو، لیکن اگر جواہرات اور قیمتی پتھر تجارت کی غرض سے خریدے گیے ہوں اور ان کی قیمت مقدارِ نصاب تک پہنچی ہو تو سال گزرنے پر اس میں زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی، لہٰذا اگر مذکورہ قیمتی پتھر سامانِ تجارت میں سے نہ ہو تو اس میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(لازکوۃ في اللآلي والجواهر)وإن ساوت ألفااتفاقا(إلاأن تکون للتجارة)والأصل أن ماعدا الحجرين والسوائم إنمايزكي بنية التجارة. (۱)

ترجمہ: ہیروں اور موتیوں میں زکوٰۃ نہیں، اگر چہ یہ ہزار کے برابر ہوں، مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں اور اصل یہ ہے کہ دو پتھروں اور چرنے والے جانوروں کے علاوہ چیزوں کی زکوٰۃ اس وقت دی جائے گی، جب تجارت کی نیت سے ہوں۔

❁❁❁

گاڑی کی آمدنی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(252):

زید کی کچھ رقم ٹرک یا بس میں بند ہے۔ان گاڑیوں کی مزدوری اس کو ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زید گاڑیوں کا کاروبار بھی کرتا ہے، کچھ گاڑیاں خریدتا ہے اور فروخت کرتا ہے۔کیا آمدنی کی جو رقم ان گاڑیوں میں بند ہے، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو گاڑیاں محنت ومزدوری میں مصروف ہوں تو ان کی عین میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ ان کی سالانہ آمدنی اگر

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۳/۱۹٤

زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت موجود ہو تو دوسری آمدنی کے ساتھ اس کو ملا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔اور اس کے علاوہ اگر گاڑیوں کا کاروبار ہو، یعنی گاڑیوں کی تجارت ہو تو یہ گاڑیاں اموال تجارت میں شمار ہو کر ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وكذا الجواب في ابل المكارين وحمر المكارين.(۱)

ترجمہ:

اور ایسا ہی کرایہ پر دینے والوں کے اونٹ اور گدھوں کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں۔



آمدنی والی گاڑیوں کی زکوٰۃ

سوال نمبر(253):

ایک شخص نے کمائی کی غرض سے ایک بس خریدی جس کی قیمت زکوٰۃ کی مقدار کے نصاب سے کئی گنا زیادہ ہے اور اس سے روزانہ اس شخص کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔کیا بس کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے یا سال گزرنے پر آمدنی کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صنعت وحرفت کی ایسی مشینیں جن کے ذریعے محنت مزدوری کر کے آمدنی حاصل کی جاتی ہے، ان کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں، بلکہ ان مشینوں سے حاصل شدہ آمدنی پر حولان حول سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر گاڑی تجارت کی غرض سے نہیں خریدی ہو اور اس کے ذریعے محنت مزدوری کر کے آمدنی حاصل کی جائے تو گاڑی کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ آمدنی پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔

---

(۱)خلاصة الفتاوى، كتاب الزكوة، الفصل السابع في الكتب والعروض:۱/ ۲٤٠

والدّلیل علیٰ ذلک:

وأما آلات الصناع الذین یعملون بها،وظروف الأمتعة للتجارة ،لاتجب فیه الزکوة؛لأنها لیست بمعدة للتجارة.(۱)

ترجمہ:

صناعت کے آلات جن پر کاریگر کام کرتے ہیں اور بطورِ تجارت فائدہ اٹھانے والے برتنوں میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ وہ تجارت کے لیے تیار نہیں کیے گیے۔

❁❁❁

گھر بنانے کے لیے خریدی گئی زمین پر زکوٰۃ

سوال نمبر(254):

ایک شخص نے گھر کے لیے 10 مرلہ پلاٹ دو لاکھ میں خریدا۔تقریباً پانچ سال بعد اس کو سات لاکھ روپے پر فروخت کر کے دوسرا پلاٹ خرید کر تعمیر شروع کر دی تو اس طرح کے پلاٹ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کوئی زمین صرف مکان بنانے کی نیت سے خریدی جائے اور اس میں تجارت کی نیت نہ ہو تو ایسی زمین پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ زمین مکان کے لیے خرید کر نفع پر فروخت کی ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر مذکورہ رقم پر سال گزر جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ لازم ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولیس في دور السکنی،وثیاب البدن،وأثاث المنازل،ودواب الرکوب،وعبید الخدمة،وسلاح الاستعمال زکوة.(۲)

---

(۱)الکفایة في ذیل فتح القدیر،کتاب الزکوة،فصل في العروض:۱۷۰/۲

(۲)الهدایة،کتاب الزکوة:۲۰۲/۱

ترجمہ: اور رہائشی گھروں، بدن کے کپڑوں، گھر کے سامان (عام استعمال کی چیزوں) اور سواری کے جانوروں، خدمت والے غلاموں اور استعمال ہونے والے اسلحہ میں زکوٰۃ نہیں۔



نان ونفقہ کے لیے متعین رقم میں زکوٰۃ

سوال نمبر(255):

ایک بھائی تین بہنیں اپنی خالہ جان کے پاس رہتی ہیں۔ان کے والدین فوت ہوچکے ہیں اوران کے لیے اتنی رقم چھوڑی ہے جو مقدارِ نصاب تک پہنچتی ہے، جبکہ ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں، بلکہ اس مال سے گھریلو اخراجات پورے کرتے ہیں تو کیا اس مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر مذکورہ ورثا نابالغ ہوں تو پھران کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں،البتہ بالغ ورثا کی رقم اگر مقدارِ نصاب تک پہنچتی ہوتو اس میں سال گزرجانے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لہٰذا محررہ حالات کی روشنی میں سال کے دوران حوائجِ اصلیہ میں صرف ہونے والی رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں، جبکہ باقی رقم اگر مقدارِ نصاب تک پہنچتی ہوتو سال گزرنے پراس میں بالغ افراد کے حصے میں زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

إن الزكوة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء،أوللنفقة كذافي البدائع في بحث النماء التقديري ... قوله في السراج سواء أمسكه لتجارة،أوغيرها،وكذا قوله في التاتارخانية:نوى للتجارة أولا. (۱)

ترجمہ:

نقدی میں زکوٰۃ واجب ہے،خواہ یہ نقدی اس کے پاس بڑھوتری کے لیے ہو یا خرچ کرنے کے لیے،اسی طرح بدائع میں تقدیری بڑھوتری کی بحث میں ہے۔۔۔سراج میں مصنفؒ کا قول ہے کہ: برابر ہے اس نے تجارت کی نیت سے مال اپنے پاس رکھا ہو یا کسی اور نیت سے،اس طرح تاتارخانیہ میں ہے کہ: تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے۔

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة،مطلب في زكوة ثمن المبيع وفاء:۱۷۹/۳

ومنہا البلوغ عندنا، فلا تجب علی الصبي.(۱)

ترجمہ: اور احناف کے ہاں زکوۃ کے شرائط میں سے بالغ ہونا بھی شرط ہے، لہٰذا نابالغ پر زکوۃ لازم نہیں۔

❁❁❁

زکوۃ کی ادائیگی میں تملیک کی ضرورت

سوال نمبر(256):

آج سے چند مہینے پہلے چند افراد نے مل کر اللہ تعالی کی رضا کے لیے غریب مریضوں کے لیے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی، اس ادارے نے فی الحال ایک لیبارٹری قائم کی ہے، یہ لیبارٹری ٹیسٹوں میں مریضوں کو بازار کے مقابلے میں تقریباً پچھتر (۷۵%) فیصد رعایت مہیا کرتی ہے اور اس سہولت سے اب عام لوگ بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پچھلے چھ ماہ میں کل ۶۶۳۴۴۰ روپے کے ۷۵۰۰ ٹیسٹ کیے گئے، جن کی بازار میں قیمت ۲۹۲۰۱۹۰ روپے بنتی ہے، اس طرح مریضوں کو کل ۲۲۵۶۷۵۰ روپے کی رعایت مہیا کی گئی۔

ابتدائی مالی معاونت کے بعد اب الحمدللہ یہ ادارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور ٹیسٹوں کی قیمت اتنی رکھی گئی ہے کہ اس سے ادارے کے اخراجات پورے ہونے کے ساتھ تھوڑی بہت بچت بھی ہو جاتی ہے، جو ادارے کے لیے مزید آلات وغیرہ خریدنے کے لیے استعمال میں لائی جائے گی اور ممکن ہوا تو زمین خرید کر اس پر ادارے کے لیے اپنی عمارت بھی تعمیر کی جائے گی۔ ادارہ مندرجہ ذیل مدات میں اخراجات کرتا ہے:

......(۱) ملازمین کی تنخواہیں۔

......(۲) بلڈنگ (عمارت) کا کرایہ۔

......(۳) لیبارٹری کے لیے سامان کی خریداری۔

......(۴) مندرجہ بالا کام کرنے کے لیے گاڑی کا کرایہ وغیرہ۔

......(۵) انکم ٹیکس اور دوسرے حکومتی ٹیکس بھی منافع ہی سے ادا کیے جائیں گے۔

اس ادارے کی آمدن سے کسی شخص کو کوئی منافع نہیں دیا جاتا اور اسے صرف غریبوں کی امداد اور مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہی خرچ کیا جاتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ کیا اس سلسلے میں ہم زکوۃ کا پیسہ خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع علی من علیه: ۳۷۸/۲

الجواب وباللہ التوفیق:

حسبِ تحریر مذکورہ ادارے کے بنیادی اہداف غربا اور بے بس لوگوں کو مقررہ قیمت کی بہ نسبت 75% رعایت کی فراہمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رفاہی ادارے کے یہ اقدامات قابلِ تحسین ہیں اور انسانی معاشرہ کی ایک اہم ضرورت کا احساس ہے، اس جیسے کارِ خیر میں تعاون کرنا باعثِ سعادت مندی ہے، لیکن بایں ہمہ زکوٰۃ اور دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقم اس میں خرچ نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں بنیادی تصور تملیک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ﴾ (۱)

ترجمہ: زکوٰۃ مفلسوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

فقہائے کرام کا کہنا ہے:

ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة. (۲)

ترجمہ: یعنی غربا اور فقرا پر مال خرچ کرنا تملیک کے طور پر ہو، اباحت کے طور پر نہ ہو۔

جبکہ مذکورہ صورتوں میں تملیک کی بجائے اسقاط (discount) ہے، یعنی پچھتر فیصد قیمت کی ادائیگی غریب کو معاف کی جاتی ہے، اس لیے تملیک کے فقدان کی وجہ سے اس صورت میں یہ ادارہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں۔

اگر ایسی صورت بنائی جائے کہ جس میں غریب کے ہاتھ رقم پہنچے، پھر ادارہ اس کی وصولی کا اہتمام کرے تو شاید جواز کی کوئی صورت نکل آئے، تاہم اس میں یہ ضروری ہے کہ غریب واقعی ایسا شخص ہو، جو ضرورت سے زائد ساڑھے باون تولہ چاندی کی مروجہ قیمت کا مالک نہ ہو، ورنہ معاشرہ میں بسا اوقات ایسے لوگ بھی غربا کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں جو شریعت کی نظر میں اغنیا شمار ہوتے ہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

مصرف الزکوۃ والعشر............(هو فقیر، وهو من له أدنیٰ شيء) أي دون نصاب، أو قدر نصاب غیر نام مستغرق في الحاجة. (ومسکین من لا شيء له) علی المذهب......ویشترط أن یکون الصرف (تملیکا) لا إباحة. (۳)

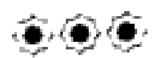
(۱) التوبة/ ۶۰

(۲) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الزکوة، باب المصرف: ۲۹۱/۳

(۳) الدر المختار علی صدر رد المحتار، کتاب الزکوة، باب المصرف: ۲۹۱،۲۸۴،۲۸۳/۳

ترجمہ:

زکوۃ اور عشر کا مصرف فقیر ہے، جس کے پاس نصاب سے کم کوئی چیز ہو یا نصاب کے برابر ایسا مال ہو، جس میں نمو نہیں آتا ہو، جو کہ ضرورت میں لگا ہوا ہو اور مسکین وہ ہے، جس کے پاس کوئی چیز بھی نہ ہو اور زکوۃ کے مال کی صحت کے لیے یہ شرط ہے کہ اسے تملیکاً دیا جائے، اباحۃ نہیں۔



گھڑی میں لگے ہوئے سونے کی زکوٰۃ

سوال نمبر (257):

بعض قیمتی گھڑیاں لوگ استعمال کرتے ہیں، کبھی ضرورت کی بجائے معاشرہ میں صرف رُعب جمانے کے لیے خریدی جاتی ہیں جس میں سونے کی زنجیریں ہوتی ہیں، بلکہ بعض پرزے سونے کے بنا کر لگائے جاتے ہیں۔ کیا ایسی گھڑی پاس رکھنے کی وجہ سے زکوۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سونا اور چاندی جس شکل میں بھی ہو، نصاب تک پہنچنے کی صورت میں زکوۃ واجب ہوگی، لہٰذا گھڑی میں استعمال شدہ سونے پر بھی زکوۃ لازم ہوگی، بشرطیکہ اس کا مالک پہلے سے صاحبِ نصاب ہو یا دیگر اموال کے ساتھ اِس سونے کو ملانے سے صاحبِ نصاب بنتا ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فتجب الزكوة فيها سواء كانت دراهم مضروبة،أو نقرة أو تبرا،أو حليا مصوغاً أو حلية سيف أو منطقة،أو لجام،أو سرج،أو الكواكب في المصاحف،والأواني ،وغيرها إذا كانت تخلص عند الإذابة إذا بلغت مائتي درهم، وسواء كان يمسكها للتجارة،أو للنفقة،أو للتجمل،أو لم ينو شيئا.(۱)

---

(۱) بدائع الصنائع،كتاب الزكوة،فصل في بيان صفة النصاب:۲/۴۰۶

ترجمہ:

پس اس (سونا چاندی) میں زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ چاندی کے ڈھلے ہوئے سکے (دراہم) ہوں یا چاندی کے ٹکڑے اور ڈلیاں ہوں یا اس کے بنے ہوئے زیور ہو یا تلوار، کمر بند، لگام یا زین میں زینت کے لیے لگائے گئے ہوں یا قرآن اور برتن میں اس کے ستارے ہوں، جن کو پگھلانے کے بعد الگ کیا جا سکتا ہو، بشرط یہ کہ نصاب کو پہنچے، چاہے تجارت کے لیے ہو یا خرچ کے لیے اور زینت کے لیے یا کچھ بھی نیت ہو۔



زکوٰۃ میں نیت کا اعتبار

سوال نمبر (258):

ایک شخص ہر سال زکوٰۃ ادا کرتا ہے، لیکن زکوٰۃ ادا کرتے وقت یہ اظہار نہیں کرتا کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ کیا زکوٰۃ کے اظہار کے بغیر زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ کی شرائط میں اہم شرط نیت ہے۔ زکوٰۃ کی رقم دیتے وقت یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اس کا اظہار کیا جائے، بلکہ صرف نیت سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ دیتے وقت یہ کہے کہ یہ رقم قرض کے طور پر دیتا ہوں یا یہ رقم عطیہ ہے اور دل میں زکوٰۃ کی نیت ہو، تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لأن المعتبر نية الدافع، ولذا جازت، وإن سماها قرضا،أو هبة في الأصح.(۱)

ترجمہ:

اس لیے کہ دینے والے کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحیح قول کے مطابق اگر وہ قرض یا ہبہ کہہ کر دے دے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، باب المصرف: ۲۹۳/۳

دورانِ سال نصاب کا گھٹنا

سوال نمبر(259):

ایک شخص سال کی ابتدا میں صاحبِ نصاب تھا،لیکن درمیانِ سال میں کسی حادثہ کی وجہ سے غریب ہوگیا،دو تین مہینے حالتِ غربت میں گزر گئے۔سال کے آخری مہینوں میں پھر مالدار ہوکر صاحبِ نصاب بن گیا۔کیا درمیانِ سال میں غریب ہونے سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کسی صاحبِ نصاب شخص کی مملوکہ رقم دورانِ سال بڑھتی اور گھٹتی رہے،جس کی وجہ سے وہ کبھی غریب،کبھی صاحبِ نصاب بنتا جائے تو ایسی صورت میں سال کی ابتدا اور انتہا کو اعتبار دیا جائے گا۔

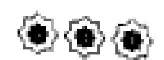
صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص سال کے شروع اور آخر میں صاحبِ نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اگرچہ درمیانِ سال میں غریب ہو چکا ہو،اس غربت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں،بشرطیکہ کمی کے دوران یہ رقم بالکل ختم نہ ہو جائے،لہٰذا ایسے شخص پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لكن هذا الشرط يعتبر في أول الحول، وفي آخره لافي خلاله حتى لوانتقص النصاب في أثناء الحول، ثم كمل في آخره تجب الزكوة.(۱)

ترجمہ:

لیکن یہ شرط سال کے ابتدا یا آخر میں معتبر ہوگی،درمیان میں معتبر نہیں،چنانچہ اگر نصاب سال کے دوران کم ہوجائے،پھر سال کے آخر میں مکمل ہو تو زکوٰۃ واجب رہے گی۔



(۱) بدائع الصنائع،کتاب الزکوۃ،فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال:۲/۴۰۴

مال پر حولانِ حول کے بعد وجوبِ زکوٰۃ

سوال نمبر(260):

ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپے ہوں اور اس پر ایک سال گزر جائے، لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے اس رقم سے فیکٹری کے لیے کوئی مشین خرید لے۔ تو کیا اب اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا مشین خریدنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کسی کے پاس بقدرِ نصاب نقد رقم ہو اور اس پر حولانِ حول، یعنی سال بھی گزر جائے۔ تو اس پر وجوبِ زکوٰۃ کے سبب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لہٰذا صورتِ مذکورہ کے مطابق اگر کسی کے پاس ایک لاکھ روپے (جو بقدرِ نصاب ہے) ہوں اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اگرچہ سال گزرنے کے بعد مالک اس رقم سے اس وقت کوئی چیز خرید لے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ما قال في تنوير الأبصار: (و سببه)أي سبب إفتراضها(ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه.(١)

ترجمہ:

تنویر الابصار میں ذکر کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ واجب ہونے کا سبب ایسے نصاب کا مالک ہونا ہے جس پر سال بھر گزر چکا ہو۔ (حولی) میں نصاب کی نسبت حول کی طرف ہے، کیونکہ اس پر سال گزرتا ہے۔

❁❁❁

وجوبِ زکوٰۃ کے لیے سال کی شرط

سوال نمبر(261):

ایک شخص نقد رقم کا مالک ہے جو کہ بقدرِ نصاب ہے، جس سے اس نے ہوٹل خریدا اور سال پورا ہونے سے

(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ، ۱۷۵،۱۷٤/۳

پہلے اسے فروخت کرتے ہوئے اس کی آمدنی بھی خرچ کردی۔ آیا اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ ہر اس شخص پر واجب ہوا کرتی ہے جو بقدرِ نصاب مال کا مالک ہو اور اس نصاب پر سال بھی گزر جائے۔ اگر مذکورہ شخص نے ہوٹل خریدا ہوا اور اس وقت بقدر نصاب مال کا مالک تھا، لیکن سال پورا ہونے سے قبل اس کو فروخت کرکے اس کی آمدنی بھی خرچ کردی۔ تو اس صورت میں سال پورا ہونے پر دیکھا جائے گا کہ اگر اب مذکورہ شخص صاحبِ نصاب نہیں تو اس پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں۔ اگر اس کے پاس نصاب پورا ہو تو اس موجودہ مال کے بقدر اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وسببه)سبب افتراضها(ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام) .وقال ابن عابدين قوله: (لحولانه عليه) أي لأن حولان الحول على النصاب شرط.(۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ کے فرض ہونے کا سبب ایک سالہ نصاب کا مالک (ملک تام) ہونا ہے۔ نصاب کی نسبت سال کی طرف اس وجہ سے کی ہے، تاکہ اس پر پورا سال گزر جائے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: ان کا یہ قول کہ لحولانہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ نصاب کے لیے پورے سال کا گزرنا شرط ہے۔

❀❀❀

زکوٰۃ کی ادائیگی میں قمری یا شمسی سال کا اعتبار

سوال نمبر(262):

علمائے کرام سے سنتے آرہے ہیں کہ زکوٰۃ کی وجوبِ ادائیگی کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ حولانِ حول بھی ہے، یعنی سال کا گزر جانا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ حولانِ حول میں قمری (اسلامی) سال کا اعتبار ہوگا یا شمسی سال کا؟ وضاحت فرمائیں۔

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ:۳/۱۷۴،۱۷۵

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

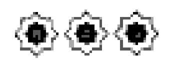
زکوٰۃ کی ادائیگی میں قمری نظام الاوقات کا اعتبار ہے۔ قمری اور شمسی کلینڈر میں سالانہ تقریباً دس دن کا فرق ہوتا ہے، یعنی قمری سال کی مدت 354 دن آٹھ گھنٹے، جبکہ شمسی (انگریزی) سال کی مدت 365 دن چھ گھنٹے ہوتی ہے۔ یوں آپ اگر شمسی کلینڈر پر چلتے رہیں تو 35 سال میں ایک سال کے فرق کی وجہ سے آپ کی ادائیگی ناقص رہے گی، اس لیے زکوٰۃ کے وجوب میں فقہائے کرام نے قمری سال کا اعتبار کیا ہے کہ قمری سال جب پورا ہو تو اس کو حولانِ حول شمار کیا جائے گا، اگرچہ شمسی سال پورا نہ ہوا ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

العبرة في الزكوة للحول القمري.(١)

ترجمہ:

زکوٰۃ کے وجوب میں قمری سال کا اعتبار ہے۔



زکوٰۃ کی ادائیگی میں ملکِ تام کا اعتبار

سوال نمبر (263):

کاروباری معاملات میں حکومت یا بڑی کمپنیوں کے ذمہ بعض اوقات کسی شخص کے واجبات ہوتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی ہے، کبھی کبھار اس پر سال بھی گزر جاتا ہے۔ آیا اس مال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے باقاعدہ مالک ہونا ضروری ہے، یہ تب ہوگا جب مالکانہ تصرفات کی قدرت ہو۔

صورتِ مسئولہ میں محنت کی عوض یا کسی چیز کی قیمت جو دوسروں کے ذمہ واجب الادا ہو، خواہ کسی شخص کے ذمہ ہو یا سرکاری اور غیر سرکاری ادارہ کے ذمہ ہو، مالکانہ تصرفات کی قدرت اس وقت حاصل ہوگی، جب اس مال پر قبضہ ہو۔ اس سے قبل مالک اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے سے قاصر رہتا ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب

(١) الفتاویٰ الهندية، كتاب الزكوٰة: ١٧٥/١

یہ واجبات وصول ہو جائیں۔

والدلیل علیٰ ذلک:

وأطلق الملك فانصرف إلى الكامل، وهو المملوك رقبة ويداً، فلايجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض.(۱)

ترجمہ:

ملکیتِ مطلق ذکر کر کے اس سے مراد کامل ملکیت ہے۔جس پر مکمل قدرت حاصل ہو۔پس مشتری نے تجارت کے لیے جو سامان خریدا ہے، قبضہ سے پہلے مشتری پر اس کی زکوۃ واجب نہیں۔

❁❁❁

ادائے زکوۃ کے لیے تملیک اور اس میں شرط لگانا

سوال نمبر(264):

اگر طالبِ علم سے زکوۃ کی تملیک اس شرط پر کرائی جائے کہ اس تملیک (دی گئی رقم) کو مدرسہ کے لیے واپس کرنا ہوگا اور یہ شرط بھی ہو کہ اگر اس رقم کو واپس نہ کیا تو مدرسہ کی طرف سے کھانا بند ہوگا تو کیا تملیک میں شرائط لگانا جائز ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ ادائے زکوۃ کی صحت کے لیے تملیک ایک ضروری امر ہے۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کسی مدرسے کی طرف سے طلبا کو باقاعدہ کچھ رقم کا مالک بنایا جاتا ہو اور خاطر خواہ تصرف کا استحقاق دیا جاتا ہو، جیسا کہ بعض مدارس میں متعارف ہے تو اس صورت میں ثبوتِ تملیک اور ادائے زکوۃ درست ہے، تاہم طلبہ کے اخراجات اور کھانے پینے وغیرہ کے حوائج کو مدِنظر رکھ کر مدرسے کی طرف سے یہ حکم کہ مملوکہ رقم دوبارہ مدرسے میں جمع کرائیں، تملیک کے منافی نہیں۔ بلکہ یہ تملیک سے زائد امر ہے جو حسن انتظام اور کفالت کی ایک صورت ہے۔

---

(۱) البحرالرائق، کتاب الزکوۃ:۲/۳۵۵

والدلیل علیٰ ذلک:

ما قال ابن الهمام: قوله (لانعدام التمليك، وهو الركن)فإن الله تعالىٰ سماهاصدقة،و حقيقة الصدقة تمليك المال من الفقير.(۱)

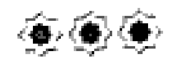
ترجمہ:

جیسا کہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ:تملیک جو کہ رکن ہے،معدوم ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کوصدقہ کے نام سے موسوم فرمایاہےاور صدقہ کی حقیقت مال کی تملیک فقیر سے کرانا ہے۔

وقال ابن نجيمؒ :والحيلة .....أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه ،فيكون لصاحب المال ثواب الزكوة ،وللفقير ثواب هذه القرب.(۲)

ترجمہ:

اورابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ:زکوٰۃ کا حیلہ یہ کہ پہلے کسی فقیر کوبطورِصدقہ بقدرِمقدارزکوٰۃ دیں،پھران مذکورہ امور پرخرچ کرنے کا حکم کیاجائے۔پس صاحبِ مال کوزکوٰۃ کا ثواب ہوگااورفقیرکواس نیک عمل کا ثواب۔



تملیکِ زکوٰۃ میں عقل اور بلوغ کی شرط

سوال نمبر(265):

اگرکوئی صاحبِ مال اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے چھوٹے اور یتیم بچوں میں تقسیم کرے تو کیااس طریقہ سےاس کی زکوٰۃ اداہوجائے گی؟ کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ کی تملیک کے لیے عقل اور بلوغ شرط نہیں،لہٰذازکوٰۃ جس طرح عاقل بالغ کودی جاسکتی ہے،اس طرح یتیم بچے کوبھی دی جاسکتی ہے۔

(۱) فتح القدیر، کتاب الزکوٰۃ،باب من یجوزدفع الصدقة إليه ومن لايجوز:۲۰۸/۲

(۲)البحرالرائق، کتاب الزکوٰۃ،باب المصرف:۴۲۴/۲

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کوئی صاحبِ مال چھوٹے اور یتیم بچوں کو زکوٰۃ کی رقم دے دے تو چونکہ یہ زکوٰۃ کی تملیک کر سکتے ہیں، اس لیے مزکی کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے۔ تاہم اگر بچہ بالکل ناسمجھ ہو تو ولی اس کی طرف سے قبضہ کرسکتا ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولم يشترط البلوغ والعقل؛ لأنهما ليس بشرط؛ لأن تمليك الصبي صحيح ،لكن إن لم يكن عاقلاً، فإنه يقبض عنه وصيه أو أبوه أو من يعوله قريباً أو أجنبياً.(۱)

ترجمہ: تملیک میں بلوغ اور عقل شرط نہیں، کیونکہ بچے کی تملیک درست ہوتی ہے، لیکن اگر کہیں عقل مند نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا موصی یا اس کا والد یا وہ شخص جو اس کی نگہداشت کرتا ہو رشتہ دار ہو یا اجنبی قبضہ کرلیں۔

❁❁❁

ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک کا اعتبار

سوال نمبر(266):

دو دوست کہیں سفر پر جا رہے ہوں۔ ایک ان میں سے صاحبِ نصاب ہو۔ کرایہ ادا کرتے وقت صاحبِ نصاب شخص زکوٰۃ کی رقم سے اپنے دوست کا کرایہ ادا کردے یا اگر کہیں دوسرا دوست اس سے کہہ دے کہ آپ میرا کرایہ اپنی زکوٰۃ کی رقم سے ادا کردیں تو کیا اس طریقے سے ادائیگی زکوٰۃ ہوجائے گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک ضروری ہے۔ کسی مستحق زکوٰۃ کو تملیک کرائے بغیر زکوٰۃ کی ادائیگی سے ذمہ فارغ نہیں ہوگا۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق ایک دوست کا اپنے دوسرے دوست کی جانب سے کرایہ ادا کرنے میں تملیک نہیں پائی جاتی، لہٰذا یوں کرایہ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، چاہے مستحق زکوٰۃ کی اجازت سے ادا کریں یا بغیر اجازت کے ادا کرے۔

---

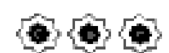
(۱) البحرالرائق، کتاب الزکوٰۃ: ۲/۳۵۳

والدّلیل علیٰ ذلک:

إذادفع الزکوۃإلی الفقیرلایتم الدفع مالم یقبضها،أو یقبضهاللفقیر من له ولایة علیه، نحوالأب، والوصي ،یقبضان للصبي والمجنون.(۱)

ترجمہ:

جب زکوٰۃ کامال غریب کودے تواداکرنااس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ غریب یااس غریب کی طرف سے اس کاولی (سرپرست) قبضہ نہ کرے،مثلاً:لڑکے اور مجنون کے لیےلڑکے کاباپ اور مجنون کاذمہ دار شخص قبضہ کریں گے۔



نیت کے بغیر زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(267):

کسی نے اپنے باغ میں سے کچھ حصہ بطور ہبہ یاہدیہ مستحق زکوٰۃ کودے دیا،جبکہ نیت زکوٰۃ کی نہیں تھی تواس سے عشراداہوا؟یاعشرکی ادائیگی الگ سے کی جائے گی؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے عشروزکوٰۃ اداکرتے وقت یااس کے لیے مال علاحدہ کرتے وقت نیت کرناضروری ہے،لہٰذا اگرکوئی شخص زکوٰۃ یاعشرمیں سے کچھ رقم بطور ہبہ یاہدیہ دے دے تواس سے زکوٰۃ یاعشرادانہ ہوگا،جب تک کہ زکوٰۃ یاعشر کی نیت نہ کرے۔

ہاں اگرادائیگی عشر کے وقت کچھ بھی نیت نہ ہواور بعد میں زکوٰۃ یاعشرکی نیت کرلی،بشرطیکہ وہی مال فقیر یا مسکین کے قبضہ میں موجود ہو،یعنی فقیر نے ابھی تک اس مال کوخرچ نہ کیاہوتوایسی صورت میں زکوٰۃ وعشرکی ادائیگی کے بعد بھی عشروزکوٰۃ کی نیت کرنے سے ادائیگی درست رہے گی۔

(۱)الفتاوی الهندیة،کتاب الزکوۃ،باب في المصارف:۱/ ۱۹۰

والدلیل علیٰ ذلک:

(وشرط صحة أدائهانية مقارنة له)أي للأداء،ولو كانت المقارنة حكماً،كمالودفع بلانية،ثم نوى، و المال قائم في يد الفقير.(۱)

ترجمہ:

ادائیگی زکوٰۃ کی صحت کے لیے نیت کا ملانا ضروری ہے،اگرچہ نیت کا یہ ملانا حکماً ہو،جیسے کہ بغیر نیت کے زکوٰۃ دی،پھر بعد میں نیتِ زکوٰۃ کی کرلی اور حال یہ ہے کہ مال ابھی تک فقیر کے پاس موجود ہو۔

❁❁❁

کرایہ پر دیے گئے مکان پر زکوٰۃ

سوال نمبر(268):

اگر کوئی شخص مکان تیار کر کے کرایہ پر دے،جس کی آمدنی بوقتِ ضرورت گھریلو ضروریات میں خرچ ہوتی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وجوبِ زکوۃ کے لیے ضرورتِ اصلی کے علاوہ ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے بقدر مالیت کا مالک ہونا ضروری ہے۔بشرطیکہ سال بھی گزر جائے۔اگر کسی کے پاس زمین یا مکان وغیرہ ہو،جس سے تجارت کرنا مقصود نہ ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں کرایہ پر دیے گئے مکان پر زکوۃ واجب نہ ہوگی،البتہ اس سے حاصل شدہ آمدنی سے جو سرمایہ جمع ہو کر نصابِ زکوۃ کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولو اشترى الرجل دارا أو عبداللتجارة، ثم آجره يخرج من أن يكون للتجارة؛لأنه لما آجره فقد

---

(۱) الدرالمختار علی صدرردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۱۸۷/۳

قصد المنفعة،ولو اشترى قدوراً من صفر يمسكها، أو يؤاجرها لاتجب فيها الزكوة، كما لا تجب في بيوت الغلة. (١)

ترجمہ:

اگر کسی نے کوئی گھر یا غلام تجارت کے لیے خریدا، پھر اس کو اجرت پر دیا تو وہ (مال) تجارت سے نکل جائے گا کیوں کہ جب اس کو اجرت پر دیا تو اس نے منفعت کا قصد کیا۔ اگر کسی نے کانسی کی دیگچیاں خریدیں، جنہیں وہ پاس رکھتا ہے اور کرائے پر دیتا ہے تو ان میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، جیسا کہ کرائے پر دیے گئے مکانات میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی۔

❁❁❁

اسکول کے منافع میں زکوٰۃ

سوال نمبر (269):

زید نے بچوں کو پڑھانے کے لیے سکول کھول رکھا ہے اور اس میں بچوں پر فیس مقرر کی ہے۔ کیا ضروری اخراجات سے بچ جانے والی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے وجوبِ زکوٰۃ کے لیے سبب نصاب کا پورا ہونا ہے اور اس نصاب کا ضرورتِ اصلیہ سے زائد ہونا بھی ہے۔ اسی طرح نصاب پر ایک مکمل سال کا گزر جانا اور مال پر ملکِ تام ہونا بھی وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ہے۔

لہٰذا صورتِ مذکورہ میں سکول سے حاصل ہونے والا نفع اگر زید کی ذاتی ملکیت ہو اور نصاب کے برابر ہو اور اس پر اس کا قبضہ بھی ہو تو سال گزر جانے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب رہے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها الملك التام)وهو ما اجتمع فيه الملك واليد،وأما إذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكوة. (٢)

(١) الفتاوى الخانية على هامش الهندية،كتاب الزكوة،فصل في مال التجارة:١/٢٥١

(٢)الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،باب في تفسيرها وصفتها:١/١٧٢

ترجمہ: وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ ملکیت پوری ہو اور پوری ملک سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور قبضہ بھی ہو۔ اور اگر ملکیت ہو مگر قبضہ نہ ہو، مثلاً حق مہر کا مال، جو کہ قبضہ کے بغیر ہو یا قبضہ ہو مگر ملکیت نہ ہو، مثلاً: مکاتب غلام کے مال کی ملکیت اور مقروض آدمی کے مال کی ملکیت، تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

❁❁❁

بچے کے مال میں وجوبِ زکوٰۃ

سوال نمبر(270):

کوئی شخص اپنے کسی چھوٹے بیٹے کے لیے نصاب کے برابر سونا اس غرض سے خرید کر رکھ دے کہ بچے کی شادی کرتے وقت استعمال میں لایا جائے گا۔ جبکہ اب لڑکا سِن بلوغ کو پہنچ چکا ہو اور سونا اس کی ماں کے پاس بطورِ امانت موجود ہو تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سات، آٹھ سال سے پڑے ہوئے سونے میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس کے ذمے واجب ہوگی؟ اور کتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ زکوٰۃ ایک عبادتِ محضہ ہے اور نابالغ بچہ چونکہ احکامِ شرعیہ کا مکلف نہیں، اس لیے اس کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوا کرتی، البتہ اگر اس کا مال نصاب کو پہنچتا ہو تو بالغ ہو جانے کے بعد جب مالِ نصاب پر سال گزر جائے تو اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کسی نابالغ بچے کی ملک میں آٹھ سالوں سے نصاب کے برابر سونا ہو تو ان سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں، ہاں بعد البلوغ جب سال مکمل ہو تو اس لڑکے کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرط یہ کہ اس کو مالکانہ تصرف کا اختیار بھی دیا گیا ہو اگر مالکانہ تصرف کا اختیار نہ دیا ہو تو "ید" ثابت نہ ہونے سے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وشرط افتراضها: عقل، وبلوغ، وإسلام، وحرية) قال ابن عابدين: قوله: (عقل وبلوغ) فلاتجب على مجنون وصبي؛ لأنها عبادة محضة، وليسا مخاطبين بها.(۱)

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة: ۳/۱۷۳، ۱۷۴

ترجمہ:

عاقل ہونا، بالغ ہونا، مسلمان ہونا اور آزاد ہونا زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے شرط ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: عقل اور بلوغ شرط ہونے کی وجہ سے مجنون اور بچے پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ یہ عبادت محضہ ہے اور یہ دونوں احکامات کے مخاطب نہیں ہیں۔

❁❁❁

کمپیوٹر اور موبائل پر زکوٰۃ

سوال نمبر(271):

اس جدید دور میں گھر گھر کمپیوٹر پڑا ہوا ہے اور ہر دوسرا شخص موبائل فون کا استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے تو کیا نصابِ زکوٰۃ کا حساب کرتے ہوئے موبائل، کمپیوٹر وغیرہ اس میں شمار کیے جائیں گے یا پھر حوائجِ اصلیہ میں سے شمار ہو کر زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ حوائجِ اصلیہ ہر شخص کے اعتبار سے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کے لیے ایک چیز حاجتِ اصلیہ کی حقیقت رکھتی ہو، لیکن وہی چیز دوسرے شخص کے اعتبار سے فاضل شمار ہوتی ہو، تاہم فقہاے کرام نے سونے چاندی کے علاوہ ذاتی استعمال کی اشیا کو حوائجِ اصلیہ میں شمار کیا ہے، اس لیے نصاب کا حساب لگاتے ہوئے ان کو نصاب میں شامل نہیں کیا جائے گا، لہٰذا اگر موبائل فون اور کمپیوٹر کسی کی ذاتی استعمال میں ہوں اور بغرضِ تجارت ان کو خریدا نہیں گیا ہو تو یہ شاملِ نصاب نہ ہوں گے۔

تاہم اگر فارغ پڑے ہوں اور کسی کے استعمال میں نہ ہوں تو شاملِ نصاب ہو کر سببِ غنا تو ہیں، البتہ تجارت کی نیت نہ ہو تو سببِ وجوبِ زکوٰۃ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها فراغ المال) عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى، وثياب البدن، وأثاث المنازل ودواب الركوب، وعبيد الخدمة......ومايتجمل به من الأواني إذالم يكن من الذهب والفضة، وكذا

الجوهر، واللؤلؤ، والياقوت، والبلخش، والزمرد، ونحوها، إذالم يكن للتجارة.(١)

ترجمہ:

مال ضروریاتِ اصلیہ سے زائد ہو۔پس رہائشی گھر پر،بدن کے کپڑوں پر،گھر میں استعمال کے سازوسامان پر،سواری کے جانوروں پر،خدمت کے لیے غلاموں پر زکوٰۃ نہیں اور آرائش کے برتنوں پر زکوٰۃ نہیں۔،بشرط یہ کہ وہ سونے اور چاندی کے نہ ہوں۔اسی مذکورہ حکم کی طرح جواہرات،موتی،بلخش (بلور سے مشابہ چیز) زمرد اور اس قسم کی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں،بشرط یہ کہ وہ تجارت کے لیے نہ ہوں۔

❁❁❁

مال پر سال پورا ہونے سے پہلے حج کے لیے داخلہ کرنا

سوال نمبر(272):

ایک شخص نصاب کے بقدر مال کا مالک ہو،لیکن سال مکمل ہونے سے چند دن پہلے وہ مذکورہ رقم کو حج کے لیے داخلہ پر خرچ کردے تو کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ داخلہ حج منظور ہو یا نہ ہو،دونوں صورتوں میں وجوبِ زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ وجوبِ زکوٰۃ کے من جملہ شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ نصاب پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے،لیکن اگر کہیں مالِ نصاب سال گزرنے سے قبل ہی خرچ ہو جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔البتہ سال کے آخر تک ملکیت میں رہے تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر مالِ نصاب کو حج داخلہ کے لیے جمع کرایا گیا ہو اور سال مکمل ہونے تک داخلہ منظور نہ ہو تو پھر اس میں زکوٰۃ واجب رہے گی،کیوں کہ مال ابھی تک مالک کی ملکیت میں باقی ہے اور داخلہ منظور ہونے کی صورت میں مال اس کی ملکیت سے نکل گیا ہے،لہٰذا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

(١) الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،الباب الأول في تفسيرها وصفتها:١/١٧٢

والدّلیل علیٰ ذلك:

ویجوزتعجیل الزکوۃ بعدملك النصاب، ولایجوز قبله.(۱)

ترجمہ:

نصاب کا مالک ہو جانے کے بعد سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز ہے اور نصاب کا مالک ہونے سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

وإفراز المال المذکور لأجل الحج لایخرجه عن ملکه .(۲)

ترجمہ:

مذکورہ مال (جو نصاب کے برابر ہو) کا حج کے واسطے علاحدہ کرنے سے ملک سے خارج نہیں ہوتا۔



قرض پر دی ہوئی رقم میں زکوٰۃ

سوال نمبر(273):

کسی شخص کے پاس اگر آٹھ لاکھ روپے کی مالیت ہو، ان میں سے کچھ نقد اور کچھ سامانِ تجارت ہو۔ اور مذکورہ شخص رجب کے پہلے ہفتے میں سال پورا ہونے پر ادائیگی زکوٰۃ کرتا ہو۔ اگر کہیں وہ رجب سے پہلے ہی دو لاکھ کا سامان کسی پر فروخت کردے اور رقم رمضان میں ملنے کا معاہدہ ہو جائے تو کیا مذکورہ رقم کی زکوٰۃ اسی سال دینا ہوگی یا پھر اگلے سال میں شمار ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر کے مطابق اگر قرض کی وصولی یقینی ہو تو قرض دینے والے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اس کا ادا کرنا تب واجب ہوگا، جب قرض وصول ہو جائے۔ البتہ اگر قرض وصول کرنے سے پہلے زکوٰۃ دے دی گئی تو بھی ادائیگی جائز ہوگی۔

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوة، الباب الأول في تفسیرها وصفتها: ۱۷۶/۱

(۲) تنقیح الحامدیة، باب الزکوة والعشر: ۸/۱

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر سال مکمل ہونے سے پہلے کسی کے مال کا کچھ حصہ بطورِ قرض خرچ ہو جائے تو خرچ شدہ حصہ اسی سال کے نصاب میں شمار ہوگا، تاہم قرض وصول ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، ورنہ پھر قرض وصول کرنے کے بعد دینا لازمی ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وأما القوي: فهو الذي وجب بدلاً عن مال التجارة...... ولا خلاف في وجوب الزكوة فيه، إلا أنه لايخاطب بأداء شيء من زكوٰة مامضى مالم يقبض أربعين درهماً. (۱)

ترجمہ:

(قرض) قوی وہ ہے، جو مالِ تجارت سے بدل ہو کر واجب ہوا ہو اور اس میں زکوٰۃ کے وجوب میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ الا یہ کہ گذشتہ (مال) کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر اس کو مخاطب نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ چالیس دراہم قبضہ نہ کرلے۔

❁❁❁

نصاب سے کم سونے کے ساتھ نقد رقم پر زکوٰۃ

سوال نمبر (274):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کے پاس سات تولے سونا اور کچھ نقدی بھی ہو جو کہ نصف تولہ سونے کی قیمت کے برابر ہو، اس کے علاوہ دیگر اشیا اس کی ملک میں نہ ہوں تو کیا سال گزرنے پر اس خاتون پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کسی کے پاس سونا، چاندی، نقد رقم یا سامانِ تجارت ہو اور وہ بقدرِ نصاب بھی ہو تو سال گزرنے پر ان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اگر کہیں ان اشیا میں سے کوئی بھی چیز نصاب سے کم ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ نہ ہو، جس سے یہ بقدرِ نصاب ہو جاتی ہوں تو پھر اس میں زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، لیکن اگر کسی کے

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/ ۳۹۲

پاس سات تولے سونا اور کچھ نقد رقم ہو تو دونوں کو ملانے کی صورت میں اگر ساڑھے سات تولہ سونے کی نصاب کو پہنچتی ہو تو حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اس کے پاس سات تولے سونا اور آدھا سونے کی قیمت موجود ہے، لہٰذا اس عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو ضم أحد النصابين إلى الآخر حتى يؤدي كله من الذهب أو من الفضة لا بأس به لكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدراً ورواجاً وإلا فيؤدي من كل واحد ربع عشرة.(۱)

ترجمہ:

اگر سونے اور چاندی کے نصاب کو ایک دوسرے سے ملایا جائے، حتیٰ کہ کل زکوٰۃ سونے کی قیمت کے حساب سے یا چاندی کی قیمت کے حساب سے ادا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ قیمت اس طرح لگائی جائے، جس میں مقدار اور رواج کے لحاظ سے غریبوں کا فائدہ زیادہ ہو، ورنہ سونے اور چاندی ہر ایک میں سے چالیسواں حصہ ادا کرے۔



مشترک سونے پر وجوبِ زکوٰۃ

سوال نمبر(275):

ایک شخص کے چار بیٹے ہوں۔ اس شخص کے فوت ہو جانے کے بعد ہر بیٹا پندرہ پندرہ تولے سونا بصورت زیورات کا مالک ہو، جب کہ ان کا نہ کوئی کاروبار ہو اور نہ نقد رقم پاس ہو۔ تا حال میراث کی تقسیم بھی نہیں ہوئی تو کیا ان چاروں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہاء کرامؒ نے وجوبِ زکوٰۃ کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا ہے اس میں ایک شرط ملکِ تام کا موجود ہونا

(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، باب في زكوة الذهب والفضة والعروض: ۱/۱۷۹

ہے۔ملکِ تام کا مطلب یہ ہے کہ ملکیت کے ساتھ ساتھ قبضہ بھی ہو،جس مال میں یہ دونوں یا کوئی ایک وصف مفقود رہے گا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں میراث میں موجود سونا نہ تو تقسیم ہوا ہے اور نہ ہی ورثاء کی اپنے حصص پر ملکیت متحقق ہوئی ہے لہٰذا یہ مال مہمل شمار ہوگا اور وہ مال جس پر کسی کی ملکیت تام نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ،تاہم اگر وہ سونا انہی ورثاء میں سے کسی ایک کی تحویل میں ہو تو اس پر اپنے حصہ کی بقدر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

والدلیل علی ذلک:

ومنها الملك التام وهو ما احتمع فيه الملك واليد واما اذا وحد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض أووحد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تحب فيه الزكوة.(۱)

ترجمہ: وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط میں سے ایک شرط ملک تام ہونا ہے۔ملکِ تام وہ ہے جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں موجود ہوں،چنانچہ اگر ملکیت ہو لیکن قبضہ نہ ہو جیسے مہر جب قبض نہ کیا ہو،یا قبضہ ہو لیکن ملکیت نہ ہو جیسے مکاتب اور مدیون کی ملکیت تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

وأما الدين الضعيف:فهو الذى وحب له(لا) بدلاًعن شيء سواء وحب له بغير صنعه كالميراث أو بصنعه كالوصية.......ولا زكوة فيه ما لم يقبض كله ويحول عليه الحول بعد القبض.(۲)

ترجمہ: ہر چہ دینِ ضعیف ہے،تو یہ وہ ہے جو کسی چیز کے بدلے میں واجب نہ ہوئی ہو،خواہ اس کے کسی عمل کے بغیر واجب ہوئی ہو جیسے میراث یا اس کے عمل سے واجب ہوئی ہو جیسے وصیت....اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی جب تک پوری قبض نہ کی ہو اور قبضہ کے بعد اس پر سال نہ گزرا ہو۔

چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر سونے پر زکوٰۃ

سوال نمبر(276):

اگر کسی عورت کے پاس اتنی مقدار میں سونا ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی کے نصاب تک پہنچتی ہو اور ساتھ میں چند جوڑے ملبوسات بھی ہوں،جبکہ نقد رقم وغیرہ میں سے کچھ بھی نہ ہو۔تو کیا عورت صاحبِ نصاب شمار

(۱) الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة:۱/۱۷۲

(۲) بدائع الصنائع،كتاب الزكوة،فصل الشرائط التي ترجع إلى المال: ۲/۳۹۲

ہو کر اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ سونے اور چاندی میں ادائیگی زکوٰۃ کے وقت قیمت کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ نصاب کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔سونے کی نصاب ساڑھے سات تولہ ہے، اگر کہیں اس سے کم ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جب عورت کے پاس صرف سونا ہو اور وہ سونے کے نصاب ساڑھے سات تولے سے کم ہو تو یہ عورت صاحبِ نصاب شمار نہ ہوگی اور نہ اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال العلامة الحصكفي ؒ:(و سببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه.(١)

ترجمہ: علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کا سبب ایسے نصاب کا مالک ہونا ہے جس پر سال بھر گزر چکا ہو۔(حولی) میں نصاب کی نسبت حول کی طرف ہے، کیونکہ اس پر سال گزرتا ہے۔

❁❁❁

نصاب سے کم سونا پر وجوبِ زکوٰۃ

سوال نمبر(277):

ایک شخص کے پاس کوئی نقد رقم نہ ہو، بلکہ دن بھر مزدوری کر کے رقم کو اپنی ضروریات میں خرچ کرتا ہے۔مگر اس کی بیوی کے پاس پانچ تولے سونا ہے۔اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے زکوٰۃ اس شخص پر واجب ہوتی ہے، جس کے پاس نصاب کی بقدر مال ہو یا کوئی تجارتی سامان ہو، جس کی قیمت نصاب تک پہنچتی ہو۔

تاہم صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی مذکورہ خاتون کے پاس پانچ تولہ سونا ہو اور اس کے علاوہ کوئی نقد رقم نہ ہو

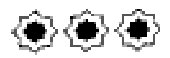
(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ:٣/١٧٤،١٧٥

تو ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومنها كون المال نصاباً فلا تجب في أقل منه.(١)

ترجمہ: زکوٰۃ کے واجب ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال بقدرِ نصاب ہو، اگر کہیں نصاب سے کم ہو تو اس پر واجب نہیں۔



گھر کی تعمیر کے لیے رکھے ہوئے مال پر زکوٰۃ

سوال نمبر(278):

۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پاکستان کے بعض علاقوں میں شدید زلزلہ آیا جس کی وجہ سے اُن علاقوں کے لوگوں کے گھر تباہ ہوگئے، بعد میں ملکی اور غیر ملکی امداد کی وجہ سے اُن لوگوں کی ملکیت میں اتنا مال آیا جو نصاب تک پہنچ سکتا تھا، لیکن اُن لوگوں نے گھر کی تعمیر اور دوسری اشیاو ضروریات پوری کرنے کے لیے وہ مال رکھا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اس پر سال گزر جائے تو اُن اموال پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

رقم کی ذات میں چونکہ قدرتی طور پر ثمنیت اور بڑھوتری کا تصور پایا جاتا ہے، چاہے جس نیت سے بھی رکھی گئی ہو، اس لیے شرعی نقطۂ نظر سے رقم جب نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں متاثرین کے پاس موجود رقم چاہے جس غرض سے بھی ہو اور زیرِ استعمال نہ ہو تو اگر وہ رقم نصاب تک پہنچتی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

إن الزكوة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء، أو للنفقة.(٢)

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة: ١٧٢/١

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة، مطلب: في زكوة ثمن المبيع وفاءً: ١٧٩/٣

ترجمہ:

بے شک زکوٰۃ نقد مال میں واجب ہوتی ہے، چاہے بڑھنے کے لیے روکا ہو یا خرچ کرنے کے لیے۔

چوزوں کے فارم میں زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال نمبر (279):

میں چوزوں کے فارم کا مالک ہوں جس میں تجارت کے لیے چوزے رکھے گئے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی کس نوعیت سے کی جائے گی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب کوئی شخص کوئی چیز تجارت کی غرض سے خریدے اور اس کی مالیت نصاب تک پہنچ کر اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں چونکہ فارم میں موجود چوزے خالص تجارت کے لیے رکھے گئے ہیں، اس لیے سال گزرنے کے بعد اس وقت موجود چوزوں کی قیمت اور حاصل شدہ آمدنی سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، یعنی سال گزرنے پر کل سرمایہ کا چالیسواں حصہ بطورِ زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الزكوة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق أو الذهب.(۱)

ترجمہ:

تجارت کے سامان میں زکوٰۃ واجب ہے، سامان کوئی بھی ہو، بشرطیکہ اس کی قیمت چاندی یا سونے کے نصاب کو پہنچ جائے۔



(۱) الهداية، كتاب الزكوة، فصل في العروض: ۱/ ۲۱۲

استعمال کی گاڑی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(280):

میں ایک سرکاری محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں، میری ملکیت میں ایک گاڑی ہے جس کی قیمت تقریباً ۴ لاکھ روپے ہے۔ یہ گاڑی میں دفتر آنے جانے کے لیے استعمال کرتا ہوں، اس کے علاوہ میری ملکیت میں ایک خالی مکان بھی ہے، نہ وہ تجارت کے لیے ہے اور نہ ہی اس کو کرایہ پر دیا گیا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ گاڑی اور مکان میں مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے اگر کسی شخص کی ملکیت میں نصاب کے بقدر مال موجود ہو تو ایسے شخص پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے۔ اسی طرح جو اشیا تجارت کی نیت سے رکھے گئے ہوں، اُن میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے، تاہم جو اشیا اگرچہ ضرورت سے زائد ہو، لیکن ان میں تجارت کی نیت ہو تو ایسے اشیا میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں سائل کے پاس گاڑی حاجتِ اصلیہ میں داخل ہے اور مکان اگرچہ زائد ہے، لیکن تجارت کے لیے نہیں رکھا گیا ہے، اس لیے گاڑی اور مکان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولیس فی دور السکنی، وثیاب البدن، وأثاث المنازل، ودوابّ الرکوب، وعبید الخدمة، وسلاح الاستعمال زکوة) ؛لانّھا مشغولة بالحاجة الأصلیة، ولیست بنامیة.(۱)

ترجمہ:

اور رہائشی گھروں میں، بدن کے کپڑوں میں، گھر کے سامان میں، سواری کے جانوروں میں، خدمت کے غلاموں میں اور استعمال کے ہتھیاروں میں زکوٰۃ واجب نہیں؛ کیوں کہ یہ چیزیں اصلی حاجت میں مشغول ہیں اور یہ چیزیں بڑھنے والی بھی نہیں ہیں۔

---

(۱) الھدایة، کتاب الزکوٰۃ:۱/۲۰۲

استعمال سے زائد پلاٹ فروخت کرکے قیمت پر زکوٰۃ

سوال نمبر(281):

ایک آدمی کو میراث میں پلاٹ ملا تھا اور یہ شخص پہلے ہی سے صاحبِ نصاب ہے، اس نے وہ پلاٹ فروخت کردیا۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس پلاٹ کی قیمت پر زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے الگ طور پر سال گزرنا معتبر ہوگا یا دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب ہو اور دورانِ سال اس کی ملکیت میں مزید مال آجائے تو دونوں کو ملا کر ایک ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جب یہ شخص صاحبِ نصاب ہے اور پلاٹ بیچنے کی صورت میں مزید مال کا مالک بن گیا تو اس صورت میں دوسرے مال اور پلاٹ کی قیمت کو یکجا کرکے ایک ساتھ زکوٰۃ نکالی جائے گی، پلاٹ کی قیمت پر علاحدہ سال کا گزرنا ضروری نہیں، بلکہ پلاٹ کی رقم کو زکوٰۃ کے مال سے ملا کر مجموعہ کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومن كان له نصاب فاستفاد في أثناء الحول من جنسه ضمّه اليه وزكّاه به.(۱)

ترجمہ:

اگر کسی کے پاس نصاب کے بقدر مال موجود ہو اور درمیان سال اس کو اُسی جنس سے کچھ مال حاصل ہوجائے تو وہ اس کے ساتھ ملائے گا اور اس سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔



(۱) الهداية، كتاب الزكوة، فصل في الخيل: ۱/ ۲۰۹

بھٹی کے لیے خریدے گئے ایندھن پر زکوٰۃ

سوال نمبر(282):

بھٹی کے مالک نے اپنی بھٹی کے لیے دولاکھ روپے کا ایندھن خرید کر اس کو ایک جگہ محفوظ کر رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً اس کو استعمال کرتا ہے، ایسی صورت میں اس شخص پر مذکورہ مالیت کی زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر نانبائی اپنے استعمال کے لیے لکڑی وغیرہ خرید لے تو یہ اشیا اموالِ تجارت میں شمار نہیں ہوں گے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مزدوری کے لیے کوئی مشین خرید لے، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، یہی حکم بھٹی کے لیے خریدے گئے ایندھن کا بھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے کمائی کماتا ہے، اس لیے اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں۔

لہٰذا بھٹی کے لیے خریدے گئے ایندھن اور اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الخبّاز إذا اشتری ملحًا، أو حطبًا للخبز فلا زکوٰة فیه.(۱)

ترجمہ:

نانبائی اگر روٹی پکانے کے لیے نمک یا لکڑی خریدے تو اس میں زکوٰۃ نہیں۔



(۱) الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الزکوٰة، الفصل الثالث في زکوٰة عروض التجارة والمسائل المتعلقة بها: ۲/۱۸۱

فصل في أحكام الزكوٰة

(زکوٰۃ کے احکام کا بیان)

سونے چاندی کی زکوٰۃ میں قیمت کا اعتبار

سوال نمبر(283):

ایک شخص نے پندرہ تولے سونا کئی سال پہلے خریدا تھا۔اب اس کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔شریعتِ مطہرہ کی روسے زکوٰۃ کی ادائیگی میں قیمتِ خرید کا اعتبار ہوگا یا قیمتِ فروخت کا؟وضاحت فرمائیں۔

بیّنوا توجروا

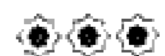
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سونے،چاندی میں قدرتی اور خلقی طور پر نمو(بڑھوتری) ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب سونا،چاندی نصاب تک پہنچ جائے تو اس سے حصۂ زکوٰۃ نکالا جاتا ہے،لیکن اگر کوئی شخص سونے،چاندی کی بجائے اس کی قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اس میں قیمتِ خرید کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ دیتے وقت سونے کی جو مروجہ قیمت (مارکیٹ ویلیو) ہوگی،اس کا اعتبار کرکے زکوٰۃ دینا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وتعتبرالقیمة یوم الوجوب،وقالا یوم الأداء..........ویقوّم في البلدالذي المال فیه،ولو في مفازة، ففي أقرب الأمصارإلیه. (۱)

ترجمہ: اور زکوٰۃ دیتے وقت جس دن واجب ہوئی تھی،اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور صاحبین کے نزدیک زکوٰۃ ادا کرنے والے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔۔۔۔اور اس شہر کی قیمت کا اعتبار ہوگا جس میں مال ہے اور اگر کسی صحرا وغیرہ میں ہو تو پھر قریبی شہر کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔



(۱)الدرالمختارعلی صدرردالمحتار،کتاب الزکوۃ،باب زکوٰۃ الغنم:۳/۲۱۱،۲۱۲

مالِ مستفاد کی زکوٰۃ

سوال نمبر(284):

اگر کسی صاحب نصاب شخص کو سال گزرنے سے پہلے پہلے کچھ رقم میراث کے طور پر ملے تو اس رقم کو پہلے نصاب کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا اس کے لئے علاحدہ سال کا گزرنا ضروری ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نصاب پر سال کا گزرنا ضروری ہے اور جو رقم سال کے درمیان میں کسی بھی سبب مثلاً: میراث، تجارت وغیرہ سے حاصل ہو جائے اور اصل نصاب والے مال کی جنس سے ہو تو اس مالِ مستفاد پر سال کا گزرنا شرط نہیں، بلکہ اصل نصاب سے ملا کر پورے مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وشرط وجوب أدائها حولان الحول على النصاب الأصلي، وأما المستفاد في أثناء الحول، فيضم إلى مجانسه، ويزكي بتمام الحول الأصلي سواء استفيد بتجارة، أو ميراث أو غيره. (۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے وجوب کے لیے شرط یہ ہے کہ اصل نصاب پر پورا سال گزر جائے اور جو مال سال کے درمیان حاصل ہو تو اس کو اس کے ہم جنس کے ساتھ ملایا جائے گا اور سال گزرنے پر اس سے ادائیگی زکوٰۃ لازم ہوگی، چاہے وہ مال تجارت سے حاصل ہوا ہو یا میراث سے یا ان کے علاوہ کسی اور طریقہ سے حاصل ہو۔

❁❁❁

استعمال کے زیورات کی زکوٰۃ

سوال نمبر(285):

بعض عورتیں اس غرض سے زیورات استعمال کرتی ہیں کہ استعمال کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(۱) مراقي الفلاح على صدر حاشية الطحطاوي، كتاب الزكوٰة: ۵۸۸

کیا واقعی استعمال ہونے والے زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سونا چاندی خواہ زیورات کی شکل میں ہو یا برتنوں کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں موجود ہوں، بشرطیکہ نصاب کو پہنچے چاہے یہ زیرِ استعمال ہوں یا نہ ہوں، شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔

والدلیل علیٰ ذلک:

وفي تبر الذهب، والفضة، وحليهما، وأوانيهما الزكوة.(۱)

ترجمہ:

سونے چاندی کی ڈلی، زیورات اور برتنوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔

❀❀❀

مختلف کفارات کے ہوتے ہوئے زکوٰۃ

سوال نمبر (286):

اگر ایک شخص کے ذمہ کئی قسموں کا کفارہ واجب الادا ہو، ایسا ہی نذر یا صدقۂ فطر کی رقم باقی ہو تو کیا زکوٰۃ کے وجوب کے لیے یہ ذمہ داریاں مانع ہیں؟ اگر مانع نہ ہوں تو پھر زکوٰۃ اور دوسرے صدقاتِ واجبہ میں کیا فرق ہے؟ حالانکہ دونوں حقوق اللہ ہیں۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نذر، کفارۂ یمین اور صدقۂ فطر مانعِ وجوبِ زکوٰۃ نہیں۔ ان ذمہ داریوں کے باوجود زکوٰۃ واجب رہے گی اور زکوٰۃ کے وجوب سے ان حقوق کا منہا کرنا ضروری نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں: وكل دين لا مطالب له من جهة العباد كديون الله تعالىٰ من النذور، والكفارات، وصدقة الفطر، ووجوب الحج لا يمنع (۲)

(۱) الهداية، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في الذهب: ۱/ ۲۱۱

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها: ۱/ ۱۷۳

ترجمہ:

ہروہ قرض جس کا مطالبہ مخلوق کی جانب سے نہ ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ کا قرض، جیسے نذر، کفارات، صدقہ فطر یا حج کے وجوب کی ذمہ داری زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مانع نہیں۔

زکوٰۃ اور دوسرے صدقاتِ واجبہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ موخرالذکر صدقات میں مخلوق کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں پایا جاتا، جبکہ زکوٰۃ میں حاکمِ وقت مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں مانعین زکوٰۃ سے آپؓ نے جہاد کیا۔ اب بھی جو قوم زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرے تو مسلمان حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی قوم کے خلاف طاقت استعمال کر کے زکوٰۃ وصول کرے، جبکہ حج یا نذر وغیرہ کی عدمِ ادائیگی پر طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں۔ علامہ ابن عابدینؒ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والمطالب هنا السلطان تقديرا .(۱)

ترجمہ:

یہاں مطالبہ کرنے والے سے حکماً بادشاہ مراد ہے۔



آلاتِ تجارت اور مشینری کی زکوٰۃ

سوال نمبر (287):

ہمارے علاقے میں ایک پرائیوٹ ڈینٹل ہسپتال ہے۔ جس میں بہت سے جدید آلات نصب کر دیے گئے ہیں اور ان میں ہر ایک مشین کی قیمت زکوٰۃ کی مقدارِ نصاب سے کئی گنا زیادہ ہے، جس کے ذریعے روزانہ لاکھوں روپے کی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا ان آلات کی قیمتوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا صرف آمدنی کا حساب لگا کر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ دینے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق آمدنی کے لیے جو آلہ استعمال کیا جائے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة، مطلب الفرق بين السبب والشرط: ۱۷۶/۳

البتہ جو آمدنی ان مشینوں اور آلات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اگر مقدارِ نصاب تک پہنچتی ہو اور اس پر سال بھی گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لہٰذا اگر مذکورہ مشینیں آمدنی کے لیے بطورِ آلات استعمال ہوتی ہوں، تجارت کی غرض سے نہ ہوں تو سال گزرنے کے بعد آمدنی کا حساب لگا کر زکوۃ دینے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا، کیوں کہ ایسی مشینوں پر زکوۃ نہیں، جو خود تجارت کے لیے نہ ہوں، بلکہ آلۂ تجارت ہوں۔

والدّليل علىٰ ذلك:

وأما آلات الصناع الذين يعملون بها،وظروف الأمتعة للتجارة ،لاتجب فيه الزكوة؛لأنهاليست بمعدة للتجارة.(۱)

ترجمہ: صناعت کے آلات جن پر کاریگر کام کرتے ہیں اور بطورِ تجارت فائدہ اٹھانے والے برتنوں پر زکوۃ نہیں، کیونکہ وہ تجارت کے لیے تیار نہیں کیے گیے۔

❁❁❁

نصاب کا وقت بھول جانے کی صورت میں زکوٰۃ

سوال نمبر(288):

ایک شخص صاحبِ نصاب بن چکا ہے۔اب وہ زکوٰۃ دینا چاہتا ہے،لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ نصاب کا وقت کب سے ہے۔اب کس وقت سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حساب ہوگا؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق:

فقہائے کرام کے اصول کو مدِنظر رکھ کر جب کسی حکم کے وجوب کے زمانے میں شک پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں مبتلی بہ کے ظن غالب کو یقین کا قائم مقام قرار دے کر اعتبار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ صورتِ مذکورہ میں جب مذکورہ شخص کو وجوب کا وقت معلوم نہیں تو ظن غالب سے صاحبِ نصاب بننے کے وقت کا تعین کر کے اس وقت سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔

(۱)الكفاية في ذيل فتح القدير،كتاب الزكوة،فصل في العروض:۲/۱۷۰

والدّليل علىٰ ذلك:

والظن الطرف الراجح ،وهو ترجيح جهة الصواب ،والوهم رجحان جهة الخطاء، وأما أكبر الرأي، وغالب الظن ،فهو الطرف الراجح إذاأخذبه القلب، وهو المعتبر عند الفقهاء ......وغالب الظن عندهم ملحق باليقين، وهو الذي يبتني عليه الأحكام. (۱)

ترجمہ:

اورظن راجح طرف کوکہا جاتا ہےاور یہ صحیح جانب کوترجیح دیتا ہے۔اور وہم غلطی والی جہت کے رجحان کوکہا جاتا ہے۔جہاں تک اکبررائے اورغالب ظن کاتعلق ہےتو یہ طرفِ راجح کو کہتے ہیں جب دل اس کوقبول کرے، یہ فقہاے کرام کے ہاں معتبر ہےاورغالبِ ظن فقہاکے ہاں یقین کےقریب ہےاوراسی پراحکام کی بناہوتی ہے۔

❁❁❁

زکوٰۃ سے مہرِ مؤجل منہا کرنا

سوال نمبر(289):

ایک صاحبِ نصاب شخص کے ذمہ اپنی بیوی کا مہرِ مؤجل ہے،یعنی وہ مہر جونقدادا کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ ادائیگی کے لیے میعادمقرر کی گئی ہو،اگر یہ شخص مہرِ مؤجل دینا چاہےتو پھر یہ صاحبِ نصاب نہیں رہتا۔کیامہرِ مؤجل زکوٰۃ کے لیے مانع ہے؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللّٰه التوفيق :

فقہاے کرام کی عبارات کے مطابق مہرِ مؤجل زکوٰۃ کے لیے مانع نہیں، بلکہ جوشخص صاحبِ نصاب ہوتواس پرپوری رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔

لہٰذاصورتِ مسئولہ میں اپنی رقم سے مہرِ مؤجل کی رقم منہا کرنا جائزنہیں، بلکہ جورقم صاحبِ نصاب کے ساتھ موجودہواوراس پرسال گزرجائےتواس پوری رقم میں زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

---

(۱)شرح الأشباه والنظائر،الفن الأول:القاعدة/الثالثة:۱/۲۲۲،۲۲۳

والدلیل علیٰ ذلک:

(فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد) سواء كان لله، كزكوة، وخراج، أو للعبد، ولو كفالة، أو مؤجلاً، ولو صداق زوجته المؤجل قال ابن عابدين: والصحيح أنه غير مانع. (١)

ترجمہ:

لوگوں کے مطالبہ سے فارغ مال، چاہے خاص اللہ کے لیے ہو، مثلاً: زکوٰۃ، خراج یا بندہ کے لیے ہو، مثلاً: کفالت یا مؤجل ہو، جیسا کہ عورت کا مہر مؤجل، اور صحیح یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں مانع زکوٰۃ نہیں۔

❁❁❁

مسجد کے فنڈ میں زکوٰۃ

سوال نمبر(290):

مسجد کے فنڈ میں ایک خطیر رقم جمع ہو چکی ہے جو زکوٰۃ کے نصاب سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کیا از روئے شریعت اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

موقوفہ چیز چونکہ کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتی، اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مسجد کا فنڈ وغیرہ وقف کے حکم میں ہے، اس لیے اگر چہ مسجد کا فنڈ بقدرِ نصاب جمع ہو جائے اور اس پر سال بھی گزر جائے، تب بھی اس میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں۔

والدلیل علیٰ ذلک:

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) قال ابن عابدين: قوله: (ملك نصاب) فلا زكوة في سوائم الوقف، والخيل المسبلة لعدم الملك. (٢)

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة، مطلب: الفرق بين السبب والشرط: ٣/١٧٦، ١٧٧

(٢) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة، مطلب: في أحكام المعتوه: ٣/١٧٤

ترجمہ: اور فرضیتِ زکوٰۃ کا سبب مالکِ نصاب ہونا ہے، جس پر سال گزر جائے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: (ملک نصاب ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ وقف چرنے والے جانوروں اور چھوڑے ہوئے گھوڑوں پر عدمِ ملک کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں۔

❁❁❁

کمیٹی کی رقم کی زکوٰۃ

سوال نمبر(291):

تاجر لوگ عموماً آپس میں کمیٹی کے نام سے خاص مقدار میں برابر رقم جمع کرتے ہیں۔ ہر ماہ قرعہ اندازی سے جمع شدہ رقم ایک شخص لے لیتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ سب کو بالآخر اپنی اپنی رقم مل جاتی ہے۔ کیا جس شخص کو اولاً پوری رقم ملی ہے، وہ اس پوری رقم سے زکوٰۃ ادا کرے گا یا دوسرے ممبروں کی جو رقم اس کے ذمے ہے، اس کو منہا کر کے بقیہ مال میں زکوٰۃ ادا کرے گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

کمیٹی کی رقم جو بھی لیتا ہے، وہ بقیہ افراد کا اس پر قرضہ ہوتا ہے، اس لیے شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جس صاحبِ نصاب شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کا قرض ہو تو اس رقم کو منہا کر کے جتنی رقم باقی بچے، اس کے حساب سے زکوٰۃ کی ادائیگی کرے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جس شخص نے اولا جملہ رقم لی ہے اور اس میں مثلاً نو (۹) آدمی اس کے علاوہ شریک ہوں تو ان کی رقم کو اپنے مال سے منہا کر کے بقیہ مال میں زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال أصحابنا: كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكوة، سواء كان الدين للعباد كالقرض، وثمن البيع، وضمان المتلفات، وإرش الجراحة.(۱)

ترجمہ: ہمارے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ہر وہ قرض جس پر لوگوں کی جانب سے مطالبہ ہو تو وہ وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے، چاہے وہ دین لوگوں کا ہو، جیسا کہ قرض، بیع کی رقم، گم کی ہوئی اشیا کا ضمان یا زخموں کا تاوان۔

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها: ۱۷۲/۱

حج کے لیے جمع کردہ رقم میں زکوٰۃ

سوال نمبر(292):

ایک شخص نے ٹریول ایجنسی کو حج کے لیے رقم دی ہے جو کہ نصاب سے زیادہ ہے اوراس پر سال بھی گزر چکا ہے۔کیا حج کے لیے جمع کردہ اس رقم پر زکوۃ واجب ہوگی؟ بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کسی شخص کے پاس ضروریات سے زیادہ رقم موجود ہو،خواہ اپنے نفقہ کے لیے ہو یا کسی اور کام کے لیے ہو بہرصورت اس میں زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی ،البتہ وہ اموال جن میں اس کے ذمے بندوں کے حقوق واجب الادا ہوں تو نصاب زکوۃ سے اس کو منہا کیا جاتا ہے اور وہ اموال جو کسی بندہ کے ذمے من جانب اللہ واجب الادا ہوں،جیسے فطرانہ،کفارہ،نذر اور حج وغیرہ کی رقومات تو ان میں زکوٰۃ ادا کرنا بندہ کے ذمہ لازم ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر کسی کے پاس حج کے واسطے جمع کردہ رقم بقدرِ نصاب ہو تو حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا اس پر لازم ہوگا،لہٰذا جب تک مذکورہ رقم حج کی ضروریات واخراجات میں خرچ نہیں ہوئی تو اس میں زکوۃ ادا کرنی واجب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وكل دين لامطالب له من جهة العباد، كديون الله تعالىٰ من النذور، والكفارات وصدقة الفطر، ووجوب الحج لايمنع.(۱)

ترجمہ: ہر وہ قرض جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قرض ہیں مثلاً نذریں، کفارے، صدقۃ الفطر اور حج کا واجب ہونا تو ایسے قرض وجوب زکوۃ کے لیے مانع نہیں۔

ويخالفه مافي معراج الدراية في فصل زكوٰة العروض:أن الزكوة تجب في النقد كيفماأمسكه للنماء أوللنفقة.(۲)

ترجمہ: اورمعراج الدرایہ میں زکوۃ العروض کے فصل میں اس کے مخالف لکھا ہے کہ زکوۃ نقود میں واجب ہے،جس طریقے سے بھی ساتھ رکھی جائے،چاہے تجارت کے لیے ہو یا خرچ کے لیے۔

(۱)الفتاوى الهندية ، كتاب الزكوة،باب في تفسيرهاوصفتها:۱/۱۷۳

(۲)البحرالرائق،كتاب الزكوة،تحت قوله(وهوقيد حسن):۲/۳٦۱

کتابوں کی زکوٰۃ

سوال نمبر(293):

میرا بھائی ڈاکٹر ہے اور اس کے پاس بہت کتابیں ہیں جن کی مجموعی قیمت تقریباً ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ ہو گی ،لیکن یہ کتابیں صرف مطالعہ کے لیے اپنی ذاتی لائبریری میں رکھی گئی ہیں جن میں تجارت کا کوئی ارادہ نہیں۔کیا اس طرح کی کتابوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق مال ودولت چاہے جس نیت سے رکھی جائے نصاب تک پہنچنے کی صورت میں اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی،اس کے علاوہ اشیا میں جب تک تجارت کی نیت نہ پائی جائے ،ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی،اگرچہ اس کی قیمت زکوٰۃ کے نصاب کے برابر ہو۔لہٰذا صورتِ محررہ میں اگر کتابیں صرف مطالعہ کے لیے استعمال کی جارہی ہوں اور ان میں تجارت کی نیت نہ ہو تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(منها فراغ المال)عن حاجته الأصلية ......وكذا كتب العلم إن كان من أهله، وآلات المحترفين. (١)

ترجمہ: اور ان میں سے ایک شرط مال کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے۔۔۔۔اس طرح علم کی کتابیں اگر مالکان ان کے اہل ہوں (یعنی اس فن سے تعلق رکھتے ہوں)اور پیشہ وروں کے آلات (یعنی ان چیزوں میں زکوٰۃ نہیں)۔

❁❁❁

میت کے مال سے زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال نمبر(294):

ایک شخص جس پر کئی سالوں سے زکوٰۃ واجب ہو چکی تھی ،لیکن اس نے اپنی زندگی میں زکوٰۃ ادا نہیں کی۔اب وہ

(١)الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،الباب الأول في تفسيرها:١/١٧٢

فوت ہو چکا ہے اور اس کا ترکہ ورثا میں ابھی تک تقسیم نہیں ہوا تو کیا ایسے شخص کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنے سے اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا؟

بینوا توجروا

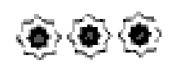
الجواب وباللہ التوفیق:

اگر مذکورہ شخص نے زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہو تو ثلثِ مال میں وصیت جاری ہوگی اور ورثا پر واجب ہے کہ میت کے ترکہ کے ثلث سے زکوٰۃ ادا کر کے اس کا ذمہ فارغ کر دے، لیکن اگر وصیت نہیں کی تو میت کے ساتھ تبرع اور احسان کے طور پر اس کے مال سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے بشرطیکہ ورثا سب اس بات پر متفق ہوں، البتہ ورثا کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، جب سب راضی ہوں تو ادائیگی سے ذمہ فارغ ہونے کی اُمید ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

تحت قوله:(ولو مات،فأداهاوارثه جاز). في الجوهرة:إذامات من عليه زكوة،أو فطرة،أو كفارة،أو نذرلم تو خذ من تر كته عندنا،إلاأن يتبرع ورثته بذلك ،وهم من أهل التبرع ،ولم يجبرواعليه، وإن أو صى تنفذ من الثلث.(۱)

ترجمہ: علامہ شامی اس قول کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ (:اگر مر جائے اور اس کا وارث زکوٰۃ ادا کرے تو جائز ہے) جوہرہ میں لکھا ہے کہ جب کسی شخص کے ذمے زکوٰۃ، فطرانہ، کفارہ یا نذر واجب ہو تو ہمارے ہاں اس کے ترکے سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے رقم لینا درست نہیں۔ ہاں اگر اس کے ورثا اس پر احسان کریں اور وہ اہلِ تبرع میں سے ہوں اور ورثا کو مجبور نہ کیا جائے، البتہ اگر اس نے اپنی ادائیگی زکوٰۃ کی وصیت کی تو ثلث مال میں نافذ ہوگی۔



ایڈوانس کرایہ کی زکوٰۃ

سوال نمبر(295):

ایک شخص نے کرایہ پر دُکان لی ہے اور مالک دُکان نے اُس سے ایڈوانس کرایہ لیا ہے، اس مجموعہ کرایہ کی زکوٰۃ دکان کے مالک پر واجب ہوگی یا کرایہ دار پر، جبکہ ایڈوانس (پیشگی) رقم نصاب سے زیادہ ہے؟

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوة، باب صدقة الفطر:۳/۳۱۱

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہی نقطہ نظر سے ایڈوانس اور پیشگی کرایہ لینے سے مالک دکان کرایہ کا مالک بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کرایہ دار اس سے مذکورہ ایڈوانس کرایہ کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا، چونکہ مالک دکان مجموعہ مالیت کا مالک بن جاتا ہے، اس لیے اس پر پوری رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور کرایہ دار کی ملک سے یہ رقم نکل گئی اس لیے اُس پر اس ایڈوانس رقم کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وأما زكوٰة الأجرة المعجلة عن سنين في الإجارة الطويلة التي يفعلهابعض الناس عقوداً، ويشترطون الخيارثلاثة أيام في رأس كل شهر،فتجب على الآجر،لأنه ملكها بالقبض .(۱)

ترجمہ: اور جہاں تک اُس اُجرت کی زکوٰۃ کا حکم ہے جو طویل المیعاد اجارہ کے معاملات میں کئی سال کی پیشگی دی جاتی ہے، بعض لوگ ایسے معاملات کرتے ہیں، تو اس میں اُجرت لینے والے پر زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ قبضہ کرنے سے وہ مالک بن چکا ہے۔

۞۞۞

زکوٰۃ کی رقم چوری ہوجانے پر زکوٰۃ

سوال نمبر(296):

ایک سرمایہ دار شخص نے اپنے دفتر میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے اپنے مال سے رقم جدا کر رکھی تھی اور ابھی تک یہ مذکورہ رقم مستحقینِ زکوٰۃ میں تقسیم نہیں ہوئی تھی کہ رات کو کسی نے دفتر سے وہ رقم چوری کرلی تو کیا اس کا ذمہ زکوٰۃ دینے سے فارغ ہوگیا یا دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جب تک زکوٰۃ کی رقم فقرا، غربا اور مساکین کو تملیکاً نہ دی جائے، اس وقت تک زکوٰۃ کی ادائگی درست نہیں۔

---

(۱) فتح القدیر، کتاب الزکوٰۃ: ۱۲۱/۲

صورتِ محررہ کی روشنی میں اگر زکوٰۃ کے لیے علاحدہ کی گئی رقم چوری ہوگئی ہو تو شرعی نقطہ نظر سے چونکہ اس میں تملیک کی شرط نہیں پائی گئی، اس وجہ سے مذکورہ شخص پر دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

رجل عزل زکوٰۃ مالہ، ووضعھا في ناحیۃ بیتہ فسرقھا سارق لایقطع یدہ لشبھۃ، وعلیہ أن یزکیھا.(۱)

ترجمہ: کسی شخص نے مالِ زکوٰۃ الگ کرکے اپنے گھر کے کسی کونے میں رکھا، پس اس کو کسی چور نے چوری کیا تو شبہ کی وجہ سے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور اس مزکی (زکوٰۃ دینے والے پر) دوبارہ زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہے۔

❁❁❁

بروقت زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا حکم

سوال نمبر (297):

اگر کوئی شخص قصداً یا غفلت کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرسکے اور اگلے سال ادا کرنا چاہے تو زکوٰۃ تاخیر سے ادا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جب کسی شخص پر زکوٰۃ واجب ہوجائے تو اس کو جلدی ادا کرنا چاہیے، تاہم وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں بھی جب بھی زکوٰۃ ادا کرے گا تو اس کا ذمہ فارغ ہوگا، اس لیے کئی سال گزرنے کے باوجود بھی مذکورہ شخص پر قضا شدہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اس سے ذمہ تب فارغ ہوگا، جب زکوٰۃ ادا کی جائے، ورنہ گناہ گار رہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وتجب علی الفور عند تمام الحول حتی یأثم بتاخیرہ من غیر عذر، وفي روایۃ الرازي علی التراخي، حتی یأثم عند الموت، والأول أصح.(۲)

---

(۱) خلاصۃ الفتاوی، کتاب الزکوۃ، الفصل الخامس في زکوٰۃ المال: ۱/ ۲۳۸

(۲) الفتاوی الھندیۃ، کتاب الزکوۃ، الباب الأول في تفسیرھا: ۱/ ۱۷۰

ترجمہ: اور سال پورا ہوتے ہی زکوٰۃ فوری طور پر واجب ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ بغیر عذر کے تاخیر کرنے سے گناہ گار ہوگا اور امام رازیؒ کی روایت کے مطابق زکوٰۃ واجب علی التراخی (یعنی وقت گزرنے کے بعد جب بھی ادا کرے، ادائیگی درست ہوگی) چنانچہ موت کے وقت تک اگر زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو گناہ گار ہوگا اور پہلا قول صحیح ہے۔

❀❀❀

حرام اور حلال مخلوط مال میں زکوٰۃ

سوال نمبر(298):

ایک شخص کے پاس کچھ مال ایسا ہے جو حلال کمائی کا ہے، جبکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کچھ سودی مال بھی ہے۔ اب وہ اس مال سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو کیا مجموعہ رقم سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا صرف حلال مال سے زکوٰۃ ادا کرے اور سود کے مال میں زکوٰۃ ادا نہ کرے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ کی رُو سے اگر حلال اور حرام مال مخلوط ہو اور اس کی مقدار علیحدہ علیحدہ معلوم ہو تو حلال کمائی سے زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔ حرام مال کے بارے میں فقہائے کرام نے اصل حکم یہ لکھا ہے کہ اس کو واپس کیا جائے، لیکن اگر اس کا مالک معلوم نہ ہو تو پھر اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، لیکن اگر حرام اور حلال دونوں کو اکٹھا کر کے اس سے زکوٰۃ ادا کی جائے تو حلال مال میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور حرام مال اگرچہ خبیث ہے، لیکن اس کے مالک معلوم نہیں ہوتے، اس لیے اگر اس میں زکوٰۃ کی نیت کرے تو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لو أخرج زكوٰة المال الحلال من مال حرام ذكر في الوهبانية :أنه يجزئ عند البعض ، ونقل القولين في القنية.وقال في البزازية: ولو نوىٰ في المال الخبيث الذي وجبت صدقته،أن يقع عن الزكوٰة وقع عنها:أي نوىٰ في الذي وجب التصدق به لجهل أربابه. (۱)

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمختار،کتاب الزکوۃ،مطلب في التصدق من المال الحرام:۳/۲۱۹

ترجمہ: اور اگر مال حلال کی زکوٰۃ حرام سے دے تو وہبانیہ میں ذکر ہے کہ: بعض کے ہاں یہ جائز ہے۔ اور قنیہ میں دو قول منقول ہیں اور بزازیہ میں لکھا ہے کہ: اگر خبیث مال جو واجب التصدق ہے، اس کو زکوٰۃ کی نیت سے دیدے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، یعنی اس مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرے جس کو صدقہ کرنا واجب ہو، کیونکہ اس کے مالک معلوم نہیں۔

❁❁❁

واجب مقدار سے زائد زکوٰۃ کو آئندہ سال کی زکوٰۃ شمار کرنا

سوال نمبر(299):

ایک شخص نے ساٹھ لاکھ روپے مالیت کا حساب لگا کر زکوٰۃ کی ادائیگی کر دی۔ بعد میں جب اپنی مالیت کا حساب لگایا تو اس کے ساتھ کل مالیت پچاس لاکھ روپے تھی۔ کیا آئندہ سال زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اس زائد رقم کو اس زکوٰۃ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی ادائیگی میں مال کے حساب میں غلطی کی وجہ سے واجب مقدار سے زیادہ زکوٰۃ دے دے تو زائد رقم کو آئندہ سال کے حساب میں شمار کر سکتا ہے، کیوں کہ فقہائے کرام نے سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس لیے محررہ صورت میں زکوٰۃ کی زائد رقم کو آئندہ سال کی زکوٰۃ سے منہا کرنا جائز ہے اور آئندہ سال صرف بقیہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لو كان عنده أربع مائة درهم،فأدى زكوة خمس مائة ظانا أنها كذلك كان له أن يحسب الزيادة للسنة الثانية؛لأنه أمكن أن يجعل الزيادة تعجيلاً.(١)

ترجمہ: اگر اس کے پاس چار سو درہم ہوں اور اس نے پانچ سو درہم کی زکوٰۃ ادا کی، اس خیال سے کہ رقم پانچ سو ہے اتنی زکوٰۃ ہے تو زائد زکوٰۃ کو دوسرے سال کی زکوٰۃ میں شمار کر سکتا ہے، کیوں کہ اس کو سال گزرنے سے پہلے دیا گیا زکوٰۃ تصور کرنا ممکن ہے

(١) ردالمحتار على الدرالمختار،كتاب الزكوة،باب زكوة الغنم،مطلب:استحلال المعصية القطعية كفر:٢٢١/٣

زکوٰۃ کی رقم کا ضائع ہوجانا

سوال نمبر(300):

ایک تاجر نے زکوٰۃ کی رقم غربا پر تقسیم کرنے کے لیے اپنی دُکان میں رکھی تھی کہ رات کو دکان میں آگ لگ گئی اوراس میں موجودہ سامان کے ساتھ مذکورہ رقم بھی جل کر راکھ بن گئی تو کیا زکوٰۃ کی رقم ہلاک ہونے کی وجہ سے دوبارہ زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہی عبارات کے مطابق زکوٰۃ فقرا غربا ومساکین کو تملیکاً دینا شرط ہے،لہٰذا جب زکوٰۃ کی رقم فقرا میں تقسیم کرنے سے پہلے ہلاک ہوجائے تو اس سے مزکی (زکوٰۃ دینے والا) کا ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر واقعی زکوٰۃ کی رقم غربا وفقرا میں تقسیم ہونے سے پہلے ہلاک ہوگئی ہو تو تملیک کی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے اس شخص پر دوبارہ زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، کیوں کہ محض زکوٰۃ کا مال جدا کرکے الگ جگہ رکھنے سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا، بلکہ تملیک کے طور پر غریب کو ادا کرنا شرط ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي الدرالمختار:ولایخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء .قال ابن عابدین:فلو ضاعت لا تسقط عنه الزکوة. (۱)

ترجمہ:

اور الگ کرنے کے ساتھ اس کا ذمہ فارغ نہیں ہوگا، بلکہ فقرا کو ادا کرنے سے یہ بری ہوگا۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:اگر یہ رقم ضائع ہوگئی تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی۔

❁❁❁

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوة،مطلب في زکوة ثمن المبیع وفاء:۱۸۹/۳

حقِ مہر کی ادائیگی اور وجوب زکوٰۃ

سوال نمبر(301):

ایک شخص نے نکاح کرتے وقت بیوی کے حقِ مہر میں ایک لاکھ روپے لکھے ہیں اور نکاح نامہ پر نکاح کرتے وقت (بوقتِ مطالبہ) ادائیگی کا اقرار کر چکا ہے، لیکن عام معاشرتی حالات کے مطابق رخصتی کے بعد حقِ مہر کے مطالبہ کی صورت بہت کم پیش آتی ہے، عموماً میاں بیوی آپس میں خوش اسلوبی سے وقت گزارتے ہیں اور ایک دوسرے سے مطالبہ نہیں کرتے۔ اکثر بیوی معاف کر دیتی ہے، الا یہ کہ کہیں جدائی کا موقع آجائے تو پھر خاوند سے بیوی مطالبہ کرتی ہے یا اس کے رشتہ دار مانگتے ہیں، ایسی صورت میں جب تک خاوند نے حقِ مہر ادا نہ کیا ہو، زکوٰۃ کے وجوب کے لیے ایسا حقِ مہر مانع ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

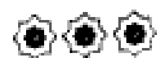
اس میں کوئی شک نہیں کہ حقِ مہر بھی دیگر قرضوں کی طرح خاوند کے ذمہ واجب الاداحق ہے۔ بیوی جب چاہے خاوند سے مطالبہ کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ اگر بیوی یہ حق معاف کرے تو پھر خاوند کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے گویا اس میں بھی فراغتِ ذمہ کے لیے ادائیگی یا عفو ضروری ہے، لیکن عرف میں اگر باہمی طور پر خوشگوار تعلقات کے وقت حقِ مہر نہیں مانگا جاتا تو ایسی صورت میں حقِ مہر کا وجوب زکوٰۃ کے لیے مانع قرار دینا صحیح نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قال مشایخنا في رجل علیه مهر مؤجل لإمرأته، وهو لا یرید أداء ه لا یجعل مانعا من الزکوة لعدم المطالبة في العادة، وأنه حسن أیضاً.(۱)

ترجمہ:

ہمارے مشائخ" اس شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جس پر اپنی بیوی کا مہرِ مؤجل ہو اور وہ ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو یہ زکوٰۃ سے مانع نہیں، کیوں کہ عادۃً اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا اور یہ مناسب بھی ہے۔



(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوة، الباب الأول في تفسیرها: ۱/۱۷۳

چند سالوں کی زکوٰۃ پیشگی یکمشت ادا کرنا

سوال نمبر(302):

اگر کوئی شخص سال گزرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کردے تو اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوگی یا نہیں؟ اور کئی سالوں کی زکوٰۃ یکمشت ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

نصابِ زکوٰۃ کی ملکیت چونکہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے سبب ہے اور حولانِ حول شرط ہے، اس لیے سبب موجود ہونے کے بعد شرط کے بغیر بھی زکوٰۃ کی ادائیگی جائز ہے۔ایسی صورت میں اگر کوئی شخص چند سالوں کی زکوٰۃ پیشگی یکمشت ادا کرنا چاہے تو بھی درست ہے۔تاہم اگر نصاب سال مکمل ہونے سے قبل ختم ہوجائے تو پھر یہ زکوٰۃ کی بجائے صدقہ ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویجوز تعجیل الزکوۃ قبل الحول إذا ملك نصابا عندنا......وإذا عجل زکوٰۃ سنین ، یجوز عند علمائنا الثلثة خلافا لزفرؒ.(۱)

ترجمہ: ہمارے نزدیک سال پورا ہونے سے قبل زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے، بشرط یہ کہ نصاب کا مالک ہو اور جب کئی سال کی زکوٰۃ پیشگی ادا ہو تو امام زفرؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ کے نزدیک زکوٰۃ درست رہے گی۔

❁❁❁

سامانِ تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت کا اعتبار

سوال نمبر(303):

مکان میں تجارت کے لیے رکھے ہوئے سامان میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟ اموالِ تجارت کی قیمتِ فروخت عموماً قیمتِ خرید سے زیادہ ہوتی ہے۔اس میں کونسی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

(۱) الفتاوی التاتارخانیة، کتاب الزکوۃ، الفصل السادس في تعجیل الزکوۃ:۲/۱۹۱

الجواب وباللہ التوفیق :

اشیاءِ تجارت پر جب سال گزر جائے اور ان کی مالیت مقررہ نصاب زکوۃ تک پہنچتی ہو تو ایسی صورت میں اشیاءِ تجارت کی قیمت لگا کر زکوۃ ادا کی جائے گی، جہاں تک قیمت میں کمی اور زیادتی کا مسئلہ ہے تو قیمت میں اُتار چڑھاؤ کے لیے چند اسباب ہوسکتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا حکم الگ ہے:

(ا)......کسی چیز کی قیمت کا یہ فرق علاقائی ہو، یعنی ایک گاؤں میں قیمت کم ہو اور دوسرے گاؤں میں زیادہ ہو تو ایسی صورت میں اس جگہ کی قیمت کا اعتبار ہوگا، جہاں پر کاروبار ہوتا ہو۔

قال ابن الهمام: (يقومها)أي المالك في البلد الذي فيه المال، حتى لو كان بعث عبدالتجارة إلى بلد أخرىٰ لحاجة، فحال الحول يعتبر قيمته في ذلك البلد.(۱)

ترجمہ:

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ: مالک اس کی قیمت اس شہر کے مطابق متعین کرے گا جس میں وہ مال موجود ہو، چنانچہ اگر تجارت کے لیے غلام کسی حاجت کی بنا پر دوسرے شہر بھیجا اور اس پر سال گزر جائے تو اس دوسرے شہر کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

(ب)......اگر قیمت کا یہ فرق وقتی ہو، یعنی خریدتے وقت بازار میں جو قیمت تھی، حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ابھی وہ قیمت نہ رہی، ایسی حالت میں بالاتفاق قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں، تاہم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس وقت کی قیمت معتبر ہے جس وقت زکوۃ واجب ہو، جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ادائیگی کے وقت کو اعتبار دیا جائے گا۔

قال ابن نجيمؒ :ثم عند أبي حنيفةؒ تعتبر القيمة يوم الوجوب، وعندهما يوم الأداء.(۲)

ترجمہ: علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہؒ کے ہاں واجب ہونے والے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ: ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

(ج)......تیسری صورت یہ ہے کہ اگر قیمت کا یہ فرق اموالِ تجارت میں کسی کمی یا اضافے کا نتیجہ ہو تو اس صورت میں بھی سال پورا ہونے پر موجودہ سال کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یہاں تک کہ اگر کاروبار شروع کرتے وقت مالک صاحبِ نصاب ہو، لیکن سال مکمل ہونے سے قبل کاروبار میں نقصان ہونے کی وجہ سے اموالِ تجارت کی مالیت مقررہ نصاب تک نہ پہنچتی

(۱)فتح القدير، كتاب الزكوة،باب زكوة المال:۲/۱۶۷

(۲)البحر الرائق، كتاب الزكوة،باب زكوة المال(تحت قوله:وفي عروض التجارة):۲/۴۰۰

ہوتو زکوۃ ساقط رہے گی، البتہ سال پورا ہونے کے بعد مال میں نقصان کا اثر زکوۃ واجب پر نہیں پڑے گا۔

ولو كان الزيادة ، والنقصان في العين قبل الحول ، ثم حال الحول،وهي كذلك ، ففي الزيادة تجب الزكوة زائدة؛لأن تلك الزيادة مستفادة في خلال الحول ، فيضم إلى الأصل ، وفي النقصان لاتجب الزكوة؛لأن النصاب غير كامل.(١)

ترجمہ:

اگر سال گزرنے سے قبل عین چیز (نصاب) میں زیادت یا نقصان ہو جائے اور پھر اسی حالت میں اس پر سال گزر جائے تو زیادت کی صورت میں زیادہ زکوۃ دینا واجب ہوگا، کیونکہ یہ زیادت سال کے دوران حاصل ہوئی تو اس زیادت کو بھی اصل نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور نقصان کی صورت میں زکوۃ واجب نہیں رہے گی، کیوں کہ اس صورت میں نصاب غیر کامل شمار ہوگا۔

(د)...... چوتھی صورت یہ ہے کہ قیمت کا یہ فرق عوارض کی وجہ سے ہو، مثلاً تھوک اور پرچون کا فرق ہو یا کسی شخص کی وجاہت، تعلق، رفاقت یا رشتہ کی وجہ سے قیمت میں تخفیف کی جاتی ہو، ایسی حالت میں مارکیٹ کی مروجہ قیمت کو مدِ نظر رکھ کر مالیت کا حساب کیا جائے گا، کیوں کہ قیمتِ خرید وفروخت میں تفاوت کی وجہ سے یکسانیت مختلف ہے اور اگر مارکیٹ کی مروجہ قیمت بھی مختلف ہو تو پھر نقدیت میں "غالب نقد البلد" کی اعتبار طرح عام قیمت کو اعتبار دیا جائے گا۔

عن محمدؒ: انه يقومها بالنقد الغالب على كل حال.(٢)

ترجمہ: امام محمدؒ سے منقول ہے کہ: بہر حال اس کی قیمت مروجہ مارکیٹ میں اکثر استعمال ہونے والی کرنسی کے مطابق لگائے گا۔

اس صورت کے بارے میں حضرت تھانویؒ بھی یوں فرماتے ہیں:

"قواعد کی رو سے تاجرانہ قیمت کا تو اعتبار نہیں، کیوں کہ وہ مبنی ہے تخفیف ورعایت ومصالح خاصہ پر، بلکہ متفرق خریدار جس قیمت سے لیتے ہیں، وہ معتبر ہے اور اس میں اگر اختلاف ہو تو اکثر کا اعتبار ہے اور وہ قریب قریب متعین ہوتی ہے، یعنی وہ قیمت کہ اگر کوئی تخفیف کی درخواست نہ کرے تو اس قیمت پر فروخت کی جائے۔(٣)

(١)الفتاوى التاتارخانية،كتاب الزكوة،الفصل الثالث في بيان زكوة عروض التجارة:٢/١٨٣

(٢)الهداية،كتاب الزكوة،فصل في العروض:١/٢١٢

(٣)امداد الفتاوى،كتاب الزكوة والصدقات:٢/٤٢

قرض کی قسط وار وصولی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(304):

میں دس لاکھ روپے کی ایک گاڑی ادھار کی وجہ سے بارہ لاکھ روپیہ میں فروخت کر چکا ہوں، ماہانہ پانچ ہزار روپے کی قسط ملتی ہے، یوں سال میں مجھے ساٹھ ہزار روپے اس گاڑی کے ملیں گے۔ممکن ہے تمام رقم چند سالوں میں وصول ہو، ایسی حالت میں زکوٰۃ کس حساب سے ادا کروں گا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق :

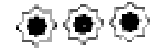
جس قرض کی وصولی کی امید ہو، اس میں زکوٰۃ واجب رہے گی، تاہم وصولی سے قبل ادائیگی واجب نہیں، ایسے مال کی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ دوسرے مملوکہ مقبوضہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس قرضہ کی زکوٰۃ بھی ہر سال ادا کرتا رہے، مثلاً: رمضان میں زکوٰۃ ادا کرتے وقت آپ کو نقد مال چالیس لاکھ روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے اور آپ کا قرضہ دس لاکھ ہے تو آپ پچاس لاکھ کی زکوٰۃ ادا کریں، ایسا ہی یہ بھی جائز ہے، جب مال وصول ہو تو گزشتہ تمام مدت کی زکوٰۃ اس سے یکشت ادا کردے، مثلاً ۱۴۲۰ھ میں آپ کو پانچ لاکھ روپے وصول ہوئے اور یہ قرضہ ۱۴۱۶ھ سے چلا آرہا ہے تو آپ ۱۴۲۰ھ میں پانچ لاکھ روپے وصول ہونے پر اس سے چار سال کی زکوٰۃ ادا کریں، اگر مقروض دیوالیہ ہو جائے اور قرضہ وصول نہ ہو سکے تو مالیت ختم ہونے کی بنا پر زکوٰۃ بھی ساقط ہو جائی گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولو كان الدين على مقرمليء،أو معسر،أو مفلس،أو على جاحد عليه بينة ،أو علم به قاض، فوصل إلى ملكه لزم زكوٰة مامضى. (١)

ترجمہ:

اگر قرض کسی ایسے شخص پر ہو جو مالدار اقرار کر رہا ہو یا غریب ہو یا منکر ہو، لیکن اس پر گواہ ہوں یا قاضی کو پتہ ہو، پھر یہ مال اس کو وصول ہوا تو گزشتہ مدت کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔



(١) الدرالمختار على صدرردالمحتار، كتاب الزكوة:٣/١٨٤،١٨٥

مقروض صاحبِ نصاب کی زکوٰۃ

سوال نمبر(305):

اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب ہونے کے ساتھ ساتھ دو تین آدمیوں کا مقروض ہو اور اس کے ذمے یہ قرض ادا کرنا کسی بھی وقت ضروری ہو تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ کار کیا ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اگر کوئی صاحبِ نصاب شخص مقروض ہو اور دائن کی طرف سے قرضہ واپس کرنے کا مطالبہ ہو تو قرضہ کو پورے مال سے منہا کرنے کے بعد بقیہ مال سے زکوٰۃ دینا واجب ہوگا اور اگر قرضہ اتنا زیادہ ہو کہ پورے مال پر حاوی ہو تو ایسی حالت میں اس پر زکوٰۃ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من كان عليه دين يحيط بماله،فلازكوة عليه،وإن كان ماله أكثرمن دينه زكى الفاضل إذابلغ نصابا.(۱)

ترجمہ: اور جس شخص پر ایسا دین ہو کہ اس کے مال پر حاوی ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں اور اگر اس کا مال اس کے قرض سے زیادہ ہو تو وہ فاضل مال جب نصاب کو پہنچے تو اس سے زکوٰۃ دے گا۔

حوائجِ اصلیہ سے زائد رقم کی زکوٰۃ

سوال نمبر(306):

ایک شخص کے پاس نقد رقم موجود ہو جو ضروریات سے زائد ہو تو ایسی رقم میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور کس حساب سے اس رقم میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بیّنوا توجروا

(۱) الهداية،كتاب الزكوة:۱/۲۰۲

الجواب وباللہ التوفیق :

اخراجاتِ ضروریہ میں صرف ہونے اور قرض منہا کرنے کے بعد جو رقم موجود ہو، جو نصاب تک پہنچتی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔ چونکہ سونے اور چاندی کی قیمت بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے، اس لیے روپوں کے حساب سے اس میں کوئی مقدار مقرر کرنا مشکل ہے، لہٰذا حوائجِ اصلیہ اور قرضہ کے علاوہ اگر رقم ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر یا زیادہ ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(وسببه)أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد)فارغ (عن حاجته الأصلية)لأن المشغول بها كالعدم .(۱)

ترجمہ:

اور فرضیتِ زکوٰۃ کا سبب ایسے نصاب کا مالک ہونا ہے جس پر سال گزر جائے، مال نامی ہو اور ایسے قرض سے فارغ ہو جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہو، کیوں کہ اس میں مشغول ہونا معدوم کے برابر ہے۔



سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(307):

ایک شخص صاحبِ نصاب ہے اور وہ سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے۔ تو کیا اس طرح پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے سے ذمہ فارغ ہو جائے گا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق :

صاحبِ نصاب ہو جانے سے زکوٰۃ کا نفسِ وجوب آ جاتا ہے جبکہ سال گزرنے کے بعد وجوبِ ادا، یعنی زکوٰۃ کو ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، مطلب: في أحكام المعتوه: ۳/۱۷۴-۱۷۸

لہٰذا اگر کوئی شخص سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو ادا کرسکتا ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ کی رقم موجودہ مال کے موافق دی ہے یا نہیں، تاکہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی واقع نہ ہو۔

والدلیل علیٰ ذلک:

(ولو عجل ذو نصاب)زكوته (لسنين أولنصب صح)لوجود السبب (قوله لوجود السبب)أي سبب الوجوب، وهوملك النصاب النامي، فيجوزالتعجيل لسنة أوأكثر.(۱)

ترجمہ:

اور نصاب والا اپنی چند سالوں کی یا کسی حصے کی زکوٰۃ پہلے دے دے تو یہ درست ہے، کیوں کہ سبب پایا جارہا ہے، یعنی وجوب زکوٰۃ کا سبب موجود ہے اور وہ بڑھنے والے مال کے نصاب کا مالک ہوتا ہے، لہٰذا ایک سال یا اکثر کی زکوٰۃ پہلے دینا جائز ہے۔

❁❁❁

حج کے لیے داخل شدہ رقم کی زکوٰۃ

سوال نمبر(308):

ایک شخص ہر سال ذی الحجہ کے مہینے میں زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اس سال حج کے لیے داخلہ کیا ہے۔ حج کی روانگی شوال میں متوقع ہے تو جس رقم کو کرایہ کے لیے جمع کیا ہے، کیا اس میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو مال سال کے درمیان خرچ ہو جائے، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن باقی بچ جانے والی رقم اگر مقدار نصاب تک پہنچتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

صورتِ مسؤلہ میں حج داخلہ کی جو رقم گورنمنٹ یا کسی پرائیوٹ کمپنی کو دی ہے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ وہ رقم خرچ ہو چکی ہے۔ اگر کچھ رقم واپس ملے تو پہلے سے نصاب کے برابر اگر مال موجود ہو تو اس میں جمع ہو جائے گی۔

---

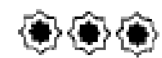
(۱)الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ ،باب زکوۃ الغنم :۳/ ۲۲۰۔۲۲۱

اور پورے مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

إذاأمسكه لينفق منه كل مايحتاجه، فحال الحول، وقدبقي معه منه نصاب، فإنه يزكي ذلك الباقي، وإن كان قصده الإنفاق منه أيضافي المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول. (١)

ترجمہ: جب کوئی اپنے حاجات میں خرچ کے لیے مال روکے اوراس پر سال گزر جائے، جبکہ نصاب کے بقدر مال رہ جائے توباقی کی زکوٰۃ دے گا اگرچہ مستقبل میں اسے خرچ کرنے کا ارادہ بھی ہو، کیونکہ سال گزرنے تک حوائج اصلیہ میں خرچ کا استحقاق نہیں رہا۔



مقدارِ نصاب سے قرض منہا کرنا

سوال نمبر(309):

ایک شخص بہت زیادہ مقروض ہے اوراس کے پاس موجودہ رقم مقدارِ نصاب کو پہنچتی ہے، لیکن اگر قرضہ اس مذکورہ مال سے نکالا جائے تو پھر اس کا مال نصاب تک نہیں پہنچتا۔ کیا ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کسی شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ مقدارِ نصاب تک پہنچتا ہو، لیکن اس پر اتنا قرضہ ہو کہ اگر قرضہ اس مال سے نکالا جائے تو باقی مال نصاب سے کم رہ جائے گا تو ایسے شخص پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں، تاہم اگر قرضہ نکالا جائے اور بقیہ مال نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو پھر اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وإن كان ماله أكثر من دينه زكي الفاضل إذابلغ نصابا. (٢)

---

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة،مطلب في ثمن المبيع وفاء:٣/١٧٩

(٢) الهداية، كتاب الزكوة:١/٢٠٢

ترجمہ: اگر اس کا مال قرض سے زیادہ ہو تو قرض سے زیادہ مال جب نصاب تک پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

❀❀❀

سود کے ساتھ مخلوط شدہ مال میں زکوٰۃ

سوال نمبر(310):

اگر کسی شخص نے بینک میں رقم رکھی ہو اور سال گزرنے کے ساتھ اس کی ساری رقم سود کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کس طرح ہوگی۔ کیا اصل رقم سے زکوٰۃ ادا کرے یا سود والی رقم سے بھی زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

حلال مال کی آمدنی پر زکوٰۃ کی ادائیگی میں تو کوئی شک نہیں، لیکن جہاں تک حرام آمدنی کا تعلق ہے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس مال کا مالک معلوم ہو تو اس کو واپس کر کے اپنا ذمہ فارغ کر دینا چاہیے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دینا چاہیے، تاکہ حرام مال سے چھٹکارا حاصل ہو جائے، لیکن اگر کوئی شخص حرام اور حلال مال دونوں سے مجموعی طور پر زکوٰۃ دینا چاہیے تو دے سکتا ہے، اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولذا قالوا: لو أن سلطاناً غصب مالاً، و خلطه صار ملكاً له، حتى وجبت عليه الزكوة، وورث عنه على قول أبي حنيفة ؛لأن خلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهلاك، أما على قولهما فلا. (١)

ترجمہ: اور اس لیے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر سلطان نے مال غصب کر کے اپنے مال کے ساتھ ملایا تو امام صاحب کے قول کے مطابق یہ مال اس کے ملک کا حصہ بن گیا۔ چنانچہ اس پر زکوٰۃ واجب رہے گی اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی، کیوں کہ امام صاحبؒ کے نزدیک اپنے دراہم کو دوسرے شخص کے دراہم سے مخلوط کرنا استہلاک ہے، البتہ صاحبین کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

(١) البحر الرائق، کتاب الزکوٰۃ، تحت قوله: ملك نصاب حولي: ٢/ ٣٥٩

ڈیری فارم کی بھینسوں میں زکوٰۃ

سوال نمبر(311):

ایک گھرنے تقریباً پچاس سے زائد بھینسیں دودھ فروخت کرنے کے لیے پال رکھی ہیں اوران کے چارہ وغیرہ کابندوبست اپنے ذاتی خرچہ سے پوراکرتا ہے توکیا ایسے جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو جانور گھر میں پالے جاتے ہوں اور مالک ان کے چارے وغیرہ کا خرچہ خود برداشت کرتا ہو یا آدھے سال سے کم چرنے والے باہر چراگاہ میں مفت چارہ کھاتے ہوں تو ایسے جانوروں میں زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں، البتہ اگر فروخت شدہ دودھ کی رقم نصاب تک پہنچ جائے اوراس پر سال بھی گزرجائے تو پھر ایسی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولیس في العوامل، والحوامل، والعلوفة صدقة)...........ثم السائمة هي التي تكتفي بالرعي في أكثر الحول ،حتی لو أعلفها نصف الحول،أو أكثر كانت علوفة،لأن القليل تابع للأكثر.(۱)

ترجمہ: کام کرنے والی، بوجھ اُٹھانے والی اور چارہ کھانے والی اونٹنیوں میں زکوٰۃ نہیں، پھر چرنے والی اونٹنی وہ ہے، جو اکثر سال چرنے پر اکتفا کرتی ہو، چنانچہ اگر ان کو آدھا سال یا زیادہ چارہ دیا جائے تو وہ علوفہ بن جائے گی، اس لیے کہ کم مدت اکثر کی تابع ہوتی ہے۔

❁❁❁

تجارتی جانور میں زکوٰۃ

سوال نمبر(312):

اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے جانور خریدا اوراس کو گھر میں ذاتی اخراجات سے چارہ وغیرہ دیتا رہا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بینوا توجروا

(۱)الهداية، كتاب الزكوة،فصل في الخيل:۱/۲۰۸

الجواب وباللّٰہ التوفیق :

جو چیز تجارت کی غرض سے لی جائے اور اس کی قیمت مقدار نصاب تک پہنچتی ہو تو سال گزرنے پر اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں اگر جانور تجارت کی غرض سے خریدا ہوا اور اس کی خوراک کا بندوبست گھر کے ذاتی اخراجات سے ہو یا باہر چراگاہ میں چرتا ہو، بہر صورت سامانِ تجارت میں داخل ہو کر سال گزرنے کے بعد اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ اس کی قیمت زکوٰۃ کی مقدار نصاب تک پہنچتی ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله: (ولا في العلوفة ،والعوامل)..........والمراد بنفي الزكوة عن العلوفة زكوٰة السائمة لأنها لو كانت للتجارة وجبت فيهازكوة التجارة.(١)

ترجمہ:

گھر میں چارہ کھانے والے اور کام کرنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں۔۔۔۔اور علوفہ سے زکوٰۃ کی نفی سے مراد سائمہ کی زکوٰۃ ہے، کیونکہ اگر یہ تجارت کے لیے ہو تو اس میں تجارت کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

❁❁❁

اکثر سال سے کم چرنے والے جانوروں کی زکوٰۃ

سوال نمبر(313):

ایک شخص کے پاس تقریباً ایک سو پچاس (150) بھیڑ بکریاں ہیں، جو نصف سال یا اس سے بھی کم چراگاہوں میں چرتی ہیں اور سال کے بقیہ حصے میں وہ شخص اپنے ذاتی اخراجات سے گھر میں چارہ وغیرہ مہیا کرتا ہے۔ تو کیا اس طرح کے جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جن جانوروں میں زکوٰۃ دینا واجب ہے، ان کا سائمہ ہونا ضروری ہے اور چارہ کھلانے میں مالک کے ذاتی

(١)البحر الرائق، كتاب الزكوٰة، فصل في الغنم:٢/٣٨١

اخراجات کا کوئی کردار نہ ہو، کیونکہ جانوروں میں زکوٰۃ دینے کے لیے فقہاے کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ یہ سال بھر کے اکثر حصہ میں چراہ گاہ سے مفت چارہ وغیرہ کھاتے ہوں۔

لہٰذا محررہ حالات کی روشنی میں اگر سال کے اکثر حصہ میں ذاتی اخراجات سے کفالت کا انتظام ہو تو ایسے جانوروں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن اگر سال کے اکثر حصہ میں چراہ گاہ سے چارہ وغیرہ کھاتے ہوں یا تجارت کے لیے ہوں تو پھر زکوٰۃ دینی واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

باب السائمة (هی) الراعية، وشرعاً (المتكفية بالرعي) المباح ذكره الشمني (في أكثر العام لقصد الدر، والنسل) ذكره الزيلعي، وزاد في المحيط (والزيادة و السمن) ليعم الذكور فقط، لكن في البدائع: لو أسامها للحم، فلا زكوة فيها...... (فلو علفها نصفه لا تكون سائمة) فلا زكوة فيها للشك في الموجب. (۱)

ترجمہ:

سائمہ وہ چرنے والے جانور ہیں اور شرعاً یہ اس جانور کو کہتے ہیں جو سال کے اکثر حصے میں چرنے پر اکتفا کرتے ہوں دودھ اور تناسل کے لیے (پالے جاتے ہیں) زیلعی نے اس کو ذکر کیا ہے اور محیط میں اس بات کا اضافہ ہے کہ زیادہ فربہ کرنے کے لیے ہے، یہ صرف مذکر جانور کو شامل ہو، لیکن بدائع میں ہے اگر گوشت زیادہ کرنے کے لیے جانور کو کوئی چرائے تو اس پر زکوٰۃ نہیں۔۔۔۔ پس اگر نصف سال چرائے تو یہ سائمہ نہیں کہلائیں گے اور اس میں زکوٰۃ بھی نہیں، کیونکہ موجب یعنی سبب میں شک آ گیا۔

❁❁❁

بغیر اجازت کے کسی کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر (314):

ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے زکوٰۃ نکال کر فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دی۔ کیا اس سے دوسرے بھائی کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

بینوا توجروا

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ، باب السائمة: ۱۹۶/۳۔۱۹۸

الجواب وباللّٰہ التوفیق :

اگر کوئی شخص دوسرے شخص کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ ادا کرے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی شریعتِ مطہرہ میں چونکہ بھائیوں کی ملک الگ الگ متصور ہوتی ہے، اس لیے ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا حق حاصل نہیں۔ اگر ایک بھائی دوسرے بھائی کے مال سے زکوٰۃ ادا کرے اور اس کے بعد دوسرا بھائی اجازت دے دے اور یہ مال فقیر کے پاس موجود ہو اور ابھی تک اس نے خرچ نہ کیا ہو تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، ورنہ دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

رجل أدى زكوة غيره عن مال ذلك الغير، فأجازه المالك، فإن كان المال قائما في يد الفقير جاز، وإلا فلا.(١)

ترجمہ:

کسی آدمی نے دوسرے کے مال سے اس کی زکوٰۃ ادا کی اور مالک نے اجازت دے دی، پس اگر وہ مال فقیر کے پاس موجود ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

❁❁❁

زکوٰۃ کی رقم میں زکوٰۃ کا وجوب

سوال نمبر(315):

ایک شخص نے زکوٰۃ کی رقم الگ رکھی ہے، وقفہ وقفہ سے جب مستحقین ملتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کی رقم دے دیتا ہے، ایسی صورت میں اگر اس رقم پر سال گزر جائے تو کیا مالک پر اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق :

زکوٰۃ واجب الادا ہونے کے بعد مالک کا ذمہ اس وقت فارغ ہوگا، جب زکوٰۃ ادا کر دے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کسی شخص کے واجب الادا قرض کی ادائیگی کی طرح ضروری ہوتی ہے، گویا زکوٰۃ کی مد میں واجب الادا رقم مالک کی

(١) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها: ١٧١/١

ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ کسی دوسرے کی ملکیت اس کے پاس پڑی رہتی ہے، اس لیے زکوٰۃ کی جو رقم واجب ہوا اور ادائیگی میں تاخیر ہو تو آئندہ سال اس زکوٰۃ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اگرچہ زکوٰۃ کی رقم دوسرے مال سے خلط ہو، مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس چالیس ہزار روپیہ پر سال گزرا، ایک ہزار روپے بطور زکوٰۃ واجب ہوئے، لیکن کسی اختیاری یا غیر اختیاری وجہ سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں ایک سال تک تاخیر ہو جائے تو دوسرے سال انتالیس ہزار روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، کیوں کہ ایک ہزار روپے اس کے نہیں رہے، بلکہ وہ زکوٰۃ کے مستحق کو بہر صورت ادا کرنا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فلو كان له نصاب حال عليه حولان،ولم يزكه فيهما لازكوة عليه في الحول الثاني. (١)

ترجمہ:

ایک شخص کے پاس نصاب کی مقدار کے برابر مال ہو، دو سال بغیر زکوٰۃ کے گزر گیے تو دوسرے سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (کیونکہ زکوٰۃ کی رقم کی ادائیگی کے وجوب سے دوسرے سال نصاب ناقص رہا)۔

❀❀❀

صدقہ دینے کے بعد اس میں زکوٰۃ کی نیت کرنا

سوال نمبر(316):

ایک شخص نے غربا و فقرا میں صدقہ اور خیرات کی غرض سے رقم تقسیم کی، لیکن بعد میں اس نے زکوٰۃ کی نیت کی، تو کیا صدقہ اور خیرات کی نیت سے دی جانے والی رقم میں زکوٰۃ کی نیت کی جا سکتی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ کی صحتِ ادائیگی کے لیے نیت کا متصل ہونا ایک اہم شرط ہے، خواہ یہ اتصالِ نیت حکماً کیوں نہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں اگر صدقہ و خیرات کی نیت سے رقم تقسیم کی ہو تو اس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، لیکن اگر یہ رقم ابھی تک فقیر کی ملک میں موجود ہو اور اسی دوران اس نے زکوٰۃ کی نیت کر لی تو پھر یہ رقم زکوٰۃ میں شمار ہو کر ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

---

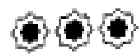
(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة،مطلب الفرق بين السبب والعلة،والشرط:٣/١٧٦

والدلیل علیٰ ذلک:

(وشرط صحة أدائها نية مقارنة له)أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكماً) كما لو دفع بلانية، ثم نوى ،والمال قائم في يدالفقير. (١)

ترجمہ:

اور ادائیگی زکوٰۃ کے صحیح ہونے کے لیے اس کے ساتھ نیت کرنا ضروری ہے، اگر چہ نیت حکماً پیوست ہو مثلاً بغیر نیتِ زکوٰۃ کسی فقیر کو رقم دی، پھر ایسی حالت میں نیت کرے کہ فقیر کے پاس مال موجود ہو۔



کرنسی نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال نمبر (317):

عمران اور عرفان دونوں عالمِ دین ہیں، عرفان کا کہنا ہے کہ کرنسی نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی فی الفور نہیں ہوگی، بلکہ یہ حوالہ کے حکم میں ہے، جب تک فقیر اس کے ذریعہ کوئی چیز خرید نہ لے، اس وقت تک زکوٰۃ کی ادائیگی موقوف رہے گی، لہٰذا اگر فقیر سے یہ نوٹ ضائع ہوا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اس کے خلاف عمران کا بیان یہ ہے کہ چونکہ آج کل یہ نوٹ ثمنِ عرفی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لہٰذا زکوٰۃ میں اس کی ادائیگی کی بنا پر زکوٰۃ فی الفور ادا ہوگی، اس کے خرچ کرنے پر موقوف نہیں، براہ کرم واضح فرمائیں کہ ان دونوں حضرات میں کس کا بیان صحیح ہے، تاکہ اس کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کو ممکن بنایا جا سکے۔

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت ابتدا میں محض سند اور وثیقہ کی تھی اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نوٹ کے عوض حکومت کے خزانہ میں اتنی مقدار میں چاندی یا سونا محفوظ ہے، جس کی ادائیگی حکومت کی ذمہ داری ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ یہ رشتہ کمزور ہوتا گیا، اب صورتحال یہ ہے کہ ان نوٹوں کا متبادل (سونا یا چاندی) حکومت کے خزانہ میں محفوظ نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومت اس کی ذمہ داری قبول کرتی ہے، اگر چہ ہر نوٹ پر ایسی عبارت لکھی ہوتی ہے

(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۳/۱۸۷

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس کے تبادل کا ذمہ دار ہے۔

دوسری طرف ان نوٹوں کا اتنا رواج ہوگیا ہے کہ ان کو عرف میں ثمن کی حیثیت حاصل ہوگئی، قرض کا لین دین، ادائیگی اور وصولیابی عین نوٹوں ہی سے کی جاتی ہے، خرید وفروخت، وقف، وصیت سارے احکام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ نوٹ ہی اصل ثمن ہیں، کسی سند یا وثیقہ کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا ابتداءً اگرچہ اس کی حیثیت سند اور حوالہ کی تھی، لیکن اب اس کی حیثیت مروجہ سکوں کی ہے۔ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ بظاہر نوٹ کی اپنی قدر و قیمت سامان کے برابر نہیں، کیونکہ نوٹ کے کاغذ کی تو کوئی خاص قیمت نہیں، لیکن ثمن ہونے کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ لوگوں کی اصطلاح میں عرف ورواج کی وجہ سے کوئی مال ثمن کی حیثیت اختیار کرے تو وہ ثمن کے حکم میں ہوتا ہے، چنانچہ موجودہ دور میں چونکہ کاغذی نوٹوں کو ثمن کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے اس کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وثمن بالاصطلاح ،وهو سلعة في الأصل كالفلوس ،فإن كانت رائجة، فهي ثمن، وإلافسلعة.(١)

ترجمہ:

اورثمنِ اصطلاحی وہ ہے جو اصل میں سامان ہو جیسے فلوس، اگر یہ رائج ہو تو ثمن ہے، ورنہ سامان متصور ہوگا۔

❁❁❁

گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں قیمت کے معیار کا تعیین

سوال نمبر(318):

ایک شخص سے چند سال زکوٰۃ کی ادائیگی رہ گئی ہو۔ تو کیا اب گزرے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے یا نہیں؟ اگر لازمی ہے تو سونے کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت گذشتہ سالوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا یا ادائیگی کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی اور شوہر کا اپنے مال کی زکوٰۃ بیوی کو دینے کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

(١)البحرالرائق،کتاب الصرف،تحت قوله(ومن أعطیٰ صیرفیادرهماً):٦/٣٤٠

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ میں نماز کے بعد سب سے زیادہ اہمیت زکوٰۃ کو حاصل ہے۔زکوٰۃ ادانہ کرنے والوں پر قرآن و حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔اگر کہیں غفلت کی وجہ سے کسی شخص سے چند سال زکوٰۃ کی ادائیگی رہ جائے تو بعد میں بھی اس کی ادائیگی واجب ہوا کرتی ہے۔اگر کہیں آخروقت تک ادانہ کر سکے تو بعدالوفات ترکہ میں سے ادا کرنے کی وصیت کرنا بھی ضروری ہے۔اور پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

اورزکوٰۃ کی ادائیگی میں قاعدہ وقانون یہ ہے کہ مزکی اپنے اصول وفروع کواور زوجین کا ایک دوسرے کوزکوٰۃ دیناجائزنہیں۔اس سے زکوٰۃ ادانہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولاإلی إمرأته للاشتراك في المنافع عادة،ولاتدفع المرأةإلی زوجهاعندأبي حنیفةؒ لماذکرنا.(۱)

ترجمہ:

ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ خاونداپنی بیوی کواورنہ بیوی اپنے شوہر کوزکوٰۃ دے،کیونکہ عادتاً منافع مشترک ہوتے ہیں۔

تعتبر القیمة یوم الوجوب،وقالا یوم الأداء.قال ابن عابدین:وفي المحیط:یعتبر یوم الأداء بالإجماع وهوالأصح.(۲)

ترجمہ:

(امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ)زکوٰۃ واجب ہونے والے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگااور صاحبینؒ کے نزدیک زکوٰۃ ادا کرنے والے دن کی قیمت معتبر ہوگی۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:محیط نامی کتاب میں ہے کہ بالاجماع ادائیگی کے دن کی قیمت معتبر ہوگی۔



(۱)الهدایة،باب من یجوز دفع الصدقات إلیه ومن لایجوز:۱/۲۲۳

(۲)الدرالمختارعلی صدرردالمحتار،کتاب الزکوٰۃ،باب زکوٰۃ الغنم:۳/۲۱۱

گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال نمبر(319):

کسی شخص کے پاس دس ہزار روپے نقد اور پانچ تولے زیور ہو اور اس پر تین سال گزر چکے ہوں جبکہ اس نے تاحال ان گزرے ہوئے تین سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہو، تو اب اس میں سے کتنی مقدار میں زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

دینِ اسلام کے جملہ احکام کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن نماز اور زکوٰۃ انتہائی اہمیت کے حامل احکامات ہیں، جن سے مسلمان خوب واقف ہیں، چنانچہ قرآنِ مجید میں ﴿واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ﴾ سے بار بار یہی تنبیہ دی جاتی ہے، لہٰذا مقررہ وقت پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ وقت گزرنے یا وقت پر ادا نہ کرنے کے باوجود بھی اُس کی ادائیگی ضرور ہوتی ہے اور بدونِ ادائیگی کے بدستور ذمہ پر لازم رہتے ہیں۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق جب پچھلے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوئی تو چاہیے کہ مالک اپنی مالیات (سونے، چاندی اور نقدی وغیرہ) کا حساب کرے، اگر نصاب پورا ہو جاتا ہو تو جلد از جلد اس کی ادائیگی کرے۔

لہٰذا اگر دس ہزار روپے ساڑھے سترہ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، جس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ پانچ تولہ سونا کی قیمت معلوم کر کے دس ہزار روپے اُس کے ساتھ جمع کیے جائیں پھر اُس میں سے ڈھائی فیصد کے حساب سے پہلے سال کی زکوٰۃ ادا کریں اور زکوٰۃ کی ادا شدہ رقم کل مالیت سے منفی کر کے اُس سے ڈھائی فیصد کے حساب سے دوسرے سال اور پھر اسی طرح زکوٰۃ کی رقم منفی کر کے تیسرے سال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہ بھی یاد رہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت سونے کی جو موجودہ قیمت ہو اُس کا اعتبار کیا جائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

و تعتبر القیمة یوم الوجوب و قالا یوم الاداء قال ابن عابدین: وفي المحیط: یعتبر یوم الأداء بالاجماع وھو الأصح.(۱)

ترجمہ: (امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ) زکوٰۃ واجب ہونے والے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الغنم: ۲۱۱/۳

زکوٰۃ ادا کرنے والے دن کی قیمت معتبر ہوگی۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:محیط نامی کتاب میں ہے کہ بالاجماع ادائیگی کے دن کی قیمت معتبر ہوگی۔

❁❁❁

مدارس میں تملیک کا مروجہ طریقہ

سوال نمبر(320):

اگر مدرسہ میں زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ ادا کرنے کے لیے بالغ طلبا سے ایک توکیل نامے پر زکوٰۃ،صدقات کو مدرسے کے اخراجات میں استعمال کرنے کے لیے دستخط لیے جاتے ہوں تو کیا اس طریقے سے زکوٰۃ،صدقات ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ وغیرہ ادا ہو جائے گی اور کیا اس رقم کو مدرسے کی ضروری اخراجات مثلاً اساتذہ کی تنخواہ،بجلی،گیس وغیرہ کے بلوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی تحریر پر دستخط کنندہ،اس تحریر کی توثیق کرنے والا ہوتا ہے،لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ دستخط کرنے والے میں اتنی صلاحیت،عقل وشعور ہو کہ وہ جانتا ہو کہ وہ کس چیز کی توثیق کر رہا ہے۔نیز اس سلسلہ میں اس کے اوپر کسی قسم کا دباؤ یا جبر نہ ہو۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں یہ حیلہ قانونِ شرعی کے تحت تو آجاتا ہے۔ایسی صورت میں مہتمم،ناظمِ مالیات یا ادارہ کا کوئی بھی ملازم طلبہ کا وکیل متصور ہوگا،لیکن بسا اوقات غفلت کی وجہ سے اس میں تملیک کی حقیقت سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور کارکردگی صرف کاغذی کاروائی تک ہی محدود رہتی ہے۔ جہاں فراغتِ ذمہ مشکل ہے،تاہم وکالت کے تقاضے پورے ہوں تو پھر جائز ہے،لہٰذا اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ مہتمم چندہ دہندگان کا وکیل ہو اور زکوٰۃ کا مال مستحق طلبا میں تقسیم کر کے دے دیا جائے۔پھر ان سے مذکورہ اخراجات کی مد میں بطور فیس اتنی رقم کی وصولی یقینی بنائی جائے،تاکہ ادائیگی زکوٰۃ بھی ہو اور مدرسہ کے مذکورہ مدات میں اس رقم کو خرچ کرنا بھی درست ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ويشترط أن يكون الصرف (تمليكاً) لا إباحة.(۱)

(۱)الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ،باب المصرف:۳/۲۹۱

ترجمہ: (کسی فقیر) کو دینے میں شرط یہ ہے کہ بطورِ تملیک ہو نہ کہ اباحت کے طور پر۔

❁❁❁

زکوٰۃ میں بچے کی تملیک کی حیثیت

سوال نمبر (321):

ایک شخص کسی فیکٹری میں ملازمت کر رہا ہو ماہانہ دس ہزار روپے تنخواہ کے علاوہ رہائش، علاج جیسی تمام سہولیات اس کو مفت میسر ہوں اس کی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی مطلقہ عورت سے دوسری شادی کر لے، جس کے ہاں ایک بچی ہو، جس کی کفالت کا ذمہ اس شخص نے لیا ہو۔ اب اربابِ فیکٹری اس بچی کی تعلیم وعلاج کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے کچھ رقم جاری کرنا چاہیں تو کیا بچی مذکورہ شخص کی کفالت میں ہونے کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہے؟ اور زکوٰۃ کی رقم اس کی تعلیم وعلاج پر خرچ کرنا جائز ہے؟ جبکہ اس کا کفیل خود صاحب حیثیت شخصیت ہو۔

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ ایسا نابالغ بچہ جو صرف کسی کی کفالت میں ہو، اس سے کوئی نسبی رشتہ نہ ہو تو وہ کفیل کی غنا سے غنی متصور نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ صورت کے مطابق جو بچہ کسی کی کفالت میں ہو اس کو زکوٰۃ کے فنڈ سے تعلیم دلوانا اور علاج کروانا درست رہے گا۔ البتہ زکوٰۃ کی صحتِ ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے، یعنی یہ ضروری ہے کہ فیکٹری والے زکوٰۃ یا تو بچی کے کفیل کے قبضہ میں دیں، خواہ زکوٰۃ نقد کی صورت میں ہو یا کتابوں کی صورت میں ہو یا اگر بچی عاقلہ ہو تو زکوٰۃ کی صحت کے لیے خود اس کا قبضہ بھی کافی ہے۔ واضح رہے کہ صحتِ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے بچی کا صرف اتنا عاقلہ ہونا بھی کافی ہے کہ وہ قبضہ کیے ہوئے مال کی افادیت سے باخبر ہو، نہ اسے پھینکنے پر آمادہ ہو اور نہ اس کی افادیت سے بے خبر ہو کر ضائع کرتی ہو۔ جس ادارے میں بچہ زیرِ تعلیم ہو زکوٰۃ کے فنڈ سے اس کی فیس ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ ہاں اگر بچے کا ولی یا کفیل ادارے کو اپنی طرف سے زکوٰۃ قبضہ کرنے کا وکیل بنا دے تو اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(هي تمليك المال من فقير مسلم……)وقيدبالتمليك احترازاً عن الإباحة ،و لهذا ذكر الولوالجي

وغیره، أنه لو عال يتيماً فجعل يكسوه ويطعمه وجعله من زكاة ماله فالكسوة تجوز لوجود ركنه وهو التمليك وأما الإطعام إن دفع الطعام إليه بيده يجوز أيضاً لهذه العلة، وإن كان لم يدفع إليه، و يأكل اليتيم لم يجز لانعدام الركن، وهو التمليك...... ولم يشترط البلوغ والعقل؛ لأنهما ليس بشرط؛ لأن تمليك الصبي صحيح لكن إن لم يكن عاقلاً ،فإنه يقبض عنه وصيه،أو أبوه،أو من يعوله قريباً أو أجنبياً، وإن كان عاقلاً فقبض من ذكر و كذا قبضه بنفسه ،والمراد أن يعقل القبض، بأن لا يرمي به، ولا يخدع عنه.(۱)

ترجمہ: یہ مسلمان فقیر سے مال کی تملیک کرانا ہے۔تملیک کی قید لگا کر اباحت سے احتراز کیا۔اسی وجہ سے ولوالجی نے ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی یتیم کی پرورش کرتا ہو، اُسے کپڑے پہناتا اور کھانا کھلاتا ہو اور اِسے اپنے مال کی زکوٰۃ شمار کرتا ہو، تو کپڑے پہنانا زکوٰۃ میں شمار کرنا جائز ہے کیونکہ زکوٰۃ کا رکن 'تملیک' موجود ہے۔ اور کھانا کھلانے کا حکم یہ ہے کہ اگر کھانا اپنے ہاتھ سے اُسے دیا تو یہ بھی جائز ہے،اسی علت تملیک کے پائے جانے کی وجہ سے۔اور اگر خود اسے نہیں دیا اور یتیم نے کھانا کھاتا ہو تو پھر رکن معدوم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔۔۔۔بلوغ اور عقل کی شرط نہیں لگائی، کیوں کہ یہ دونوں شرط نہیں، کیوں کہ بچے کی تملیک درست ہے،لیکن اگر وہ عاقل نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا وصی یا والد یا وہ شخص قبضہ کرے گا جو اس کی پرورش کرتا ہو خواہ وہ اس کا قریبی رشتہ دار ہو یا اجنبی ہو۔اور اگر عاقل ہو تو خود جو اشخاص مذکور ہوئے اُن کا قبضہ بھی درست ہے اور خود اس کا قبضہ بھی۔عقل سے مراد یہ ہے کہ قبضہ کرنے کی سمجھ رکھتا ہو،اس طور پر کہ وہ اس چیز کو پھینکے نہیں اور نہ اسے دھوکہ دیا جا سکے۔



حرام مال سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(322):

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس حرام کا مال ہے اور وہ مقدار نصاب کے برابر یا اس سے زائد ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

حرام مال کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر وہ کسی اور کی ملکیت ہو تو اسے واپس کیا جائے۔ جہاں کہیں مالک معلوم

(۱) البحر الرائق، کتاب الزکوٰۃ:۲/۳۵۲،۳۵۳

نہ ہو سکے تو بلا نیت ثواب خیرات کردیا جائے تاکہ حرام مال سے ذمہ فارغ ہو۔ حرام مال چونکہ سارا واجب التصدق ہوتا ہے اِس لیے اُس میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قولہ:(کمالو کان الکل خبیثاً) في القنیة:ولو کان الخبیث نصاباًلایلزمه الزکوۃ،لأن الکل واجب التصدق علیه،فلایفید إیجاب التصدق ببعضه.(۱)

ترجمہ:

جیسا کہ تمام مال حرام کا ہو، قنیہ میں ہے کہ اگر حرام مال نصاب کی مقدار کو پہنچے تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں، کیونکہ تمام مال کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ پس بعض مال کے تصدق کو واجب کرنا سود مند نہیں۔



مزدوری کی نیت سے خریدی گئی گاڑی میں زکوٰۃ

سوال نمبر(323):

اگر کسی نے گاڑی خریدتے وقت یہ ارادہ کیا کہ کرایہ پر دوں گا اور جب کبھی مہنگی فروخت کرنے کا موقع ملا تو فروخت کردوں گا۔ پھر دو سال مزدوری کے لیے استعمال کی تو کیا یہ گاڑی اموالِ تجارت میں شمار ہوگی؟ اور سال گزرنے کے بعد اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

وجوبِ زکوٰۃ کے لیے اشیا میں خریداری کے وقت ہی تجارت کی نیت ضروری ہے۔ جہاں کہیں تجارت کی نیت نہ ہو تو پھر ان کا شمار اموالِ تجارت میں نہیں ہوگا، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر واقعی خریداری کے وقت تجارت کی نیت نہ ہو تو گاڑی کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں، تاہم اس سے حاصل شدہ آمدنی اگر نصاب کو پہنچتی ہو تو سال گزر جانے کے بعد اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،باب زکوٰۃ الغنم:۳/۲۱۸

والدلیل علیٰ ذلک:

قال الشيخ ابن الهمام: فلو اشترى عبدامثلا للخدمة ناويأبيعه إن وجد ربحاًلازكوة فيه.(١)

ترجمہ: اگر کسی نے کوئی غلام خدمت کی نیت سے خریدا اور ساتھ میں یہ نیت بھی تھی کہ اگر زیادہ منافع ملا تو فروخت کر دوں گا تو اس میں زکوۃ لازم نہیں۔

❁❁❁

زکوۃ میں اشیاے خوراک دینا

سوال نمبر (324)

ایک آدمی پر زکوۃ فرض ہے، اب یہ شخص اپنی زکوۃ میں نقد رقم کی بجائے خوراک کی اشیا خرید کر بطور زکوۃ فقرا میں تقسیم کرے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کی بھی وضاحت کریں کہ زکوۃ میں تملیک شرط ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوۃ کی ادائیگی میں غربا و مساکین کی امداد کا راز مضمر ہے۔ زکوۃ میں کسی بھی چیز کے عطا کرنے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی، لیکن مصارف کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو چیز ان کے لیے سودمند ہو وہی چیز دینا زیادہ مناسب ہے۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں نقد رقم کی بجائے خوراک کی اشیا دینے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ واضح ہو کہ احناف کے نزدیک زکوۃ کی صحتِ ادائیگی کے لیے مستحق کا زکوۃ کو باقاعدہ قبضے میں لینا ضروری ہے۔ جن صورتوں میں تملیک نہ پائی جاتی ہو تو ان صورتوں میں زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

المال الذي تجب فيه الزكوة إن أدى زكاته من خلاف جنسه أدى قدر قيمة الواجب اجماعاً......ويجوز دفع القيم في الزكوة عندنا.(٢)

---

(١) فتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال، فصل في العروض: ٢/١٦٦

(٢) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، باب في زكوة الذهب والفضة والعروض: ١/١٨٠، ١٨١

ترجمہ:

وہ مال جس میں زکوٰۃ واجب ہوا گر اس مال کی زکوٰۃ دوسری جنس سے دے تو بالا جماع زکوٰۃ میں واجب شدہ چیز کی قیمت کی مقدار میں ادا کرے گا کا اعتبار ہوگا۔۔۔اور ہمارے ہاں زکوٰۃ میں قیمت دینا جائز ہے۔



گاڑیوں کی زکوٰۃ کا حکم

سوال نمبر(325):

زید کی کچھ رقم ٹرک اور بس میں بند ہے۔یہ گاڑیاں مزدوری کر کے کرایہ کی رقم اس کو ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زید گاڑیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار بھی کرتا ہے۔آیا آمدنی کی جن گاڑیوں میں اس کی رقم بند ہے،ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یانہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

جو گاڑیاں محنت مزدوری میں مصروف ہوں،ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں،البتہ ان کی سالانہ آمدنی جو زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت موجود ہو،دوسری آمدنی کے ساتھ ضم کی جائے گی۔اس کے برعکس جو گاڑیاں تجارتی مقاصد کے لیے ہوں اور تجارت کی نیت سے خرید کر اپنے پاس رکھی ہوں تو یہ گاڑیاں اموالِ تجارت میں شمار ہو کر ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب رہے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

وكذا الجواب في ابل المكارين وحمر المكارين.(۱)

ترجمہ:

اور ایسا ہی کرایہ والوں کے اونٹ اور گدھوں کی قیمت میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

❁❁❁

(۱) خلاصة الفتاوى ،كتاب الزكوة،فصل في الكتب والعروض:۱/ ۲٤۰

وجوبِ زکوٰۃ کے وقت نقد رقم کا موجود نہ ہونا

سوال نمبر(326):

اگر کسی شادی شدہ خاتون کے پاس نصاب کے برابر زیورات موجود ہوں اور شادی کے تین سال ہو چکے ہوں اور ابھی تک زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کر چکی ہو اور قربانی بھی، لیکن فی الحال اس کے پاس نقد رقم نہ ہو اور نہ اس کے خاوند کی کاروباری حالت ایسی بہتر ہو کہ اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر سکے۔ ایسی حالت میں جب نقد رقم موجود نہ ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سونا نصاب تک پہنچنے کی صورت میں اس سے 1/40 واں حصہ بطورِ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، تاہم شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ سونا پاس رکھ کر اس کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے، بلکہ فقہی تصریحات کی روشنی میں اس میں فقرا کی ضروریات اچھے طریقے سے پوری ہوتی ہیں، اس لیے ہمارے معاشرے میں عموماً زیورات کی قیمت لگا کر اس سے زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی کے پاس نقد رقم نہ ہو تو سونے کی مقررہ مقدار اپنے پاس رکھنا ضروری نہیں اور نہ اس میں کمی کرنے سے کوئی فرق پڑتا ہے، تاکہ یہ عذر سمجھ کر زکوٰۃ کے وجوب پر اثر انداز ہو سکے، لہٰذا ان زیورات سے 1/40 واں حصہ منہا کرکے فقرا کو دیا جائے گا یا پھر بازار میں فروخت کرکے اس کی قیمت فقرا میں تقسیم کر دی جائے گی۔ یہ بھی یاد رہے کہ زکوٰۃ جب بھی ادا ہو تو ادا متصور ہو گی، قضا نہیں۔

واضح رہے کہ صورتِ مسئولہ میں خاتون کے ذمہ واجب الاداز کوٰۃ کی ادائیگی کی ذمہ داری خاتون ہی پر پڑتی ہے، تاہم بیوی کے کہنے سے خاوند نائب بن کر زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس کی ذمہ داری نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویعتبر فیهما أن یکون المؤدی قدرالواجب وزناً ولا یعتبر فیه القیمة......ولو أدی من خلاف جنسه یعتبر القیمة بالإجماع.(۱)

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوة، باب فی زکوة الذهب والفضة والعروض: ۱۷۸/۱، ۱۷۹

ترجمہ:
سونے اور چاندی کی زکوٰۃ میں معتبر یہ ہے کہ جو (سونا یا چاندی) زکوٰۃ میں دی جائے، وہ وزن میں قدرِ واجب کے برابر ہو، اس کی قیمت کا اعتبار نہیں اور اگر (زکوٰۃ میں) دوسری جنس سے دے تو بالا جماع قیمت کا اعتبار ہوگا۔

❁❁❁

سونے کا نصاب ہونے کے باوجود مقروض پر وجوبِ زکوٰۃ

سوال نمبر (327):

ایک آدمی کے پاس تقریباً دس تولہ سونا ہے، جس کی قیمت کے برابر وہ قرض دار بھی ہے۔ کیا اسے مذکورہ مقدار سونے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آدمی پر اتنا قرضہ نہ ہو جو اس کے مال پر حاوی ہو۔ جہاں کہیں قرضہ کسی کے مال پر محیط ہو تو یہ قرض وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مانع رہے گا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص کے پاس دس تولے سونا، جس کی قیمت کے برابر اس پر قرضہ ہو تو ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، تاہم اگر اس کے علاوہ دیگر اموال اتنی مقدار میں ہوں کہ قرض کی ادائیگی کے بعد مال نصاب کے بقدر بچتا ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب رہے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها الفراغ عن الدين)قال أصحابنا: كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكوة،سواء كان الدين للعباد كالقرض.(١)

ترجمہ: زکوٰۃ واجب ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ مال قرض سے فارغ ہو۔ ہمارے علما حضرات فرماتے ہیں کہ جس قرض کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، وہ قرض زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مانع ہے۔

❁❁❁

(١)الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة:١/١٧٢

زکوٰۃ کی رقم میں وکیل کا ردوبدل کرنا

سوال نمبر(328):

ایک شخص دوسرے کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا وکیل بناتا ہے۔کیا وکیل وہ نوٹ تبدیل کرسکتا ہے کہ پچاس روپے کے دو نوٹ کی جگہ سو روپے کا نوٹ دے دے؟ یا جو نوٹ ملا ہو وہی نوٹ مساکین کو ادا کرنا ضروری ہے۔

بینوا توجروا

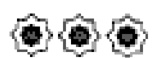
الجواب وباللہ التوفیق:

مالِ زکوٰۃ وکیل کے پاس امانت ہوتا ہے۔اس لیے مناسب نہیں کہ وکیل اس میں ایسا تصرف کرے،جس میں خیانت کا شائبہ پایا جائے اور جو تصرف ایسا ہو جس سے زکوٰۃ میں دی ہوئی چیز پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں تک نوٹ میں تبدیلی کا تعلق ہے تو بہتر یہ ہے کہ مؤکل کے دیے ہوئے نوٹ فقرا میں تقسیم کرے،لیکن ضرورت پڑتے وقت اگر نوٹ میں ردوبدل کرے تو یہ ردوبدل قابلِ مذمت نہیں،کیونکہ اس سے نوٹ کی حیثیت اور قیمت پر کوئی اثر بھی نہیں پڑتا اور نہ ہی عرف میں یہ تصرف خیانت سمجھا جاتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

قلت:أن الدراهم لاتتعين بالتعيين،فهي وإن كانت لاينتفع بهامع بقاء عينهالكن بدلها قائم مقامهالعدم تعينهافكأنها باقية.(۱)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ دراہم متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے،پس عینِ دراہم کی موجودگی میں اگرچہ ان سے نفع حاصل نہیں کیا جاسکتا،لیکن ان کا بدل ان کے متعین نہ ہونے کی وجہ سے قائم مقام ہے گویا کہ وہ اصل موجود ہے۔



بیوی کی زکوٰۃ کا ذمہ دار کون؟

سوال نمبر(329):

ایک شخص کی شادی کو دو برس ہوگئے ہیں۔اس نے بوقتِ شادی بیوی کو بیس تولہ سونا دیا تھا تو خاوند یا بیوی میں

(۱) المحتار علی الدرالمحتار،كتاب الوقف،مطلب في وقف الدراهم والدنانير:٦/٥٥٥

سے اب کس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عورت کو بوقتِ شادی سونا یا سونے کے زیورات اگر خاوند کی طرف سے بطورِ تحفہ یا مہر کے ملے ہوں تو ان کی وہ مالکہ ہے اور مجموعہ زیورات جب نصاب تک پہنچ جائیں تو عورت ان کی زکوٰۃ ادا کرے گی، لیکن اگر زیورات خاوند نے عورت کو عاریۃً (صرف پہننے کے لیے) دیے ہوں تو ان کا مالک خاوند ہے، بیوی نہیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی مالک پر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہو۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الزکوۃ واجبۃ علی الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصاباً ملكاً تاماً، وحال علیه الحول.(۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ ہر آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان پر واجب ہے، جب وہ ملکِ تام کے ساتھ نصاب کا مالک ہو اور اس پر سال گزر جائے۔

❁❁❁

پرائز بانڈ پر زکوٰۃ

سوال نمبر (330):

ایک شخص کے پاس تین چار سال پہلے سے بانڈز موجود ہیں۔ اس نے یہ پرائز بانڈز انعام کی غرض سے خریدے ہیں اور ان پر چار سال کا عرصہ بھی گزر چکا ہے۔ کیا پرائز بانڈ یا ان کی قیمت میں زکوٰۃ ہے اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بانڈ بذاتِ خود مال نہیں، یعنی ثمنِ عرفی نہیں، بلکہ قرض کی ایک شکل ہے، دراصل بانڈ اس مال کی ایک رسید اور

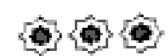
(۱) الهداية، كتاب الزكوة: ۱/ ۲۰۰

ثبوت ہے جو آپ کا حکومت یا پرائیویٹ ادارے کے پاس بطورِ قرض موجود ہے اور قرض کی تینوں صورتوں ضعیف، متوسط، قوی میں سے یہ متوسط کی تعریف (جو مال کے بدلے میں عائد ہوا ہو، مگر وہ مالِ تجارت یا نقد، سونا، چاندی نہ ہو بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو) میں داخل ہے، اس لیے اس پر دینِ متوسط کے احکام جاری ہوں گے۔ اور دینِ متوسط میں قبضہ سے قبل زکوٰۃ لازم نہیں۔ لیکن جب قرضہ نصاب یا اس سے زیادہ یکمشت وصول ہو تو اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بانڈز کی وصولی پر تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ لازم اور ضروری ہوگی، البتہ یہ بات ذہن نشین ہو کہ بانڈز کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولو كان الدين على مقر مليء أو) على (معسر، أو مفلس) أي محكوم بافلاسه (أو) على (جاحد عليه بينة..........فوصل إلى ملكه لزم زكوة مامضىٰ.(١)

ترجمہ: اگر اقرار کرنے والے پر دین ہو یا تنگ دست یا غریب ہو، یعنی تنگ دستی اور افلاس میں مبتلا ہو یا ایسے منکر شخص پر دین ہو جس کے خلاف گواہ موجود ہوں (تو یہ دینِ متوسط ہے)۔۔۔۔ جب مالک کے قبضہ میں رقم (بقدرِ نصاب) آجائے تو زکوٰۃ لازم ہوگی۔



یتیم کے مال میں زکوٰۃ

سوال نمبر(331):

یتیم بچے اگر نصاب کے مالک ہوں تو ان کے مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ زکوٰۃ دینے والا عاقل اور بالغ ہو۔ نابالغ بچہ غیر مکلف ہونے کی وجہ سے احکاما صحیح طور پر بجالانے کا تحمل نہیں کر سکتا، اس لیے صاحبِ نصاب ہوتے ہوئے بھی بچے کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ بچہ یتیم ہو یا غیر یتیم دونوں کا حکم یکساں ہے۔

(١) الدرالمختار على صدر ردالمحتار، كتاب الزكوة:٣/١٨٤،١٨٥

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بچے کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں، تاہم زمین کی پیداوار میں اس پر عشر واجب ہوگا، کیوں کہ عشر کی نسبت بچے کو نہیں، بلکہ زمین کو ہوتی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولیس علی الصبي والمجنون زکوة..........أنها عبادة فلا تتأدی إلا بالاختیار تحقیقاً لمعنی الابتلاء، ولا اختیار لهما لعدم العقل.(۱)

ترجمہ: اور نابالغ اور مجنون پر زکوٰۃ واجب نہیں ۔۔۔کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، پس یہ عبادت بغیر اختیار کے ادا نہ ہوگی، تاکہ ابتلا کا معنیٰ تحقق ہو اور عقل معدوم ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں اختیار کی اہلیت نہیں۔

ویجب مع الدین، و في أرض صغیر.(۲)

ترجمہ: عشر، قرضدار اور بچے کی زمین پر واجب ہوگا۔

❁❁❁

وکیلِ زکوۃ کا مؤکل کی رقم کی بجائے اپنی رقم سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(332):

کوئی شخص کسی دوسرے کو زکوٰۃ کی رقم دے کر کہہ دے کہ یہ اپنے پاس رکھ لو، جب کوئی مستحق زکوٰۃ ملے تو اسے دے دینا۔ وہ شخص اس رقم کو پہلے اپنے ذاتی کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ پھر اپنی رقم زکوٰۃ میں دیتا ہے۔ تو اس صورت میں مؤکل کی زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جو وکیل مقرر ہو، اس کو چاہیے کہ مؤکل کی دی ہوئی رقم کو محفوظ رکھ کر مستحقینِ زکوٰۃ میں تقسیم کرتا رہے۔ اگر رقم کی تبدیلی کی صورت یوں ہو کہ وکیل کے پاس زکوٰۃ کی رقم محفوظ موجود ہے، وہ اس نیت سے دوسرے نوٹ فقیر کو دیتا ہے کہ مالِ زکوٰۃ سے بعد میں وصول کرے گا تو پھر تبدیلی کی یہ صورت جائز ہے۔

(۱) الهدایة، کتاب الزکوة: ۲۰۱/۱

(۲) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوة، باب العشر: ۲۶۶/۳

البتہ اگر تبدیلی اس طرح ہو کہ پہلے وہ زکوٰۃ کے نوٹ اپنے اخراجات میں صرف کرتا ہے، پھر اپنے نوٹ بطورِ زکوٰۃ ادا کرے یا اپنے اور مؤکل کے مال کو خلط ملط کرتا ہے، اس طور پر کہ امتیاز ممکن نہ ہو، چونکہ ایسے تصرف میں مال کے ضیاع کا خدشہ ہوتا ہے، اس لیے اس طرح کا تصرف مؤکل کی صراحتاً یا دلالۃً اجازت سے جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ولو تصدق بدراهم نفسه أجزأ إن كان على نية الرجوع ،وكان دراهم الموكل قائمة. قال ابن عابدين:قوله:(ولو تصدق) أي الوكيل بدفع الزكوة إذاامسك دراهم الموكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم الموكل صح. بخلاف ماإذا أنفقها أولاً على نفسه مثلاً ثم دفع من ماله فهو متبرع.(۱)

ترجمہ:

اگر اپنے دراہم کو صدقہ میں واپسی کی نیت سے دیے تو کافی ہے اور مؤکل کے دراہم ابھی محفوظ تھے، علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ: ''اگر وکیل نے مؤکل کے دراہم اپنے پاس رکھتے ہوئے زکوٰۃ کی ادائیگی اس نیت سے کی کہ اس کے بدلے میں مؤکل کے دراہم سے لے لوں گا تو یہ صحیح ہے، بخلاف اس کے کہ مثلاً زکوٰۃ کے مال کو ذاتی طور پر خرچ کر دے، پھر اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرے تو وہ تبرع واحسان کرنے والا ہے''۔

❁❁❁

نقد رقم پر زکوٰۃ کی مقدار

سوال نمبر(333):

نقد رقم میں نصابِ زکوٰۃ کی مقدار کیا ہے؟ اور گھر کی ضروریات اور حوائج سے زائد جو رقم ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہو جو تمام حوائجِ اصلیہ اور قرض وغیرہ سے فارغ ہو اور نصاب کی مقدار تک پہنچتی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

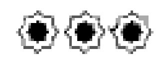
(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الزکوۃ، مطلب في زكوة ثمن المبيع وفاء:۱۸۹/۳

اور نقد رقم سے زکوٰۃ نکالنے میں سونے اور چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس لیے نقد رقم کا نصاب ایک مقرر نہیں ہوسکتا، کیوں کہ سونے اور چاندی کی قیمت بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے، اسی وجہ سے نصاب کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي)......(نام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد)وفارغ (عن حاجة الأصلية)لأن المشغول بها كالمعدوم.(١)

ترجمہ: فرضیتِ زکوٰۃ کا سبب ایسے مالِ نامی کی ملکیت کا ہونا ہے جو نصاب کے بقدر ہو، سال اس پر گزرا ہو اور ایسے قرض سے فارغ ہو جس کا مطالبہ کیا جاتا ہو اور حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہو، کیوں کہ ایسا مال جو حوائج اصلیہ میں صرف ہو رہا ہے، وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔



غیر رہائشی پلاٹ پر زکوٰۃ

سوال نمبر (334):

اگر کسی کے پاس اپنے رہائشی مکان کے علاوہ کوئی قطعہ اراضی ہو، جس پر بھائیوں اور بچوں کے لیے مکان تعمیر کرنے کا ارادہ ہو تو زکوٰۃ ادا کرتے وقت اس کو اس قطعہ اراضی کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی پڑے گی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اموالِ زکوٰۃ جن میں شریعت نے زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، ان میں سے سامانِ تجارت بھی ہے۔ مالِ تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو بیچنے کی غرض سے خریدا گیا ہو، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ بیچنے کی نیت سے خریدا گیا ہو یا کوئی زمین تجارت کی غرض سے خریدی گئی ہو تو اس پلاٹ یا زمین کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر کوئی پلاٹ یا زمین تجارت کی نیت سے نہیں خریدی گئی، بلکہ آئندہ کسی وقت اس پر مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(١) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۳/۱۷۴،۱۷۸

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وأثاث المنزل ودور السکنی و نحوها)وکذا الکتب وإن لم تکن لأهلهاإذالم تنو للتجارة.
وقال ابن عابدینؒ :قوله:(و أثاث المنزل) محترز،قوله (نام) ولوتقدیراًوقوله (ونحوها) أي کثیاب البدن الغیرالمحتاج إلیها، وکالحوانیت والعقارات.(۱)

ترجمہ:

(اور گھریلو سامان اور رہائشی مکان وغیرہ) اور اسی طرح کتابیں اس کے اہل کے واسطے نہ ہوں، ان سب میں تجارت کی نیت نہ ہو (تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں)۔ اور ابن عابدینؒ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: گھریلو سامان سے مراد وہ چیزیں ہیں جو جمع کی گئیں ہوں اور اس کا قول "نام" اگرچہ تقدیری ہو اور اس کا قول "نحوھا" کا مطلب بدن کے ایسے کپڑے جن کی طرف احتیاج نہ ہو مثلاً: دکانیں یا زمین وغیرہ۔

❁❁❁

تجارت کی نیت کے بغیر خریدے ہوئے پلاٹ پر زکوٰۃ

سوال نمبر(335):

کوئی شخص ذاتی رہائشی مکان میں توسیع کے لیے ایک پلاٹ خریدلے، لیکن بارہ تیرہ سال میں وہ اپنے مکان کی توسیع وتعمیر نہ کرسکے اور بعد میں وہ خریدے ہوئے پلاٹ کو بیچ دے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا رہائشی مکان کی تعمیر کے واسطے خریدے گئے پلاٹ پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ نیز گذشتہ تیرہ سالوں کی زکوٰۃ دینا بھی لازمی ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح ہو کہ پلاٹ یا دوسری جائیداد غیر منقولہ کی مالیت میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے تجارت کی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خریدتے وقت تجارت کی نیت نہ ہو، بلکہ ذاتی ضرورت یا کرایہ کے مکان بنوانے کے لیے پلاٹ خریدا جائے تو پھر اموالِ تجارت سے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالیت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، تاہم اگر بعد ازاں کسی ضرورت کے لیے یہ پلاٹ فروخت کیا جائے تو اس کی قیمت پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ تو واجب نہ ہوگی، ہاں

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ:۱۸۲/۳

سال رواں میں دوسری آمدنی، یا مال کے ساتھ ملادی جائے گی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت آنے پر اس سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

والدلیل علیٰ ذلک:

(وتشترط نية التجارة)أي حالة الشراء فأما إذا كانت النية بعد الملك، فلا بد من اقتران عمل التجارة بنيتها......أن مجرد النية لا تعمل كمامر.(۱)

ترجمہ:

خریدتے وقت تجارت کی نیت شرط قرار دی گئی ہے، البتہ اگر ملک کے بعد نیت کرلی تو پھر نیت کے ساتھ تجارت کا عمل بھی متصل ہونا چاہیے۔۔۔۔کیونکہ صرف نیت کرنا قابل عمل نہیں۔

❁❁❁

سامانِ تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت کا اعتبار

سوال نمبر(336):

فقہائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ دُکاندار اور تاجر حضرات ادائیگی زکوٰۃ کے لیے اپنا سامانِ تجارت کی قیمت کس طرح لگائیں گے؟ کیا قیمتِ خرید معتبر ہے یا قیمتِ فروخت؟ اگر قیمتِ فروخت کے حساب سے زکوٰۃ دی جائے گی تو بسا اوقات دُکاندار کوئی چیز سستے دام بیچ دیتے ہیں اور کبھی مہنگے دام، کسی شخص کو کم قیمت پر جب کہ دوسرے کو زیادہ قیمت پر۔تو ایسی صورت میں قیمتِ فروخت کی صحیح مقدار معلوم کرنا مشکل ہے تو پھر اس کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کیونکر ممکن ہے؟ ہاں قیمتِ خرید کے اعتبار سے ہو تو وہ متعین ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ سامانِ تجارت میں ادائیگی زکوٰۃ کے حوالے سے قیمت کے تعین میں فقہائے کرام نے قیمتِ فروخت کا اعتبار کیا ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مختلف اشخاص کے اعتبار سے قیمت میں تبدیلی آتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے قیمتِ فروخت متعین نہیں ہوسکتی، سو فقہائے کرام نے قیمتِ فروخت کے تعین میں امکان کو معیار قرار دیا ہے، یعنی سال کے اختتام پر تاجر اور مالک سامان کا منصفانہ اور محتاط طریقے سے اندازہ لگائیں کہ میرے پاس موجود سامان

(۱) فتح القدير، كتاب الزكوة، باب زكوة المال:۲/۱۶٦

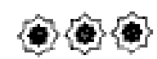
معمول اور عادت کے موافق کس قیمت پر فروخت ہوسکتا ہے۔پس اسی کا اعتبار ہوگا۔نیز پورے سامان کی یکمشت قیمت بھی لگائی جاسکتی ہے،مگر احتیاط اسی میں ہے کہ مارکیٹ ویلیو کو معیار قرار دیا جائے،جس سے تاجر خوب واقف ہوتے ہیں۔

والدلیل علیٰ ذلک:

یكون التقويم لكل تاجر بحسبه ، سواء أكان تاجر حملة أم تاجر تجزئة ،بالسعر الذي يمكنه الشراء به عادة عندالحول.(١)

ترجمہ:

ہر تاجر اس بھاؤ کے مطابق اپنے لحاظ سے قیمت معین کرے گا،چاہے وہ ہول سیل تاجر ہو یا پرچون،جس سے عادتاً دوران سال کسی چیز کا خریدنا ممکن ہو۔



کتابیں بطورِ زکوٰۃ دینا

سوال نمبر(337):

ایک شخص دینی کتب خانے کا مالک ہو۔سال مکمل ہونے پر مالک ادائیگی زکوٰۃ کرتے ہوئے نقد رقم کی بجائے طلبا کو کتب بطورِ زکوٰۃ دے دیتا ہو تو کیا اس طرح ادائیگی زکوٰۃ ہوجائے گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ (زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہوئے) بطورِ زکوٰۃ ہر اس چیز کا دینا درست اور جائز ہے جو قابل تملیک و تملک ہو تو کتابیں بھی چونکہ دیگر اشیا کی طرح قابل تملیک وتملک ہیں،اس لیے بطورِ زکوٰۃ کتابیں دے دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔

تاہم اس میں طلبا کو تملیکاً دینا ضروری ہے۔صرف عاریتاً دینا یا مدرسہ کے کتب خانہ میں بطورِ وقف رکھنے سے تملیک کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

---

(١) وهبة الزحيلي،الفقه الإسلامي وأدلته،،التوصيات و الفتاوى،الموضوع الثاني:١٠/٧٩٦٢

والدّلیل علیٰ ذلک:

(یصرف) المزکي (إلی کلھم، أو إلی بعضھم تملیکاً) لا إباحة. (۱)

ترجمہ: مزکی زکوٰۃ کی رقم تمام فقرا یا بعض کو بطورِ تملیک دے گا نہ کہ بطورِ اباحت کے۔

❁❁❁

سامانِ تجارت کے لیے جگہ بنانے پر خرچ شدہ رقم کی زکوٰۃ

سوال نمبر(338):

کوئی شخص تجارت کے لیے دُکان اگر کرایہ پر حاصل کرے اور پھر دُکان کے سامنے مزید مالِ تجارت رکھنے کے لیے ایک چبوترا بنادے، جس پر تقریباً 30 ہزار روپے ذاتی مالیت سے خرچ کرے تو اب سال مکمل ہونے پر دوسرے سامانِ تجارت کی طرح چبوترے کی تعمیر پر خرچ ہونے والے تیس ہزار روپے کی زکوٰۃ دینا بھی اس شخص پر واجب رہے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے زکوٰۃ سال گزرنے کے بعد تجارت کی ان اشیا میں واجب ہوتی ہے جو اشیا فروخت کرنے کی نیت سے خرید کر رکھی جائیں اور ان میں نمو پائی جائے، اس لیے کاریگر کے آلات اور سامانِ تجارت رکھنے کے لیے تعمیر کیے جانے والی جگہوں پر خرچ شدہ رقم یا سامانِ حرفت وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کوئی دُکان کے سامنے سامان رکھنے کے واسطے جگہ تیار کرتے ہوئے اس پر رقم خرچ کردے تو سال گزرنے کے بعد اس شخص پر اس کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وأما الآلات الصناع، وظروف أمتعة التجارة، لاتکون مال التجارة؛ لأنھا لاتباع مع الأمتعة عادة. (۲)

ترجمہ: اور کاریگر کے آلات اور بوقتِ تجارت جن برتنوں سے فائدہ اٹھایا جائے، وہ مالِ تجارت شمار نہیں ہوتے،

---

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ، باب المصرف: ۲۹۱/۳

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل في الشرائط التي ترجع إلی المال: ۲۹۸/۲

کیوں کہ عادتاً یہ سامان کے ساتھ بیچے نہیں جاتے۔

❀❀❀

بیوی کے مال سے خاوند کا غنی شمار ہونا

سوال نمبر(339):

ایک خاتون کے ملک میں کافی مقدار میں مال و دولت موجود ہے، جب کہ اس کے خاوند کے پاس حوائجِ اصلیہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ تو کیا شرعاً یہ شخص مستحقِ زکوٰۃ شمار ہوتا ہے؟ اور اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے اس وقت آدمی صاحبِ نصاب شمار ہوتا ہے، جب اس کے ملک میں ضروری استعمال کی اشیا کے علاوہ ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی مقدار کی مالیت ہو۔ جب کہ مالک کا مال پر ملکِ تام حاصل ہونا بھی شرط ہے اور جہاں تک غیر کے مال و دولت کا تعلق ہے تو اس سے کوئی اور شخص صاحبِ نصاب نہیں بنتا، لہٰذا اگر کوئی شوہر خود صاحبِ نصاب نہ ہو تو وہ بیوی کے مال کی وجہ سے غنی شمار نہیں کیا جائے گا، اس لیے مالدار بیوی کے غریب شوہر کے لیے زکوٰۃ لینا درست ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والمانع أن الطفل يعد غنياًبغنى أبيه،بخلاف الكبير فإنه لايعد غنياًبغنى أبيه،ولاالأب بغنى ابنه،ولا الزوجة بغنى زوجها.(۱)

ترجمہ:

بچے کو زکوٰۃ دینے سے مانع یہ امر ہے کہ بچہ باپ کے مالدار ہونے کی وجہ سے غنی شمار ہوتا ہے، بخلاف بڑے لڑکے کے کہ وہ باپ کے مالدار ہونے کی وجہ سے غنی شمار نہیں ہوتا اور نہ باپ بیٹے کے، نہ بیوی شوہر کے مالدار ہونے کی وجہ سے مالدار شمار ہوتے ہیں۔

ولودفع إلى امرأة فقيرة ،و زوجهاغني جازفي قول أبي حنيفة، ومحمد وهو إحدى الروايتين

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، باب العروض: ۲۹۹/۳

عن ابي يوسف .(۱)

ترجمہ: اور اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم فقیر عورت کو دی اور اس کا شوہر مالدار ہے تو امام صاحبؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق جائز ہے اور یہی قول ابی یوسف کے دو روایتوں میں سے ایک ہے۔

❁❁❁

شرکا کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(340):

تین بھائی کاروبار میں شریک ہوں اور گذشتہ تین سال سے ادائیگی زکوٰۃ انہوں نے نہ کی ہو۔اب ان میں سے ایک بھائی خرچے میں سے دوسو روپے نکال کر بطورِ زکوٰۃ اس طرح ادا کرتا رہا بعد میں اپنے اس عمل سے بھائیوں کو آگاہ کرے گا، کیوں کہ دوسرے بھائی زکوٰۃ دینے پر راضی تو ہوں، لیکن فی الحال دینے کی ہمت نہ کر سکتے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر اس طرح زکوٰۃ دینا از روئے شریعت ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟

بيّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شخصی فریضہ ہے، اس لیے دیگر شرائط کے ساتھ ساتھ اگر کوئی شخص بقدرِ نصاب مال کا مالک ہو تو وہ ادائے زکوٰۃ کا مکلف رہے گا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر شرکا عقدِ شرکت کی بنیاد پر مال جمع کیے ہوئے ہوں تو اگر انفرادی طور پر ہر ایک کی ملکیت بقدرِ نصاب ہو تو ہر ایک کو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا کرے گا، کوئی ایک شریک دوسرے شرکا کی اجازت کے بغیر ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتا، اگر ادا کر دی تو وہ ان کی اجازت پر موقوف ہوگی اگر وہ اجازت دیدیں اور مال ابھی تک فقرا کے پاس موجود ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوگی اور اگر ہر ایک کا مال نصاب سے کم ہو تو پھر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔

والدّليل على ذلك:

وإن تعدد النصاب تجب إجماعاً،ويتراجعان بالحصص .قال ابن عابدينؒ :قوله : (وإن تعدد

(۱) بدائع الصنائع،كتاب الزكوة،فصل في الذي يرجع الى المؤدى إليه:۲/۴۷۶

النصاب) أي بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحد بإنفراده نصاباً، فانه يجب حينئذ على كل منهما زكوة نصابه.(۱)

ترجمہ:

اور اگر نصاب متعدد ہوتو اجماع کے مطابق وجوب زکوٰۃ ہر ایک کے حصے کے مطابق ہوگی۔ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:اس کے قول (إن تعدد النصاب) کا مطلب اس حیثیت سے ہے کہ تمام کوضم کرنے سے قبل ہر ایک کا مال انفرادی طور پر نصاب کے بقدر ہو۔پس بے شک اب ان میں سے ہر ایک پر نصاب کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی۔

رجل أدى زكوة غيره عن مال ذلك الغير،فأجازه المالك،فإن كان المال قائماًفي يدالفقيرجاز، وإلافلا.(۲)

ترجمہ: ایک شخص نے کسی اور آدمی کی طرف سے اسی آدمی کے مال سے زکوٰۃ ادا کردی پھر مالک نے اجازت دے دی تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اجازت کے وقت وہ مال زکوٰۃ لینے والے غریب کے پاس موجود تھا،تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

❁❁❁

فارمی مرغیوں اوران کی پیداوار پر زکوٰۃ

سوال نمبر(341):

موجودہ دور میں مرغیوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے فارمز بنائے گئے ہیں اوران میں مرغیاں پالی جاتی ہیں، جوانڈے دیتی رہتی ہیں اوران انڈوں سے پھر مشینوں کے ذریعے چوزے پیدا کیے جاتے ہیں اور جب مرغیاں انڈے دینا کم یابند کردیتی ہیں توانہیں بیچ دیا جاتا ہے۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرغیوں اور چوزوں دونوں سے زکوٰۃ دینا ہوگی یا صرف چوزوں سے؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ شریعت نے ہر ایسی چیز پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے جو مقررہ نصاب کے بقدر ہواور جس میں

(۱) ردالمحتارعلی الدرالمختار،کتاب الزکوۃ،باب العروض:۳/۲۳۶

(۲)الفتاوی الهندية،کتاب الزکوۃ،باب في تفسيرهاوصفتها:۱/۱۷۱

تجارت کی نیت بھی کی گئی ہو۔

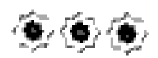
صورتِ مسئولہ کے مطابق فارمز کا قیام تجارت کی غرض سے ہوتا ہے۔لہٰذا ان میں انڈوں اور مرغیوں کی پیداوار تجارت کی نیت سے کی جاتی ہے،لہٰذا ان چیزوں کی مالیت نصاب تک پہنچ جائے تو سال گزرنے پر ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس میں زکوٰۃ دینے کی نوعیت یوں ہوگی کہ جب مرغیاں اور انڈے وغیرہ فروخت کریں تو تمام سرمایہ میں قاعدہ شرعیہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔جب تک مرغیاں انڈوں کے لیے رکھی ہوں تو زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان کی قیمت لگانے کی ضرورت نہیں،ہاں فروخت کرنے کے بعد قیمت سرمایہ کے ساتھ ضم ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الزکوٰۃ واجبۃ في عروض التجارۃ کائنۃ ماکانت إذا بلغت قیمتھا نصاباً من الورق أو الذھب.(۱)

ترجمہ:

تجارت کے سامان میں زکوٰۃ واجب ہے،چاہے سامان کوئی بھی ہو،بشرطیکہ اس کی قیمت چاندی یا سونے کے نصاب کو پہنچ جائے۔



ادائیگی زکوٰۃ میں کہاں کی قیمت معتبر ہوگی؟

سوال نمبر(342):

سامانِ تجارت میں کہاں کی قیمت معتبر ہوگی؟ بازاروں اور دیہاتوں کی قیمت میں فرق تو ہوتا ہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ بڑے شہروں سے دیہات یا چھوٹے شہروں کو جو اشیا لائی جاتی ہیں،چونکہ بڑی مارکیٹ (جہاں سے سامان لایا گیا ہو) میں قیمت متعین ہوتی ہے،اس لیے وہاں کے حساب سے جو قیمت ہوگی،اس کے اعتبار سے زکوٰۃ لازم ہوگی۔ ازروئے شریعت اس کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا توٴجروا

(۱) الھدایۃ،کتاب الزکوٰۃ،فصل في العروض:۱/۲۱۲

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ سامانِ تجارت میں ادائیگی زکوٰۃ کرتے وقت متعین قیمت میں اس مقام (شہر/بازار) کا اعتبار ہوگا، جہاں وہ سامانِ تجارت موجود ہو،لہٰذا جن دوسرے شہروں یا ممالک سے اموالِ تجارت درآمد ہو جائیں تو ان مقامات میں رائج قیمت قابلِ اعتبار نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویقومها المالك في البلد الذي فيه المال،حتى لو بعث عبد للتجارة إلى بلد آخرفحال الحول تعتبرقيمته في ذلك البلد، ولوكان في مفازة تعتبر قيمته في أقرب الأمصار إلى ذلك الموضع.(۱)

ترجمہ: مال کا مالک تجارتی مال کی قیمت اس شہر کے نرخ کے بموجب کردے گا، جہاں وہ تجارتی مال موجود ہے۔حتیٰ کہ اگر کسی نے کوئی غلام تجارت کے لیے دوسرے شہر بھیجا اور سال گزرا تو اس کی قیمت کا حساب اس دوسرے شہر میں قیمت کے حساب سے ہوگا اور اگر مال تجارت بیابان میں ہوتو پھر قیمت کا حساب اس شہر میں قیمت کے حساب سے ہوگا، جو وہاں سے زیادہ قریب ہے۔

❀❀❀

کسی فقیر کا قرض معاف کرنے کو زکوٰۃ میں شمار کرنا

سوال نمبر(343):

اگر کسی شخص کے دوسرے پر دس ہزار روپے قرضہ ہو اور وہ مدیون قرضہ ادا کرنے سے بوجہ فقر معذور ہو اور دائن خیر خواہی کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا قرضہ اس کو زکوٰۃ میں معاف کردے تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ زکوٰۃ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے، جس میں تملیک شرط ہے۔قرض کی رقم زکوٰۃ کی جگہ معاف کردینے سے تملیک نہیں پائی جاتی، بلکہ بغیر وصولی کے معاف کیا جاتا ہے۔اس لیے اس طرح زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔تاہم یہ ممکن ہے کہ پہلے اپنی طرف سے بطورِ زکوٰۃ کچھ رقم اسے دے کر اس کو مالک بنادیا جائے، پھر وہ بدِ قرض ادا کردے تو اس

(۱) الفتاوی الهندية،كتاب الزكوة،باب في زكوٰة الذهب و الفضة،والعروض:۱/ ۱۸۰

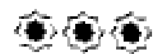
صورت میں زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور قرض بھی وصول ہو جائے گا۔

والدّليل على ذلك:

أما تفسيرها:فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي، ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالىٰ هذا في الشرع.(۱)

ترجمہ:

تفسیر زکوٰۃ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر کسی ایسے مفلس مسلمان کو زکوٰۃ کے مال کا مالک بنانا، جو نہ ہاشمی ہو اور نہ ہاشمی کا غلام ہو اور اس مال کے دینے میں شرط یہ ہے کہ مالک سے اس مال کی منفعت بالکل ختم ہو جائے یہ زکوٰۃ کا شرعی مفہوم ہے۔



دینِ قوی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(344):

ایک شخص کا دوسرے شخص پر ایک لاکھ روپے کا قرضہ ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے۔تو قرضہ دینے والے پر ایک لاکھ روپے میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

وہ مال جو سامانِ تجارت کے بدلے کسی کے ذمہ واجب اور قرض ہو۔دینِ قوی کہلاتا ہے اور دینِ قوی کی زکوٰۃ کے متعلق حکمِ شرعی یہ ہے کہ جب اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قرض کے قبض کرنے تک مؤخر کی جائے گی۔جب قرض وصول ہو اور اس پر سال گزر چکا ہو تو پھر اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

تاہم اگر قرض یوں ہو کہ دائن اپنے قرض کے وصول ہونے سے مایوس ہو چکا ہو، مثلاً مدیون منکر ہو اور دائن کے پاس گواہ نہ ہو تو اس صورت میں یہ مالِ ضمار کے حکم میں ہو کر اس کی زکوٰۃ دائن پر نہیں، البتہ اگر اس طرح قرض خلاف امید واپس ہو جائے اور وصولی کے بعد اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۱) الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،باب في تفسيرها وصفتها:۱/۱۷۰

والدلیل علیٰ ذلک:

قسم أبو حنيفة الدين على ثلاثة أقسام :قوي:وهو بدل القرض، و مال التجارة، ومتوسط: وهوبدل مالیس للتجارة كثمن ثياب البذلة، وعبدالخدمة ،و دارالسكنى، وضعيف: وهوبدل ماليس بمال كالمهر ،والوصية.... ففي القوي تجب الزكوة إذا حال الحول ،و يتراخي القضاء إلى أن يقبض أربعين درهمافقيهادرهم، وكذافيمازاد بحسابه.(۱)

ترجمہ:

امام ابوحنیفہؒ نے دیون کو تین اقسام میں تقسیم کردیا ہے۔قوی وہ ہے جو قرض کے بدلے ہو اور یا مالِ تجارت ہو اور متوسط وہ ہے جو کہ تجارتی مال نہ ہو، جیسے روزمرہ کے کپڑوں کی قیمت، خدمت کا غلام اور رہائشی مکان اور ضعیف وہ ہے جوایسی چیز کا بدل ہو جو کہ مال نہ ہو، جسے مہر اور وصیت کا مال۔۔۔۔دینِ قوی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، جب اس پر سال گزرجائے اور ادائیگی چالیس درہم کے قبضہ ہونے تک مؤخر کردی جائے گی تو اس میں ایک درہم واجب ہوگا اور چالیس سے زائد میں اسی حساب سے واجب ہوگا۔

لا زكوٰة في مال الضمار، وهومالايمكن الانتفاع به مع بقاء الملك .(۲)

ترجمہ: مالِ ضمار میں زکوٰۃ نہیں اور مالِ ضمار ایسا مال ہے کہ ملک کے باقی ہونے کے باوجود اس سے انتفاع ممکن نہ ہو۔

❁❁❁

مشترکہ خریدی ہوئی زمین پر زکوٰۃ

سوال نمبر(345):

دو بھائیوں میں سے اگر ایک کچھ زمین خرید رہا ہو۔چھوٹا بھائی یہ کہہ دے کہ ابھی ساری زمین آپ خرید لیں، میرے پاس فی الحال نقد رقم نہیں۔تین چار سال کے اندر میں آپ کو آدھی رقم دے دوں گا تو آدھی زمین میری ہو جائے گی، آدھی آپ کی۔اگر کہیں میں آدھی رقم ادا نہ کرسکا تو پوری زمین آپ کی ہوگی۔اب اگر چھوٹا بھائی تین سال کے بعد آدھی رقم بڑے بھائی کے حوالے کردے تو اب اس پر اس آدھی قیمت کی گذشتہ تین سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

(۱) البحرالرائق ،کتاب الزکوۃ :۲/۳٦۳

(۲) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ،کتاب الزکوۃ :۳/۱۸٤

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ ایسے مال پر واجب ہوتی ہے جو نصاب کے بقدر ہو، آدمی کی ملکیت میں ہو اور اس پر سال گزر جائے۔ اگران شرائط میں سے کوئی ایک بھی شرط بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ مذکورہ صورت کے مطابق جب کوئی ساری زمین خرید کر رقم زمین بیچنے والے کے حوالے کر دے تو اب نقد رقم پر اس کی ملکیت ختم ہوگی، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

جبکہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا ہوا معاملہ قرض کا نہیں، بلکہ شروع میں تو وعدۂ بیع ہے اور جس وقت وہ آدھی زمین کی قیمت ادا کرتا ہے تو یہ ان کے درمیان الگ طور سے بیع منعقد ہونے کی صورت ہے، لہٰذا بڑے بھائی پر گذشتہ تین سالوں کی زکوٰۃ دینا لازم نہیں، کیونکہ یہ رقم اس کی ملک میں نہیں تھی اور زمین اگر تجارت کی نیت سے نہ ہو تو اس میں بھی زکوٰۃ نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومنہا کون المال نصابا............ومنہا الملک التام............ومنہا الفراغ عن الدین............ومنہا حولان الحول.(۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ واجب ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط مال کا نصاب کے برابر ہونا ہے......ایک شرط نصاب پر پوری ملکیت کا ہونا ہے......ایک شرط یہ ہے کہ مال قرض سے فارغ ہو......ایک شرط یہ ہے کہ مال پر سال گزرا ہو۔

❁❁❁

ایڈوانس رقم پر زکوٰۃ

سوال نمبر(346):

ایک آدمی نے اگر زمین اجارہ پر لی ہو۔ زمین لیتے وقت اس نے مالکِ زمین کو پچاس ہزار روپے دیے ہوں، جو کہ مالکِ زمین اجارہ ختم ہونے پر اس کو واپس دے گا تو ان پچاس ہزار روپے کی زکوٰۃ کون ادا کرے گا؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب الزکوۃ، باب فی تفسیرہا وصفتہا: ۱/۱۷۲-۱۷۵

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے اگر مکان یا زمین اجارہ پر لیتے وقت ایڈوانس رقم مالک کو بطورِ ضمانت دی جائے جو اجارہ کے ختم ہونے پر قابلِ واپسی ہو۔اس کے متعلق فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مال کی حیثیت مالِ مرہونہ کی ہے۔جس طرح مالِ مرہونہ کی زکوٰۃ راہن ومرتہن میں سے کسی پر واجب نہیں۔اسی طرح ایڈوانس کی رقم میں کرایہ دار اور مالک کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق جو پچاس ہزار روپے بطورِ ایڈوانس دیے گئے ہیں،ان کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر ہے اور نہ ہی مالکِ زمین پر واجب ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(فلا زکوة علی مکاتب)لعدم الملك التام،ولافي كسب ماذون،ولافي مرهون بعد قبضه.قال ابن عابدينؒ:قوله:(ولا في مرهون)أي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة،ولا على الراهن لعدم اليد،وإذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضيه.(۱)

ترجمہ: مکاتب پر ملکِ تام نہ ہونے کی وجہ سے اور ماذون کے کسب پر اور مرہونہ پر قبضہ کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب نہیں۔علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ:ماتن کے قول"(ولا في مرهون) کا مطلب یہ ہے کہ مرتھن پر نہیں،کیوں کہ رقبہ کی ملکیت نہیں ہے اور نہ راہن پر،کیوں کہ قبضہ نہیں ہے اور جب راہن (مرہونہ کو)واپس لے تو اس صورت میں وہ گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا۔



خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے زکوٰۃ دینا

سوال نمبر(347):

ایک آدمی صاحبِ نصاب ہو،لیکن بخل کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو اور مال کو اپنی بیوی کے پاس جمع کرتا ہو تو اس کی بیوی اس کی اجازت کے بغیر خفیہ طور پر اس کے مال سے زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ خاوند زکوٰۃ دینے پر راضی نہ ہو؟

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الزکوة،مطلب في ثمن المبيع وفاء:۱۷۹/۳-۱۸۰

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی شخص کو صاحبِ نصاب ہوجانے پر از خود اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے یا کسی کو وکیل بنا کر ادا کرنا چاہیے، تاہم کسی نے اگر دوسرے شخص کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ ادا کردی تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ الا یہ کہ مالک ایسے وقت میں اجازت دے کہ مالِ زکوٰۃ فقیر کے ہاں موجود ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوجائے گی اور مالک کا ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر خاوند صاحبِ نصاب ہو اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوچکی ہو، لیکن بخل کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو اس صورت میں اس کی بیوی کے لیے اس کی اجازت کے بغیر خفیہ طور پر اس کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا درست نہیں اور نہ ہی اس ادائیگی سے خاوند کا ذمہ فارغ ہوجاتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

رجل أدی زکوۃ غیرہ عن مال ذلك الغیر،فأجازہ المالك،فإن کان المال قائماًفي یدالفقیرجاز، وإلافلا.(۱)

ترجمہ:

ایک شخص نے کسی اور آدمی کی طرف سے اسی آدمی کے مال سے زکوٰۃ ادا کردی پھر مالک نے اجازت دے دی تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اجازت کے وقت وہ مال زکوٰۃ لینے والے غریب کے پاس موجود تھا تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

❁❁❁

مالِ مشترکہ میں زکوٰۃ

سوال نمبر(348):

اگر کسی شخص کے پاس گاؤں کے افراد کا مشترکہ فنڈ ہو جو کہ نصاب کے برابر ہو تو کیا سال گزرنے پر اس مشترکہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

(۱)الفتاوی الهندیة،کتاب الزکوۃ،باب في تفسیرها وصفتها:۱/۱۷۱

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جس میں ملک تام ثابت ہو۔ ملک تام کا مفہوم یہ ہے کہ ملکیت کے ساتھ ساتھ قبضہ بھی ثابت ہو۔ جس رقم میں یہ دونوں یا کوئی ایک وصف بھی مفقود رہے گا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ چونکہ مشترکہ فنڈ کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں، اس لیے اس میں ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومنها الملك التام ،وهو ما اجتمع فيه الملك واليد، وأما إذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض، او وجد اليد دون الملك ،كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكوة.(۱)

ترجمہ: زکوٰۃ واجب ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ ملکیت پوری ہو اور پوری ملک سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور قبضہ بھی ہو اور اگر ملکیت ہو، مگر قبضہ نہ ہو مثلاً حق مہر کا مال، جو کہ قبضہ کے بغیر ہو یا قبضہ ہو مگر ملکیت نہ ہو، مثلاً: مکاتب غلام کے مال کی ملکیت اور مقروض آدمی کے مال کی ملکیت، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

❀❀❀

صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود ذاتی رہائشی مکان کا نہ ہونا

سوال نمبر(349):

ایک آدمی کے پاس نصاب سے زائد مال موجود ہو، لیکن رہائش کے لیے ذاتی مکان نہ ہو تو اس صورتحال میں مذکورہ شخص پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ہے؟ اور کیا خود دوسروں سے زکوٰۃ لے سکتا ہے؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی کی ملکیت میں موجود مال جو اس کے حوائج اصلیہ سے زائد ہو، اگر ساڑھے باون تولے چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر ہو تو زکوٰۃ کا مستحق نہیں، اس لیے اسے زکوٰۃ کی رقم دینا درست نہیں، بلکہ خود صاحبِ نصاب ہو کر اپنی رقم کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ ذاتی رہائشی مکان کا نہ ہونا کوئی ایسا عذر نہیں کہ جس کی بنا پر اسے غریب شمار کر کے اسے

---

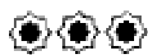
(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، باب في تفسيرها وصفتها: ۱/ ۱۷۲

زکوٰۃ دی جائے، کیوں کہ ضرورت کرایہ کے مکان میں بھی پوری ہوسکتی ہے، لہٰذا جب تک یہ رقم خرچ نہ ہوتو حوائجِ اصلیہ سے زائد متصور ہوگی اور صاحبِ نصاب متصور ہوکر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(و)لا إلی(غني) یملك قدرنصاب فارغ عن حاجته الأصلیة من أي مال کان.(١)

ترجمہ: نہ کسی غنی کوزکوٰۃ دی جاسکتی ہے جوبقدرِنصاب مال کا مالک ہو،ایسانصاب جوکہ حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہو، چاہے کسی قسم کا مال ہو۔



سال بھر استعمال نہ ہونے والے برتن اورلباس میں زکوٰۃ

سوال نمبر(350):

کسی خاتون کے پاس اگر گھر میں ضرورت سے زائد پہننے کے کپڑے، جوتے اور برتن ایسے پڑے ہوں کہ سال بھرایک مرتبہ بھی ان کے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آتی تو کیااس خاتون پران کی زکوٰۃ دینالازم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر اشیامیں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے، جب وہ تجارت کی غرض سے رکھے گئے ہوں اوران کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب میں سے اس نصاب تک پہنچ جائے جوکہ فقرا کے لیے زیادہ مفید ہو،لہٰذا موجودہ دور میں حالات کومدِنظر رکھ کرعلماے کرام چاندی کے نصاب تک قیمت کا پہنچ جانا ضروری قرار دیتے ہیں۔اس کے علاوہ جواشیا ضروریاتِ زندگی، تجمّل اور زیب وزینت کے لیے رکھے جاتے ہیں،ان میں زکوٰۃ واجب نہیں،البتہ اگران کی قیمت نصاب تک پہنچتی ہوتو یہ زکوٰۃ لینے سے مانع ضرور بنتی ہیں۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق گھر میں خواتین نے اپنے پاس جوجوڑے برتن، جوتے وغیرہ رکھے ہوتے ہیں اور سال بھران کے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آتی توان میں زکوٰۃ واجب نہیں،اس لیے کہ یہ ضرورت ہی میں داخل ہیں، کیونکہ ضرورت کا دائرہ کارمختلف ہوتا رہتا ہے۔بعض چیزیں روزانہ استعمال کی ہوتی ہیں اوربعض خاص مواقع پر

(١)الدرالمختارعلی صدرردالمحتار، کتاب الزکوۃ:۳/۲۹۵،۲۹۶

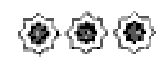
استعمال ہوتی ہیں، لیکن ان کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔ضرورت کے علاوہ جو چیزیں تجمل اور زیب وزینت کے لیے الماریوں میں سجائی جاتی ہیں، اس لحاظ سے یہ اشیاءے تجمل بھی ہیں اور استعمال میں نہیں لائی جاتیں، وہ ضرورت سے زائد ہیں، ان میں وجوب کی شرائط موجود ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها فراغ المال) عن حاجته الأصلية، فليس في دورالسكنى، وثياب البدن ،و أثاث المنازل......وكذا طعام أهله، ومايتجمل به من الأواني إذالم يكن من الذهب و الفضة.(۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط میں ایک شرط یہ ہے کہ وہ مال ضروریاتِ اصلیہ سے زائد ہو، پس رہائشی گھروں میں، بدن کے کپڑوں میں اور گھر کے ساز وسامان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔۔۔اسی طرح غلہ پر جو اہل وعیال کے کھانے کے لیے ہو زکوٰۃ نہیں ہے اور آرائش کے برتنوں پر زکوٰۃ نہیں، بشرطیکہ وہ سونے، چاندی کے نہ ہوں۔



بینک ملازم کا اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(351):

موجودہ نظامِ بینکاری تو اکثر سودی نظام پر مشتمل ہے۔اگر کوئی بینک کا ملازم ہو اور بینک سے اس کو تنخواہ ملتی ہو تو کیا بقدرِ نصاب مال کا مالک ہونے کی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو وہ کس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کرے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

انسانیت کی فلاح کے لیے دیگر بدنی عبادات کی طرح اپنے مال کی مقدار متعین کرکے ایک حصہ کا کسی مستحق کو مالک بنا دینا ایک حکمِ خداوندی ہے، جو کہ مالی عبادت شمار ہوتی ہے۔یہ مال کے باقی حصے کو پاک وطیب کر دیتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت عنایت کی جاتی ہے اور اس کے مالک کو بری خصلتوں سے پاک وصاف کرتا ہے

(۱)الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة،باب في تفسيرها وصفتها: ۱/۱۷۲

جس کی وجہ سے اس فعل کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر کہیں کسب وکمائی ہی ایسے طریقے پر ہو جو شرعاً ممنوع وحرام ہو تو پھر وہ مال صرف زکوٰۃ دینے سے پاک نہ ہوگا، بلکہ اگر اس کی واپسی مالک کو ممکن ہو تو مالک تک پہنچانا لازمی ہے، ورنہ سب کا سب مال غریبوں، محتاجوں پر بلا نیتِ ثواب صدقہ کرنا واجب ہے، تاہم اگر کہیں کل مال صدقہ کرنے کی توفیق نہ ہو یا کل مال صدقہ کرنا مشکل ہو تو اگر وہ کچھ مال بطورِ زکوٰۃ دے تو کم ازکم اس سے تو اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا۔ مالِ حرام کے متعلق مالک کو یہ عزم اور نیت کرنی چاہیے کہ میرے پاس جتنا مالِ حرام ہے، موقع بموقع اس کو صدقہ کرے گا، کیوں کہ جب تک وہ اس مالِ حرام کے بقدر مال کو صدقہ نہ کرے، اس وقت تک فراغِ ذمہ مشکل ہے۔

لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں بلا شبہ بینک کی نوکری عالمی سطح پر ایک سودی نظام سے تعاون کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے اور اس پر ملنے والی تنخواہ بھی ناجائز اور حرام کے زمرے میں شمار ہوگی، اس لیے کہ وہ سب واجب التصدق ہے، لیکن کہیں اس سے کچھ حصہ بطورِ زکوٰۃ ادا کیا جائے تو کم ازکم اس اداشدہ حصہ سے اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(كمالو كان الكل خبيثا) في القنية: ولو كان الخبيث نصاباًلايلزمه الزكوة؛لأن الكل واجب التصدق عليه،فلايفيدإيجاب التصدق ببعضه.(١)

ترجمہ:

(اسی طرح اگر تمام کا تمام مال حرام کا ہو) قنیہ میں ہے کہ: اگر مالِ حرام بقدرِ نصاب ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ وہ تمام کا تمام واجب التصدق ہے۔ بعض کو صدقہ کرنے سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔

❁❁❁

شیئرز کے مشترکہ کاروبار پر زکوٰۃ

سوال نمبر (352):

موجودہ جدید دور میں شیئرز کا کاروبار عروج پر ہے۔ اور سرمایہ کاری کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر چند افراد

(١) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة،مطلب فيمالوصادر السلطان...:٣/٢١٨

مل کرمشترکہ طور پر کاروبار کرتے ہوئے نصاب زکوٰۃ سے کئی گنا زیادہ مشترکہ سرمایہ حاصل کریں۔لیکن تقسیم کے بعد بعض حصہ داروں کا حصہ نصاب تک پہنچتا ہو اور بعض کا نہیں تو ایسے مال میں زکوٰۃ کا کیا طریقہ کار ہے؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ میں ادائیگی زکوٰۃ کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے والے کا صاحبِ نصاب ہونا ضروری امر ہے۔لہٰذا اگرکہیں چند افراد شریکِ کاروبار ہوں اوران کا مشترکہ مال نصابِ زکوٰۃ سے بڑھ کر ہو،لیکن تقسیم کرنے کے بعد بعض حصہ داروں کے حصص نصابِ زکوٰۃ تک پہنچتے ہوں اور بعض کے نہیں تو چونکہ مشترکہ کاروبار میں مالِ مشترکہ پر زکوٰۃ نہیں، بلکہ ہر حصہ دار کے حصہ پر الگ الگ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے،اس لیے جس کا حصہ نصاب کے برابر ہو تو اس پر اپنے حصے کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس کا حصہ نصاب سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ دینی واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولاتجب) الزكوة عندنا(في نصاب) مشترك(من سائمة)ومال تجارة ،(وإن صحت الخلطة فيه)......وإن تعدد النصاب تجب إجماعاً،ويتراجعان بالحصص ،وبيانه في الحاوي، فإن بلغ نصيب أحدهما نصاباًزكوة دون الآخر.(١)

ترجمہ: احناف کے نزدیک جانور، مالِ تجارت مشترک ہوکر نصاب کے بقدر ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، اگرچہ اس کا خلط ہونا درست ہو۔۔۔۔اگر نصاب میں تعدد ہو تو اجماع کے مطابق اس میں زکوٰۃ ہر ایک کے حصے کے مطابق واجب ہوگی اور تفصیل حاوی میں ذکر ہے کہ جس کسی کا حصہ نصاب کے بقدر ہو تو وہ زکوٰۃ ادا کرے گا، جبکہ دوسرے پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں۔



مالِ نصاب سے مہر منہا کرنا

سوال نمبر(353):

ایک شخص بقدرِ نصاب مال کا مالک ہوجانے کے بعد اس کی منگنی طے ہوجائے اور اس کے ذمے بیوی کا حقِ مہر

(١)الدرالمختار علی صدرردالمحتار، کتاب الزکوة،باب زکوٰة المال:٣/٢٣٥،٢٣٦

واجب الادا ہو تو ایسی صورت میں اب مذکورہ شخص بقدرِ نصاب مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:
واضح رہے کہ مہر کی ادائیگی شوہر کے ذمہ واجب ہوا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر شوہر ادائیگی مہر سے قبل ہی فوت ہو جائے تو ترکہ میں سے مہر کو الگ کیا جائے گا،البتہ اگر شوہر کسی مجبوری یا تنگدستی کی بنا پر تا حال مہر کی ادائیگی پر قادر نہ رہے تو اس کے پاس موجودہ رقم جبکہ مہر مقررہ سے منہا کرنے کے بعد نصاب تک نہ پہنچے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن اگر مہر کی واجب الادا رقم موجودہ رقم سے منہا کر کے بقیہ رقم نصاب تک پہنچتی ہو تو تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔
اور اگر کوئی شخص باوجود قدرت کے عورت کا مہر ادا نہیں کر رہا ہو اور نہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو یا بیوی حق مہر کا مطالبہ نہیں کرتی ہو،جیسا کہ آج کل معاشرے میں ایک غلط رواج چل پڑا ہے تو اس صورت میں مہر کے واجب الادا ہونے کے باوجود بھی کل مال اگر نصاب کو پہنچتا ہو تو زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:
قال مشایخنا رحمهم الله تعالىٰ في رجل عليه مهرمؤجل لامرأته،وهو لايريد أداه لا يجعل مانعامن الزكوة لعدم المطالبة في العادة،وإنه حسن أيضا.(۱)

ترجمہ:
ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ جس آدمی کے ذمہ اپنی بیوی کا مہرِ مؤجل واجب ہو(جو اسے کچھ عرصہ بعد ادا کرنا ہو)اور وہ آدمی اس مہر کے ادا کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو یہ مہر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مانع نہیں،اس لیے کہ عادت یوں ہے کہ اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا اور یہ قول بھی احسن ہے۔

❁❁❁

بچوں کی شادی کے لیے گھر میں رکھے ہوئے سونے پر زکوٰۃ

سوال نمبر(354):

ایک شخص کے دو بیٹے ہوں،ان کی شادی کرانے کے لیے اور حق مہر میں دینے کے لیے انہوں نے ان کے

(۱)الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،باب في تفسيرها وصفتها:۱/۱۷۳

لیے سونا خریدا ہو اور اپنے بیٹوں کی ملکیت میں بھی دے دیا ہو۔ سونا خریدے ہوئے چند سال گزر گئے ہوں تو اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا گھر میں موجود لڑکوں کی شادی کے لیے سونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے سونے اور چاندی کو مستقل مال کی حیثیت حاصل ہے اور یہ کسی کے استعمال میں ہوں یا نہ ہوں، ان میں بہر حال زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر والد نے اپنی اولاد کی شادی کے لیے سونا گھر میں رکھا ہوا اور وہ نصاب زکوٰۃ تک پہنچتا ہو تو حولانِ حول کے بعد اس سونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر ان بیٹوں کی ملکیت میں دیا ہو تو پھر ہر ایک کی ملکیت میں موجود سونا اگر نصاب تک پہنچتا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وفي تبر الذهب والفضة، وحليهما وأوانيهما الزكوة......ولنا أن السبب مال نام، ودليل النماء موجود، وهو الإعداد للتجارة خلقة، والدليل هو المعتبر بخلاف الثياب.(۱)

ترجمہ:

اور سونے اور چاندی کی ڈلی اور ان کے زیورات اور ان کے برتنوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔۔۔ اور احناف کی دلیل یہ ہے کہ سببِ زکوٰۃ مال نامی کا ہونا ہے اور نما کی دلیل یہاں پائی جاتی ہے، یعنی اس کا خلقی طور پر تجارت کے واسطے مہیا اور متعین ہونا ہے اور دلیل ہی معتبر ہوتی ہے، بخلاف کپڑوں کے۔

الزكوة واجبة على الحر، العاقل، البالغ، المسلم إذا ملك نصاباً ملكاً تاماً وحال عليه الحول.(۲)

ترجمہ:

اور زکوٰۃ آزاد، عاقل، بالغ مسلمان پر واجب ہے، جب کہ وہ ملکِ تام کے طور پر مالکِ نصاب ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے۔

❁❁❁

(۱) الهداية، كتاب الزكوة، فصل في الذهب: ۱/۲۱۱، ۲۱۲

(۲) الهداية، كتاب الزكوة: ۱/۲۰۵

بیس لاکھ روپے کے سامانِ تجارت اور زیورات پر زکوٰۃ

سوال نمبر(355):

ایک شخص تین دکانوں کا مالک ہو اور ان دکانوں میں 20 لاکھ روپے کا سامانِ تجارت ہو اور اس شخص کی بیوی کے پاس 15 تولے سونا ہو، جبکہ فی الحال یہ شخص تین لاکھ روپے کا قرض دار ہو اور پاس نقد رقم نہیں۔ آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو زکوٰۃ دینے کی کیا صورت ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ کسی کے پاس اتنی رقم یا سامانِ تجارت ہو جو نصاب کو پہنچتا ہو تو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لیکن اگر کہیں کوئی شخص مقروض ہو تو قرضہ کو اصل مال سے منہا کر کے بقیہ مال اگر نصاب تک پہنچتا ہو تو پھر اس مال اور سامانِ تجارت سے زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے۔ البتہ اگر مقروض شخص کے پاس سامانِ تجارت تو موجود ہو، لیکن کوئی نقد رقم موجود نہ ہو تو پھر زکوٰۃ اسی عینِ مال سے ادا کرنا بھی درست ہے یا پھر اس کی قیمت لگا کر کسی سے قرض رقم لے کر بطورِ زکوٰۃ ادا کر دے اور بعد میں قرضہ ادا کرنے کی کوشش کرے۔

رہا بیوی کے ہاں 15 تولے سونا۔ تو یہ ایک مستقل نصاب ہے۔ اگر یہ خاوند کی ملکیت ہو تو پھر اس کی زکوٰۃ خاوند کو ہی ادا کرنا ہے، ورنہ بصورت دیگر عورت کو خود ادا کرنا پڑے گا۔ نصابِ کامل ہونے کی صورت میں بطورِ زکوٰۃ ادائیگی کے لیے اگر نقد رقم موجود ہو تو نقدی بھی دی جاسکتی ہے اور مقروض ہونے کی صورت میں سونا بھی دیا جاسکتا ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومن کان علیہ دین یحیط بمالہ، فلا زکوٰۃ علیہ،وإن کان مالہ أکثرمن دینہ زکی الفاضل إذابلغ نصاباً.(۱)

ترجمہ:

اور جس شخص پر اس قدر قرضہ ہو کہ اس کے تمام مال کو محیط ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور اگر اس کا مال اس کے قرضہ سے زائد ہو تو فاضل کی زکوٰۃ ادا کرے، جب وہ نصاب کو پہنچے۔

(۱)الھدایۃ،کتاب الزکوۃ:۱/۲۰۲

بچیوں کے لیے بنائے گئے زیورات پر زکوٰۃ وقربانی

سوال نمبر(356):
اگر والد اپنی بالغ بچیوں کے لیے چار چار تولہ سونے کے زیورات بنوائے کہ پھر ان کی شادیوں کے مواقع پر انہیں دوں گا تو سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ اور قربانی کس کے ذمے لازم ہوگی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:
واضح رہے کہ اگر والد نے اپنی بالغ بچیوں کے لیے مذکورہ مقدار میں سونا خرید کر باقاعدہ طور پر ان کے حوالے نہیں کیا ہو، بلکہ ہبہ کرنے کا صرف ارادہ کیا ہو تو یہ اس کی اپنی ملکیت شمار ہوگی جس کی وجہ سے وہ مالدار ہو کر قربانی اور زکوٰۃ ادا کرے گا۔
اور اگر بچیوں کو قبضہ کرا کے ان سے واپس لے کر بطورِ حفاظت اپنے پاس رکھا ہو تو اس صورت میں یہ ان بچیوں کی ملکیت شمار ہوگی، لہٰذا اگر ان کے پاس اس مذکورہ سونے کے علاوہ کچھ نقدی بھی ہو یا کسی مقدار میں چاندی ہو جن کو ملا کر نصاب پورا ہو سکتا ہو تو یہ بچیاں مالکِ نصاب ہو کر ان پر الگ الگ قربانی اور زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر نصاب سے کم ہو تو پھر زکوٰۃ اور قربانی واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:
(وركنها):هو(الإيجاب والقبول)..........(وتتم)الهبة(بالقبض)الكامل.(١)
ترجمہ: اور ہبہ کا رکن ایجاب اور قبول ہے۔۔۔۔۔اور ہبہ قبضہ کامل کے ساتھ تام ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

سونے کی قیمت کا اعتبار

سوال نمبر(357):
ایک عورت کے پاس پانچ تولے سونے کے علاوہ کچھ مال نہیں۔سونے کی موجودہ مقدار تو نصابِ زکوٰۃ تک

(١)الدرالمختار على صدر ردالمحتار،كتاب الهبة:٨/ ٤٩٠، ٤٩٣

نہیں پہنچتی، لیکن سونے کی مروجہ قیمت کے اعتبار سے اتنی قیمت ضرور ہے کہ جو چاندی کے نصاب تک پہنچتی ہے۔یوں سونے کی قیمت کا اندازہ اگر کیا جائے تو یہ عورت صاحب نصاب بن سکتی ہے۔کیا یہ عورت صاحب نصاب شمار ہوگی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

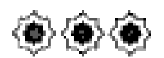
زکوٰۃ کے باب میں سونا، چاندی کا نصاب شریعت میں مقرر ہے۔سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے ہے۔جب کہ چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے ہے۔جب کسی کے پاس صرف سونا یا صرف چاندی ہو اور نصاب سے کم ہو تو اس میں قیمت کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ نصاب کی رعایت ہوگی، لہٰذا پانچ تولے سونا چونکہ نصاب سے کم ہے اس لیے یہ عورت صاحب نصاب شمار نہ ہوگی اور اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ومنها كون المال نصاباً،فلاتجب في أقل منه.(۱)

ترجمہ:

وجوب زکوٰۃ کے شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مال نصاب کے برابر ہو۔پس نصاب سے کم مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔



سونا بطورِ زکوٰۃ دینا

سوال نمبر(358):

نقد رقم کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت کسی مستحق زکوٰۃ کو رقم دینے کی بجائے حق مہر ادا کرنے کے لیے زیورات بنوا دیں تو اس سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

---

(۱) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة:۱/۱۷۲

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ میں اہم فریضہ کی ادائیگی، رضائے الٰہی اور غربا و مساکین کے ساتھ تعاون کا راز بھی مضمر ہے۔ اس لیے غربا کے لیے جو طریقہ زیادہ مفید و نفع مند ہو، فقہائے کرام نے اس کو افضل قرار دیا ہے۔ تاہم فقیر کی حاجت و ضرورت کو دیکھ کر اتنی زکوٰۃ دی جائے جس سے ضرورت پوری ہو کر نصاب تک نہ پہنچے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں کسی غریب کو اس کی حالت و ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر مالی زکوٰۃ دینا یا اس مال سے سونا بنوا کر دینا صحیح ہوگا، لیکن واضح رہے کہ دیتے وقت نیتِ زکوٰۃ پیوستہ ہو اور تملیک کرانا بھی شرط ہے۔ اگر کہیں زکوٰۃ لینے والا صاحبِ نصاب ہو تو پھر زکوٰۃ دینا صحیح نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من ذلك، وإن كان صحيحاً مكتسباً؛ لأنه فقير، والفقراء هم المصارف، ولأن حقيقة الحاجة لا يوقف عليها، فأدير الحكم على دليلها وهو فقد النصاب، ويكره أن يدفع إلى واحد مائتي درهم فصاعداً، وإن دفع جاز.(۱)

ترجمہ: اور ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، جو اس (نصاب) سے کم کا مالک ہو، اگرچہ وہ شخص تندرست، کمانے والا ہو، کیوں کہ وہ فقیر ہے اور فقرا ہی زکوٰۃ کے مصارف ہیں اور اس لیے کہ حقیقی محتاجی پر تو مطلع ہو نہیں سکتا، اس وجہ سے حکم اس کی دلیل پر دائر کیا گیا ہے اور وہ نصاب کا مفقود ہونا ہے۔ اور ایک شخص کو دو سو دراہم (نصاب کے بقدر) یا زیادہ دینا مکروہ ہے، اگر دے دیے تو جائز ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

المال الذي تجب فيه الزكوة إن أدى زكوته من خلاف جنسه، أدى قدر قيمة الواجب إجماعاً...... ويجوز دفع القيم في الزكوة عندنا.(۲)

ترجمہ: جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اگر اس کی زکوٰۃ اس جنس کے علاوہ سے دے تو بالاجماع حکم یہ ہے کہ واجب کی قیمت کے بقدر ادا کرے۔۔۔۔۔ اور ہمارے ہاں زکوٰۃ میں قیمت دینا جائز ہے۔

---

(۱) الهداية، كتاب الزكوة، باب من يجوز دفع الصدقات إليه ومن لا يجوز: ۱/ ۲۲٤

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الفصل الثاني في العروض: ۱/ ۱۸۰-۱۸۱

نصاب سے کم سونے، چاندی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(359):

کسی گھر میں بعض خواتین کے پاس مقدارِ نصاب سونا ہو اور بعض کے ہاں مقدارِ نصاب سے کم ہو، لیکن ان کے ہاں کپڑے کافی مقدار میں موجود ہوں اور گھر کا خرچہ مشترکہ طور پر ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ بھی مشترکہ طور پر ادا کی جاتی ہو تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ جن خواتین کے پاس نصاب سے کم سونا موجود ہے اور ان کے ہاں کپڑے بھی ہیں، ان پر بھی زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے وجوبِ زکوٰۃ کے من جملہ دیگر شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ نصاب کامل ہو، یعنی ساڑھے سات تولے سونا، ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے بقدر نقدی یا مالِ تجارت جس کی قیمت یہ ہو۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کہیں سونے کا نصاب مکمل نہ ہو اور ضرورت سے زائد سامان (جس میں ضرورت کے علاوہ دیگر کپڑے بھی شامل ہیں) ملا کر نصاب تک پہنچ جائے تو اگرچہ اتنی مقدار سے اغنیا کی فہرست میں شمار ہو کر زکوٰۃ لینے کا استحقاق باقی نہیں رہے گا، تاہم زائد از ضرورت سامان میں نیتِ تجارت نہ ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ ہاں اس صورت میں قربانی اور صدقۂ فطر واجب رہیں گے اور نصاب ہی مکمل نہ ہو تو پھر صدقاتِ واجبہ ساقط ہو کر زکوٰۃ لینے کا استحقاق باقی رہے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

من له متاع فاضل عن حاجته الأصلية مقدار مايساوي مائتي درهم إلا أنه ليس للتجارة، فإنه لا يحل له أخذالزكوة ،ولاتجب عليه الزكوة وتجب عليه الأضحية وصدقة الفطر.(۱)

ترجمہ:

جس کے پاس حاجتِ اصلیہ سے زائد اتنی مقدار میں سامان ہو جو کہ دو سو درہم کے برابر ہو، جبکہ وہ تجارت کے واسطے بھی نہ ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ کی رقم لینا جائز نہیں اور نہ ہی اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہے۔

(۱) الفتاوی التاتارخانية، كتاب الزكوة، فصل في المسائل المتعلقة...: ۲/ ۲۰۸

مخلوط سونے اور چاندی پر زکوۃ

سوال نمبر(360):

کوئی آدمی اپنی شادی کے موقع پر دلہن کو حق مہر میں بیس تولے سونا خرید کر دے، لیکن بعد میں معلوم ہو جائے کہ یہ تو خالص سونا نہیں، بلکہ اس کے ساتھ زیادہ تر چاندی ملی ہوئی ہے تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب اس کی ادائیگی زکوٰۃ کا کیا طریقہ کار ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مقدسہ میں ادائیگی زکوٰۃ کے لیے سونا، چاندی دونوں کے واسطے الگ الگ نصاب مقرر ہیں۔اس مفروضہ نصاب کی رعایت کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، لیکن اگر کہیں سونا، چاندی مخلوط ہوں تو اگر سونا اپنے نصاب ساڑھے سات تولے تک پہنچ رہا ہو تو سونے کے نصاب کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے گی۔اگر سونے کا نصاب مکمل نہ ہوتا ہو اور چاندی اپنے نصاب ساڑھے باون تولہ کو پہنچ رہی ہو تو پھر زکوۃ چاندی کے نصاب سے ادا کی جائے گی، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ چاندی غالب ہو، البتہ اگر سونا غالب اور چاندی مغلوب ہو تو ایسی صورت میں تمام مخلوط سونا، چاندی دونوں سونا ہی شمار ہوگا اور اسی سے زکوٰۃ کی ادائیگی ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

والذهب المخلوط بالفضة إن بلغ الذهب نصابه ففيه زكوٰة الذهب،وإن بلغت الفضة نصابهافزكوة الفضة،لكن إن كانت الغلبة للفضة، أما إن كانت مغلوبة،فهو كله ذهب؛لأنه أعزوأغلى قيمة.(۱)

ترجمہ:

جو سونا چاندی کے ساتھ مخلوط ہو اگر سونا نصاب کے بقدر ہو تو زکوٰۃ سونے کے اعتبار سے ادا کی جائے گی اور اگر چاندی اپنے نصاب کے بقدر ہو تو زکوۃ چاندی کے اعتبار سے ادا کی جائے گی یہ تب ہے جب چاندی (سونے پر) غالب ہو۔لیکن اگر کہیں غلبہ سونے کو ہو تو وہ تمام سونا شمار ہوگا، کیوں کہ سونا شرف والا اور قیمتی ہوا کرتا ہے۔

❁❁❁

(۱) فتح القدیر، کتاب الزکوۃ:۲/۱۶۲

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے مستحق کو زکوٰۃ کی تصریح کرنے کی حیثیت

سوال نمبر(361):

ایک رشتہ دار کی غربت اور فقر یقینی ہو، لیکن خودداری کی وجہ سے وہ کسی سے زکوٰۃ کی رقم لینا گوارا نہیں کرتا اور اس کے بچوں کی حالت بھی قابلِ رحم ہو۔ایسی صورت میں اس کو یہ بتائے بغیر کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے،قبول کریں،کوئی رقم دی جائے تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

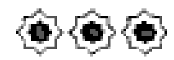
الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ کی صحتِ ادائیگی کے لیے زکوٰۃ دہندہ کی نیت کا اعتبار ہے،اگر رشتہ دار واقعی زکوٰۃ کا مصرف ہو،یعنی ضرورت سے زائد ساڑھے باون تولے چاندی کی مروجہ قیمت کی مالیت اس کے پاس نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے،اس میں زکوٰۃ کی تصریح کی ضرورت نہیں، بلکہ بعض فقہاے کرام کے نزدیک اگر ہدیہ کا نام رکھ کر زکوٰۃ کی نیت کر کے زکوٰۃ دی جائے تو ادا ہو جاتی ہے۔تاہم مدارس کو زکوٰۃ دیتے وقت زکوٰۃ کی تصریح ضروری ہے، تاکہ مدارس صدقاتِ واجبہ کی مد میں خرچ کرسکیں۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ومن أعطى مسكيناًدراهم وسماهاهبةً،أو قرضاًونوى الزكوة، فإنها تجزيه، وهو الأصح.(١)

ترجمہ: جس نے کسی مسکین کو کچھ روپے دیتے وقت یہ کہا کہ ہبہ ہے یا قرض ہے اور اس نے دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کی تو یہ جائز ہے۔



زکوٰۃ کسی کو بطورِ ہدیہ دینا

سوال نمبر(362):

اگر کسی نے اپنے مال کی زکوٰۃ بطورِ ہدیہ دے دیا تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

(١)الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة،باب في تفسيرهاوصفتها:١٧١/١

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ زکوٰۃ ادا کرتے وقت یا مالِ زکوٰۃ علاحدہ کرتے وقت زکوٰۃ کی نیت ضروری ہے، لہٰذا اگر زکوٰۃ ادا کرنے والے نے زکوٰۃ کی رقم بطورِ ہدیہ کسی کو دے دی تو اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی جب تک زکوٰۃ کی نیت نہ ہو۔

ہاں اگر مزکی، زکوٰۃ لینے والے کو زکوٰۃ کی رقم بنام ہدیہ دے جبکہ خود زکوٰۃ کی نیت کرے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، تاہم اس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کو یقین ہو کہ زکوٰۃ لینے والا واقعی مستحق زکوٰۃ ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ومن أعطى مسكينادراهم،وسماهاهبة،أوقرضاً، ونوى الزكوة ،فإنها تجزيه ،وهو الأصح .(١)

ترجمہ:

اگر کسی شخص نے کسی مسکین کو کچھ دراہم ہبہ یا قرض کے طور پر دیے اور زکوٰۃ کی نیت کی تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کفایت کر جائے گا اور یہی حکم زیادہ صحیح ہے۔

❁❁❁

مستحق کے انتظار میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر

سوال نمبر(363):

ایک شخص پر زکوٰۃ فرض ہو چکی ہو تو فوراً ادا کرے یا مستحق کے انتظار میں زکوٰۃ مؤخر کر سکتا ہے، یعنی زکوٰۃ فرض ہوجانے کے بعد اگر چار، پانچ مہینے یا اس سے بھی زیادہ وقت ادا کرنے میں لگ جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے جب زکوٰۃ فرض ہوجائے تو اس کی فوری طور پر ادائیگی مستحب اور بہتر ہے، تاہم اگر کہیں عذر کی بنا پر زکوٰۃ تاخیر کے ساتھ ادا کی جائے تو یہ بھی درست ہے اور زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق مستحق زکوٰۃ کے لیے انتظار کو بھی عذر میں شمار کیا جاسکتا ہے اس بنا پر اگر زکوٰۃ کی ادائیگی تاخیر کے ساتھ کی جائے تو بھی جائز ہے۔

---

(١)الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة،الباب الأول في تفسيرهاوصفتها:١/١٧١

والدّلیل علیٰ ذلک:

وتجب على الفورعندتمام الحول ،حتى يأثم بتأخيره من غيرعذر، وفي رواية الرازي: على التراخي حتى يأثم عندالموت،والأول أصح.(١)

ترجمہ: جب نصاب پرسال پورا ہوجائے توزکوۃ فوراًواجب ہوجاتی ہے،حتیٰ کہ اگرکسی عذر کے بغیرزکوۃ کی ادائیگی میں تاخیرکردے توگناہ گار ہوگااوررازیؒ کی روایت کے مطابق زکوٰۃ کا واجب ہونا تاخیر سے ہے،حتیٰ کہ اگرادانہ کی تو موت کے وقت گناہ گارقرار پائے گاپہلاقول زیادہ صحیح ہے۔

❁❁❁

زکوٰۃ کی جگہ ٹیکس ادا کرنا

سوال نمبر(364):

اگرکوئی شخص صاحبِ نصاب ہواوروہ یہ کہتا ہو کہ مجھے زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ حکومتی ٹیکس ادا کرنا کافی ہےتواس کایہ کہنا کہاں تک دُرست ہے؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

واضح رہے کہ زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ایک رُکن ہے۔شریعت نے اس کے لیے شرائط اورمصارف کاتعین کیاہےاورحکومت عوام سے ٹیکس اُس فائدے کے عوض لیتی ہے جوفائدہ حکومت عوام کوفراہم کرتی ہےاور یہ ٹیکس حکومت ملکی اداروں کوچلانے میں صرف کرتی ہے،اس میں عبادت کا کوئی تصورنہیں پایاجاتا۔

لہٰذااگرکوئی شخص حکومت کومختلف مدّات میں ٹیکس ادا کرے توایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے اس کا ذمہ فارغ نہیں ہوگا، بلکہ اس شخص کومستقل زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

الزكوة واجبة على الحرّ العاقل،البالغ،المسلم إذاملك نصاباًملكاًتامًا، و حال عليه الحول .(٢)

(١)الفتاوى الهندية،كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرهاوصفتها:١/ ١٧٠

(٢)الهداية،كتاب الزكوة:١/ ٢٠٠

ترجمہ:

زکوٰۃ ہر آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان پر واجب ہے، جب وہ نصاب کا ملکِ تام کے طور پر مالک ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے۔

هي تمليك مال مخصوص لشخص مخصوص. قال الطحاوي: وهو ربع عشر النصاب، أو مايقوم مقامه من صدقات السوائم.(۱)

ترجمہ:

مخصوص مال کا کسی مخصوص شخص کو مالک بنانے کا نام زکوٰۃ ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ: ''مخصوص مال سے مراد نصاب کا چالیسواں حصہ ہے یا چرنے والے جانوروں میں سے اس نصاب کا قائم مقام ہے''۔

❁❁❁

حکومتی ٹیکس سے بچنے کے لیے بیٹوں کے نام بینک میں رکھی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ

سوال نمبر(365):

ایک شخص نے حکومتی ٹیکسوں سے بچنے کی خاطر بیٹوں کے نام پر بینک میں رقوم جمع کروائی ہیں۔ ایسی صورت میں سال گزرنے پر زکوٰۃ کی ادائیگی کس کے ذمہ واجب ہے؟ نیز اگر بیٹا باپ کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ ادا کرے تو یہ زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

بینوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے ایک شرط ملکِ تام کا ہونا ہے جہاں کہیں ملکیت موجود نہ ہو تو غیر کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں جب باپ نے بیٹے کے نام پر اکاؤنٹ کھول کر اس میں رقم جمع کر لی ہے اور اس کا مقصود صرف حکومتی اداروں کے ٹیکسوں سے بچنا ہے اور باضابطہ طور پر بیٹے کو مالک بنانا مقصود نہیں تو ایسی صورت میں یہ مال باپ کی ملکیت متصور ہوگی اور اس مال کی زکوٰۃ باپ کے ذمہ لازم ہوگی، البتہ اگر بیٹا باپ کی اجازت کی بغیر زکوٰۃ ادا

(۱) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، كتاب الزكوة، ص:۵۸۷

کرے اور باپ اس ادائیگی کے بعد اجازت دے تو اگر مال ابھی تک فقیر کے پاس موجود ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح رہے گی، ورنہ باپ کا ذمہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے فارغ نہیں ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها الملك التّام) وهو مااجتمع فيه الملك واليد.(١)

ترجمہ:

زکوٰۃ کے واجب ہونے کی شرطوں میں ایک شرط ملکِ تام کا ہونا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ملکیّت بھی ہو اور قبضہ بھی ہو۔

رجل أدّیٰ زکوٰة غيره عن مال ذلك الغير فأجازه المالك فإن كان المال قائمًا في يد الفقير جاز وإلّا فلا.(٢)

ترجمہ:

کسی شخص نے کسی اور آدمی کی طرف سے اسی آدمی کے مال سے زکوٰۃ ادا کر دی، پھر مالک نے اجازت دے دی تو اگر (اجازت کے وقت) وہ مالِ زکوٰۃ غریب کے پاس موجود ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

۞۞۞

سال گزرنے کا اعتبار کب سے ہوگا؟

سوال نمبر(366):

خالد کی شادی 27 دسمبر 2007ء کو ہوئی۔ خالد نے بیوی کو حقِ مہر میں پانچ تولہ سونا دیا تھا، تقریباً تین مہینے قبل خالد کی بیوی نے تین تولہ سونا مزید خرید لیا۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس سونے پر زکوٰۃ کی ادائیگی کب سے واجب ہوگی؟

بیّنوا توٴجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اگر کسی شخص کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ

(١) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها......: ١٧٢/١

(٢) الفتاوی الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها......: ١٧١/١

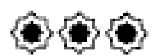
چاندی ہوتو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، تاہم اگر کسی کی ملکیت میں سونا یا چاندی مطلوبہ مقدار تک نہ پہنچتا ہوتو ایسی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

صورتِ مسؤلہ میں جب خالد نے اپنی بیوی کو تقریباً ڈیڑھ سال قبل حقِ مہر میں پانچ تولہ سونا دیا تھا تو وہ مقدار نصاب سے کم ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں تھی، اب چونکہ اس عورت نے مزید تین تولہ سونا خرید لیا ہے اور سونے کی مقدار آٹھ تولہ ہوگئی ہے جو مطلوبہ مقدار سے زائد ہے تو ایسی صورت میں اس مقدار پر ملکیت آنے کے ایک سال بعد زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(الزکوۃ واجبة علی الحرّ العاقل، البالغ، المسلم إذا ملك نصاباً ملكاً تامًا، و حال علیه الحول) ...... وقدرها الشرع بالحول لقوله ﷺ:" لا زکوۃ في مال حتیٰ یحول علیه الحول".(۱)

ترجمہ: زکوٰۃ ہر آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان پر واجب ہے، ملکِ تام کے طور پر جب نصاب کا مالک ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے اور شریعت نے اس پر سال گزرنے کو حضور ﷺ کے اس قول کی وجہ سے مقرر کیا کہ:''کسی مال میں زکوٰۃ واجب نہیں یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے''۔



بھیجے ہوئے ڈرافٹ پر زکوٰۃ

سوال نمبر(367):

ہم کاروبار کے سلسلے میں مختلف کمپنیوں سے مال منگواتے ہیں اور قیمت کی ادائیگی بذریعہ ڈرافٹ کی جاتی ہے، جس کی مالیت مختلف اوقات میں مختلف ہوا کرتی ہے، البتہ ایک لاکھ سے کم نہیں ہوتی۔ پوچھنا یہ ہے کہ ڈرافٹ کی رقم پر زکوٰۃ دینے کا کیا طریقہ ہوگا؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

سامانِ تجارت پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے، جب اس کی مالیت نصاب تک پہنچ جائے اور سال کے آخر

(۱) الهدایة، کتاب الزکوۃ:۱/ ۲۰۰، ۲۰۱

میں ملکیتِ تامہ ہو، تاہم اگر مال کا کچھ حصہ خرچ کیا جائے تو خرچ شدہ مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ اس پر ملکیت باقی نہیں رہی، لہٰذا جو رقم ڈرافٹ کے ذریعے مختلف کمپنیوں کو اشیا کے عوض بھیجی جائے، اس پر ملکیت ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها الملك التّام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد.(۱)

ترجمہ:

زکوٰۃ کے واجب ہونے کی شرطوں میں ایک شرط یہ ملکِ تام کا ہونا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور قبضہ بھی ہو۔

❁❁❁

کرایہ کے مکان کی آمدنی پر زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر (368):

زید نے اپنی رہائش کے لیے ایک گھر تعمیر کیا، لیکن جگہ مناسب نہ ہونے کی وجہ سے زید نے اس گھر میں رہائش ترک کردی اور اس گھر کو کرایہ پر دے دیا، جس کی ماہانہ آمدنی بیالیس ہزار روپے بنتی ہے اور اپنی رہائش کے لیے دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا، جس کا ماہانہ کرایہ دس ہزار روپے ہے۔ سوال یہ ہے کہ زید کے گھر کی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جو اشیا کرایہ پر دی جائیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ ان سے حاصل شدہ آمدنی اگر نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس آمدنی میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں زید کے مکان سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، اُس آمدنی سے زید کی ضروریات میں خرچ شدہ رقم منہا کرکے باقی آمدنی اگر نصاب تک پہنچے اور اس پر سال گزر جائے تو پھر اس آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

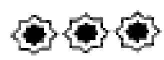
(۱) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها.....: ۱/۱۷۲

والدّلیل علیٰ ذلک:

ولواشتری قدورًامن صفریمسکھاویؤاجرھا،لاتجب فیھاالزکوۃ کمالاتجب فی بیوت الغلۃ.(۱)

ترجمہ:

اگرکوئی شخص کانسی کی دیگچیاں خریدکرکرایہ پردے دےتوان دیگچیوں پرزکوٰۃ واجب نہیں،جیساکہ کرائے پر دیے گئےگھروں پرزکوٰۃ لازم نہیں۔



ذاتی کتب خانہ کی کتابوں پرزکوٰۃ دینا

سوال نمبر(369):

اگرکسی شخص کے پاس ذاتی کتب خانہ ہواوروہ اس سے استفادہ نہیں کرسکتا توایسے شخص پرزکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے یانہیں؟ نیزیہ شخص زکوٰۃ لےسکتاہے یانہیں؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

مال پرزکوٰۃ کی ادائیگی کےوجوب کےلیے دیگرشرائط کےعلاوہ مال کاحاجتِ اصلیہ سےزائدہونابھی ہے۔ اگرکسی کے پاس ذاتی کتب خانہ ہواوراس کوکتابوں کی ضرورت بھی ہو(اگرچہ یہ حاجت کبھی کبھارہو)تو یہ کتب اس کے حوائج اصلیہ میں شمارہوں گے،البتہ اگرکسی کے پاس ایسی کتابیں ہوں جن کی طرف اس کی احتیاج نہ ہواوریہ کتب تجارت کی نیت سے نہ ہوں توان کتابوں پرزکوٰۃ واجب نہیں،تاہم اگراُن کتابوں (جن کی طرف احتیاج نہ ہو) کی مالیت علاحدہ طورپریادوسرےزائدسامان کےساتھ مل کرساڑھےباون تولہ چاندی تک پہنچتی ہوتوایسےشخص پرصدقہ فطرو قربانی واجب ہےاورایسےشخص کےلیےزکوٰۃ لیناجائزنہیں،کیوں کہ وہ بہرحال نصاب کامالک ہے،اگرچہ نامی نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ولافي ثیاب البدن)..........وکذا الکتب، وإن لم تکن لأھلھا إذالم تنوللتجارۃ، غیرأن الأھل له أخذ الزکاۃ، وإن ساوت نصبًا إلّا أن تکون غیر فقہ وحدیث وتفسیر،أوتزیدعلی نسختین منھا، ھو

(۱) الفتاوی الھندیۃ،کتاب الزکوۃ،الباب الثالث في زکوۃ الذھب والفضۃ والعروض:۱/۱۸۰

المختار...... وأما غیر الأهل، فإنهم یحرمون بالکتب من أخذ الزکاة.(۱)

ترجمہ: (اور بدن کے کپڑوں پر زکوٰۃ واجب نہیں) اسی طرح کتابوں پر بھی زکوٰۃ نہیں، اگرچہ وہ غیر اہل کی ہوں، جب تجارت کی نیت سے نہ ہوں، البتہ اہل شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے، اگرچہ کئی نصابوں کے برابر ہو، مگر کوئی کتاب ایسی ہو جو فقہ، حدیث یا تفسیر کی نہ ہو یا مختار قول کے مطابق دو نسخوں سے زائد ہوں۔۔۔۔۔اور غیر اہل کے پاس ہوں تو وہ زکوٰۃ لینے سے محروم ہوں گے۔

❁❁❁

قرض میں دیے گئے مال پر زکوٰۃ

سوال نمبر(370):

ایک شخص نے کسی کو تیس ہزار روپے قرض دیے۔مقروض نے دو سال بعد صرف دس ہزار روپے واپس کر دیے۔اس شخص پر مقروضہ رقم کی زکوٰۃ لازم ہے یا صرف وصول شدہ رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی شخص کسی کو رقم قرض کے طور پر دے دے یا مال تجارت فروخت کرنے سے جو رقم مدیون کے ذمے لازم ہوتی ہے تو وہ دین قوی کہلاتی ہے۔

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اس قسم کے دَین پر جب سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوتی ہے، تاہم ادائیگی کا تعلق وصولی کے ساتھ ہے، یعنی جب زکوٰۃ کے رقم میں سے نصاب کا پانچواں حصہ (یعنی چالیس درہم کے بقدر) وصول ہو جائے تو اس وقت وصول شدہ رقم کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں مالک پر پوری رقم کی زکوٰۃ لازم ہے، البتہ جب اس نے دس ہزار روپے پر قبضہ کر لیا تو ان ہی دس ہزار میں زکوٰۃ ادا کرے اور باقی بیس ہزار روپے کی زکوٰۃ وصولی کے بعد ادا کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

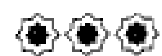
ففي الدین القوي لایلزمه الأداء مالم یقبض أربعین درهمًا، فإذا قبض هذا المقدار أدّی درهمًا،

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، مطلب في زکوۃ ثمن المبیع وفاءً: ۱۸۲/۳، ۱۸۳

وكذلك كلّما قبض أربعين درهمًا.(١)

ترجمہ:

دَینِ قوی میں جب تک چالیس درہم (یعنی نصاب کا پانچواں حصہ) قبضہ نہ کیے ہوں زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں۔ جب یہ مقدار قبضہ کرے گا تو ایک درہم ادا کرے گا اور اسی طرح جب بھی چالیس درہم قبضہ کرے گا تو یہی طریقہ اختیار کرے گا۔



رہن میں رکھی گئی رقم پر زکوٰۃ کا وجوب

سوال نمبر (371):

ایک شخص نے اپنی دُکان کسی کو کرایہ پر دی ہے اور اُس شخص سے دو لاکھ روپے پیشگی وصول کیے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان دو لاکھ روپوں پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کس کے ذمہ لازم ہوگی؟

بيّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

اگر کسی نے دُکان کرایہ پر لیتے وقت کچھ رقم بطورِ پیشگی مالکِ دُکان کو ضمانت کے طور پر دی ہو تو عقدِ اجارہ کے اختتام پر وہ رقم مالک کو واپس کر دی جاتی ہے، یہ رقم رہن کے حکم میں ہے، جس سے مالکِ دُکان استفادہ نہیں کر سکتا۔

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق اس مال کو مالِ مرہونہ کی حیثیت حاصل ہے اور مالِ مرہونہ کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہے اور نہ مرتہن پر، لہٰذا پیشگی میں رکھی ہوئی رقم کی زکوٰۃ نہ مالکِ دُکان پر واجب ہے اور نہ اصل مالک پر۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

(ولا في مرهونٍ) أي لاعلى المرتهن لعدم ملك الرقبة، ولاعلى الراهن لعدم اليد.(٢)

ترجمہ: اور رہن میں رکھی ہوئی چیز (پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں) یعنی نہ مرتہن پر زکوٰۃ ہے ملکِ رقبہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے راہن پر بھی واجب نہیں ہے۔

(١) السرخسي، المبسوط، كتاب الزكوة، باب زكوة المال: ١٩٥/٢، دارالكتب العلمية، بيروت

(٢) ردالمحتارعلى الدرالمختار، كتاب الزكوة، مطلب: في زكوة ثمن البيع وفاءً: ١٨٠/٣

مال ہلاک ہونے کی صورت میں زکوٰۃ

سوال نمبر(372):

خالد کے پاس نصاب کے بقدر مال موجود تھا اور اس پر سال گزر گیا۔سال گزرنے کے بعد اس نے دو مہینے تک زکوٰۃ ادا نہیں کی۔دو مہینے کے بعد خالد سے پورا مال ہلاک ہو گیا۔کیا ایسی صورت میں اس سال کی زکوٰۃ ساقط ہو گی؟

بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

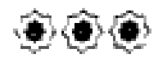
شرعی نقطہ نظر سے ہر صاحب نصاب پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہو جاتی ہے،البتہ اگر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی سے پہلے پورا مال ہلاک ہو جائے تو ایسی صورت میں اس شخص سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر سائل کا پورا مال ہلاک ہو گیا ہو تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہو گی،البتہ استہلاک (قصداً ہلاک کرنے) کی صورت میں اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہو گی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

وإن هلك المال بعد وجوب الزكاة، سقطت الزكاة، وفي هلاك البعض يسقط بقدره،ولو استهلك النصاب لا يسقط.(۱)

ترجمہ: اگر زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بعد مال ہلاک ہو گیا تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور بعض مال ہلاک ہونے کی صورت میں اسی مقدار کی زکوٰۃ ساقط ہو گی اور اگر نصاب کو قصداً اہلاک کیا تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہو گی۔



میت کے ترکہ پر زکوٰۃ

سوال نمبر(373):

ایک شخص کے پاس تقریباً پانچ لاکھ روپے موجود تھے۔ابھی اس پر سال نہیں گزرا تھا کہ وہ شخص فوت ہوا۔اس کے ورثا میں پانچ بیٹے تھے۔پوچھنا یہ ہے کہ رقم کو بیٹوں میں تقسیم کرنے کے بعد ان پانچ لاکھ روپے کی زکوٰۃ کی مدت

(۱) الفتاوی الهندية،كتاب الزكوة،الباب الثالث في زكوة الذهب والفضة والعروض،مسائل شتى:۱/ ۱۸۰

کب سے شمار ہوگی؟ میت کی ملکیت میں آنے کے بعد سال گزرنے کا اعتبار ہوگا یا ہر بیٹے کو جس دن حصہ ملا ہے، اُس دن سے سال شمار ہوگا؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

شریعتِ مطہرہ کی رُو سے جب کسی شخص کو نصاب کے بقدر مال پر ملک تام حاصل ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے تو ایسی صورت میں اس شخص پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہوگی۔ صورتِ مسئولہ میں جب میت کا ترکہ میت کے بیٹوں میں تقسیم ہوگیا تو اُس ترکہ پر ملک آنے کے بعد یہ مال بیٹوں کا شمار ہوگا اور زکوٰۃ کے سلسلے میں سال کا اعتبار اُس دن سے ہوگا، جس دن بیٹوں کی ملکیت اس پر آئی ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(ومنها الملك التام)وهو ما اجتمع الملك واليد.(۱)

ترجمہ: (زکوٰۃ کی شرائط میں سے ملک تام کا ہونا ہے) اور ملک تام وہ ہے جس میں ملک اور قبضہ دونوں جمع ہو جائیں۔

❁❁❁

جس مال کے ملنے کی اُمید نہ ہو اس پر زکوٰۃ

سوال نمبر(374):

ایک شخص کی ملکیت میں نصاب کے بقدر مال ہے، لیکن وہ مال کسی نے غصب کیا ہے یا کسی کو قرض دیا ہے اور قرض دار قرض کا منکر ہو، ایسے مال پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مالِ ضمار پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی۔ مالِ ضمار اس مال کو کہا جاتا ہے، جس پر مالک کا ملک قائم ہو، لیکن اس کے باوجود مالک اس سے انتفاع پر قادر نہ ہو۔

مالِ مغصوب بھی مالِ ضمار کے حکم میں شامل ہے، اس لیے مغصوب منہ (مالک) پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی،

---

(۱) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها............:۱/۱۷۲

الّا یہ کہ وصول ہونے کے بعد اس پر سال گزر جائے۔قرض کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر قرض دار قرض سے بالکل منکر ہو تو ایسی قرض بھی مالِ ضمار میں داخل ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، تاہم اگر مقروض قرض مال کا اقرار کرتا ہو، چاہے وہ مالدار ہو یا غریب، تو ایسے قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی اصل مالک پر لازم ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

فلاتجب الزکوۃ في المال الضمار عندنا......وتفسیرمال الضمار:هو کل مال غیرمقدورالانتفاع به مع قیام أصل الملك.(۱)

ترجمہ: ہمارے ہاں مالِ ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں۔۔۔مالِ ضمار ہر وہ مال ہے جس پر ملکیت ثابت ہو، مگر اس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو۔

(ولافي مال مفقود ومغصوب لا بیّنة علیه ودَین) کان (جحده المدیون سنین) ولا بیّنة له علیه. وقبیل هذه العبارة: فلوله بیّنة تجب لما مضی.(۲)

ترجمہ: اور نہ اُس مال پر زکوٰۃ واجب ہے، جو مفقود یعنی گم ہو چکا ہو اور نہ اُس مال پر جس کو غصب کیا گیا ہو اور اُس پر کوئی گواہ موجود نہ ہو اور نہ اُس قرض پر جس کا قرض دار مدتوں سے انکار کر رہا ہو اور اس کے پاس کوئی گواہ نہ ہو، اگر گواہ ہو تو پھر اس پچھلے سالوں کی زکوٰۃ واجب ہے۔

❁❁❁

سامانِ تجارت پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ

سوال نمبر(375):

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک میڈیکل سٹور کا مالک ہے، اس پر سال گزر چکا ہے، اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے؟ بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

مالِ تجارت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو اور اس پر سال گزر جائے تو

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الزکوۃ، فصل الشرائط التي ترجع إلی المال: ۲/ ۳۰۹

(۲) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوۃ: ۳/ ۱۸۳، ۱۸۴

اس مال میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔صورتِ مسئولہ میں اگر میڈیسن دُکان میں موجود مالِ تجارت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے۔

واضح رہے کہ سامانِ تجارت کی مالیت کا پورا سال بقدرِ نصاب باقی رہنا شرط نہیں، بلکہ سال کی ابتدا اور انتہا میں اگر اس کی مالیت بقدرِ نصاب ہو تو زکوٰۃ لازم ہوگی۔جس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ اس سارے مال کی بازار میں قیمتِ فروخت کا اندازہ کر کے چالیسواں حصہ بطورِ زکوٰۃ فقرا اور مساکین کو دیا جائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله:(وفي عروض تجارة بلغت نصاب ورق،أو ذهب) معطوف على قوله "في مائتي درهم" أي يجب ربع العشر في عروض التجارة إذابلغت نصابًا.(١)

ترجمہ: اور مصنف کا قول (وفي عروض تجارة بلغت نصاب ورق،أو ذهب) یہ عطف ہے مصنف کے قول "في مائتي درهم" یعنی سامانِ تجارت جب نصاب تک پہنچ جائے تو اس میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔

❁❁❁

مالِ زکوٰۃ پر سال گزرنے کے بعد قرضہ لازم ہونے سے زکوٰۃ

سوال نمبر(376):

ایک آدمی کے پاس پچاس ہزار روپے مالیت کا سامانِ تجارت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس شخص پر کاروبار کے سلسلے میں بیس ہزار روپے کا قرضہ بھی ہے اور یہ قرض سال گزرنے کے بعد لازم ہوا ہے۔اس صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

سامانِ تجارت پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب اس کی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہو۔اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ آدمی مقروض نہ ہو، جہاں کہیں کسی پر قرضہ ہو تو وہ قرضہ وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مانع رہے گا۔

(۱) البحرالرائق، کتاب الزکوۃ،باب زکوۃ المال:۲/۳۹۸

لیکن یہ اُس وقت جب قرضہ وجوبِ زکوٰۃ سے پہلے اس پر لازم ہوا ہو، البتہ اگر وجوبِ زکوٰۃ کے بعد اس پر قرضہ لازم ہوا ہو تو پھر زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ پچاس ہزار روپے مالیت کا مالِ تجارت ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار کو پہنچتا ہے، اس لیے مذکورہ مال پر زکوٰۃ لازم ہوگی اور قرضہ چونکہ زکوٰۃ کے وجوب کے بعد آیا ہے، اس لیے قرضہ کو اصل مال سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله: (فارغ عن دين) .... وهذا إذا كان الدين في ذمته قبل وجوب الزكاة، فلو لحقه بعده لم تسقط الزكاة؛ لأنّها ثبتت في ذمته، فلايسقطها مالحق من الدين بعد ثبوتها. (۱)

ترجمہ: (جو قرض سے فارغ ہو)۔۔۔۔۔ اور یہ تب ہے، جب قرض زکوٰۃ کے وجوب سے پہلے اس کے ذمے لاحق ہو گیا ہو، اگر زکوٰۃ کے وجوب کے بعد لاحق ہو گیا ہو تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، کیوں کہ زکوٰۃ جب ذمہ پر ثابت ہو گئی تو یہ ساقط نہیں ہوگی، اُس قرض سے جو زکوٰۃ کے ثبوت کے بعد لاحق ہو گیا ہو۔

❁❁❁

مالِ تجارت میں کرایہ کی نیت کرنے پر زکوٰۃ

سوال نمبر(377):

ایک شخص نے کراکری کا سامان تجارت کے لیے خریدا، لیکن خریدنے کے بعد اُس کو کرایہ پر دے دیا اور تجارت کی نیت ختم کر دی، ایسی صورت میں ان اشیا پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جو چیز تجارت کی نیت سے خریدی جائے اور اس کی مالیت نصاب تک پہنچتی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تجارت کی نیت سے خریدی ہوئی چیز میں جب تجارت کی نیت نہ رہے تو وہ مال بھی پھر تجارت کا شمار نہیں ہوتا، اس لیے اس سے زکوٰۃ کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا۔

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوٰۃ، مطلب: الفرق بين السبب والشرط والعلة: ۳/۱۷۶

صورتِ مسئولہ میں جب سامانِ تجارت کرائے پر دے دیا تو ان اشیا سے زکوٰۃ کا وجوب ساقط ہوگا اور ان اشیا کی آمدنی اگر نصاب تک پہنچے تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

والدلیل علیٰ ذلک:

ولو اشتری الرجل دارًا، أوعبدًا للتجارة، ثمّ اجره یخرج من أن یکون للتجارة.......... لاتجب فیهاالزکوة.(۱)

ترجمہ:

اگر کسی شخص نے گھر یا غلام تجارت کے لیے خریدا اور پھر اس کو کرایہ پر دے دیا تو وہ تجارت کے اشیا میں سے نکل جاتا ہے۔۔۔۔اور ان اشیا میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

❀❀❀

زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی

سوال نمبر(378):

ہمارے گھر میں ایک ملازمہ خدمت کرتی ہے جو کہ زکوٰۃ کی مستحق ہے۔اس کی بیٹی کی شادی ہے،اس کے پاس اتنی رقم موجود نہیں کہ وہ بیٹی کی شادی کے اخراجات پورے کر سکے۔میرے پاس نصاب کے بقدر مال موجود ہے اور میں اس سال کی زکوٰۃ ادا کر چکا ہوں۔کیا میں اپنی ملازمہ کے ساتھ امداد کی غرض سے آئندہ سال کی زکوٰۃ ابھی سے ادا کر سکتا ہوں؟واضح رہے کہ وہ رقم صرف ضروریات میں خرچ ہوگی،رخصتی میں اسراف نہیں کرے گی۔

بیّنوا تؤجروا

الجواب وباللّٰہ التوفیق:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرعاً نصاب کا مالک ہونا ضروری ہے۔پھر جب تک اس نصاب پر سال نہ گزرے، اُس وقت تک اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں،تاہم اگر کوئی شخص کئی سالوں کی زکوٰۃ پیشگی ادا کرے تو اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

---

(۱) فخرالدین حسن بن منصور الأوزجندي،الفتاوی الخانیة علی هامش الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوة، فصل في مال التجارة:۱/ ۲۵۱،مکتبة رشیدیة کوئته

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل اپنے گھر کی ملازمہ کی بیٹی کی شادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے آئندہ سال کی پیشگی زکوٰۃ ادا کرلے تو ادا شدہ مقدار کے بقدر آئندہ سال کی زکوٰۃ سے اس کا ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

والدلیل علیٰ ذلك:

(ولو عجّل ذو نصاب لسنین...... صحّ) ....فلأنّه أدّی بعد سبب الوجوب.(۱)

ترجمہ:

اگر کسی صاحبِ نصاب نے کئی سالوں کی زکوٰۃ پہلے ادا کی تو یہ جائز ہے۔۔۔۔۔کیوں کہ سبب وجوب پائے جانے کے بعد اس نے زکوٰۃ ادا کی ہے۔

❁❁❁

گاڑی کی قیمت کی قسط وار وصولی پر زکوٰۃ

سوال نمبر(379):

زید گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہے۔بعض اوقات ایک گاڑی قسط وار فروخت ہوجاتی ہے اور اس کی قیمت عام قیمت سے دُگنی ہوجاتی ہے،مثلاً ۲۰ لاکھ کی گاڑی کی قیمت ۴۰ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔اب اگر کوئی گاڑی ۴۰ لاکھ پر بیچ دی جائے اور ہر ماہ ۴۰ ہزار قسط مالک کو مل جاتی ہے۔سال بعد حاصل شدہ رقم کی مقدار ۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے بنتی ہے۔پوچھنا یہ ہے کہ گاڑی کی قیمت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہوگا؟ نیز دورانِ سال جتنی رقم حاصل ہو،اس کی علاحدہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا کُل قیمت سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کسی کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس قرض کے طور پر موجود ہو اور وہ اس کا اقرار بھی کرتا ہو تو ایسی صورت میں اس مال پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ لازم ہوتی ہے،البتہ اس کی ادائیگی وصولی تک موقوف ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں جب زید نے مشتری پر گاڑی ۴۰ لاکھ میں بیچ دی ہے اور اس چالیس لاکھ روپے قرض میں سے ۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے مل چکے ہیں تو بقیہ رقم ۳۵ لاکھ ۲۰ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب ہے اور اس کی ادائیگی

(۱) البحرالرائق، کتاب الزکوٰۃ،فصل فی الغنم:۲/ ۳۹۰

مندرجہ ذیل دوطریقوں سے ہوسکتی ہے:

(۱) سال گزرنے کے بعد قرض دار کے ذمہ جتنا قرض باقی ہے، ہر سال اُس مال کی زکوٰۃ ادا کرے، مثلاً: پہلے سال قرض دار کے ذمے ۳۵ لاکھ ۲۰ ہزار روپے واجب الادا تھے تو اُس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ بھی ادا کی جائے۔ دوسرے سال اُس ۳۵ لاکھ ۲۰ ہزار سے ۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے منہا کر کے بقیہ رقم ۳۰ لاکھ ۴۰ ہزار کی زکوٰۃ بھی نکالی جائے۔ اسی طرح ہر سال وصول شدہ قسطوں کو قرض کے بقیہ رقم سے منہا کر کے باقی ماندہ رقم کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے، یہاں تک کہ مکمل قرض وصول ہوجائے۔

(۲) اس رقم سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سال جو رقم وصول ہو اور وہ رقم دیگر اخراجات میں خرچ ہو تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ بقیہ رقم ۳۵ لاکھ ۲۰ ہزار میں سے دوسرے سال جو رقم (۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے) وصول ہوں تو اس پر دو سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے، تیسرے سال جو رقم وصول ہو، اس پر تین سال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ الغرض جتنی مدت میں مکمل قرض وصول ہوجائے، آخری سال کی قسط پر اتنی ہی سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

(وتجب) زكاتها إذا تمّ نصابًا، وحال الحول.........(عند قبض أربعين درهمًا من الدين القوي كقرض (وبدل مال تجارة) فكلّما قبض أربعين درهمًا يلزمه درهم.(۱)

ترجمہ:

جب نصاب مکمل ہوجائے اوراس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، ۔۔۔۔۔ (دَین قوی (مثلاً قرض) میں چالیس درہم قبض کرنے سے) اس پر زکوٰۃ واجب ہے (وہ مال جو بدلِ تجارت میں سے ہو) پس جب بھی چالیس درہم پر قبضہ ہوگا تو اس پر ایک درہم لازم ہوگا۔

❁❁❁

زکوٰۃ کی ایڈوانس قسط وار ادائیگی

سوال نمبر (380):

ہمارا ایک میڈیکل سٹور ہے، جس کی مالیت تقریباً دس لاکھ روپے بنتی ہے، ہم اس کی زکوٰۃ ادا کرنے میں یہ

(۱) الدرالمختار علی صدر ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ المال: ۳/۲۳۶،۲۳۷

طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ڈھائی فیصد کے حساب سے روزانہ کچھ رقم یا اُس مالیت کی دوائیں مستحقین کو دیتے ہیں، ازروئے شریعت اس طریقہ کار سے زکوٰۃ کی ادائیگی معتبر ہے یانہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطہ نظر سے جب کسی کے پاس اتنا مال موجود ہو جو نصاب تک پہنچتا ہو اور اس پر سال گزر جائے تو ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہے، تاہم اگر کوئی شخص اپنے مال پر سال گزرنے سے قبل زکوٰۃ ادا کرے تو اس کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں جب آپ میڈیکل سٹور سے روزانہ کے حساب سے کچھ رقم یا اس کی مالیت کے برابر دوائیں مستحقین کو دیں تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی دُرست ہوگی۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویجوز تعجیل الزکوٰۃ بعد ملك النصاب، ولایجوز قبله.(١)

ترجمہ:

نصاب کا مالک ہوجانے کے بعد وقت سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے اور نصاب کا مالک ہونے سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی دُرست نہیں۔

❁❁❁

سود کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(381):

ایک شخص کے پاس نصاب کے بقدر سود کا مال ہے اور وہ اس مال سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کا ذمہ فارغ ہوگا یانہیں؟

بیّنوا توجروا

(١) الفتاوی الهندیة، کتاب الزکوٰة، الباب الأول في تفسیرها وصفتها..............: ١٧٦/١

الجواب وباللہ التوفیق:

اللہ تعالیٰ نے پاک مال کھانے اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔اگر کسی کے پاس حلال مال نصاب تک پہنچ جائے تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی،تاہم جس کے پاس حرام مال ہو تو اس مال کو اپنے مالک تک پہنچانا ضروری ہے۔اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو اس سے خلاصی کا طریقہ یہ ہے کہ کسی فقیر کو ثواب کی نیت کے بغیر ہی صدقہ کردے۔

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص نے جن لوگوں سے سود کا مال لیا ہے،ان کو یہ مال واپس کرنا واجب ہے،اگر لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس مال کو بلانیتِ ثواب صدقہ کرنا واجب ہے اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں،تاہم زکوٰۃ کے نام سے جو مال ادا ہو،اس سے ذمہ فارغ متصور ہوگا۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

قوله: (كما لو كان الكل خبيثًا)في القنية: ولو كان الخبيث نصابًا لايلزمه الزكاة؛ لأنّ الكل واجب التصدّق عليه.(۱)

ترجمہ: (جس طرح اگر پورا مال حرام ہو)قنیہ میں ہے کہ:اگر پورا مال حرام ہو تو ایسے شخص پر زکوۃ واجب نہیں،کیونکہ اس پورے مال کو صدقہ کرنا واجب ہے۔



اربابِ اموال کی طرف سے بینک کی زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(382):

اکثر لوگ اپنی رقوم بینکوں میں رکھتے ہیں،ہر سال یکم رمضان پر بینک ان رقوم سے چالیس فیصد کے حساب سے زکوٰۃ کاٹ لیتی ہے،لیکن اس میں اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ یہ زکوٰۃ مستحقین تک نہ پہنچے۔ایسی صورت میں اکاؤنٹ ہولڈرز زکوٰۃ کی ادائیگی سے فارغ الذمہ ہوں گے یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الزکوۃ،باب زکوٰۃ الغنم،مطلب: فیمالو صادرالسلطان رجلافنوی بذلك أداء الزکوۃإلیه:۲۱۸/۳

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ دینے والے کا خود ادا کرنا ضروری نہیں، بلکہ اگر دوسرا شخص یا کوئی ادارہ صاحبِ نصاب شخص کے مال سے اس کی اجازت سے زکوٰۃ ادا کرے تو ایسی صورت میں اس کا ذمہ فارغ ہوجائے گا۔

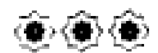
موجودہ دور میں جب بینک لوگوں کے اکاؤنٹس میں موجود رقوم سے اُن کی اجازت سے چالیس فیصد زکوٰۃ کاٹ لے تو ایسی صورت میں ان کا ذمہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے فارغ ہوجاتا ہے۔ جہاں تک مستحقین تک نہ پہنچنے کا احتمال ہے تو چونکہ بینک زکوٰۃ کی وصولی میں فقرا ومساکین کی طرف سے وکیل ہوتا ہے، اس لیے بینک کے وصول کرنے سے زکوٰۃ کی ادائیگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ جب حکومت کا مصرف میں خرچ نہ کرنا یقینی ہو تو پھر اس کی بجائے ذاتی طور پر ادائیگی کا اہتمام کرے۔

والدّلیل علیٰ ذلك:

ويسقط الواجب عن أرباب الأموال لو هلك المال في يده ....وهو نائب عن الفقراء.(١)

ترجمہ:

اگر اس (عامل) سے مال ہلاک ہوجائے تو مال کے مالکوں (زکوٰۃ دینے والوں) کے ذمے سے واجب ساقط ہوجائے گا۔۔۔۔اور یہ عامل فقرا کی طرف سے نائب ہے۔



بیوی کی طرف سے شوہر کا زکوٰۃ ادا کرنا

سوال نمبر(383):

اگر کسی عورت کے پاس نصاب کے بقدر سونا موجود ہو، لیکن اس کے پاس اتنی رقم موجود نہیں کہ اس سے زکوٰۃ ادا کرے تو اس صورت میں اگر اس عورت کی جگہ اس کا شوہر زکوٰۃ ادا کرے تو اس سے اس عورت کا ذمہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے فارغ ہوگا یا نہیں؟

بیّنوا تؤجروا

(١) البحر الرائق، کتاب الزکوۃ، باب المصرف، تحت قوله (والعامل):٢/ ٤٢١

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ اگر کسی کے پاس زکوٰۃ کے مقررہ نصاب کے برابر مال موجود ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

صورتِ مسئولہ میں جب اس عورت کے پاس بقدر نصاب سونا موجود ہے، لیکن نقد رقم موجود نہیں تو ایسی صورت میں اپنا کوئی زیور وغیرہ بیچ کر زکوٰۃ ادا کرے یا بیوی شوہر کو اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دے تو ایسی صورت میں بیوی کا ذمہ فارغ ہو جائے گا۔ تاہم صراحتاً یا دلالۃً اجازت ضروری ہے۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

لو أمر غيره بالدفع عنه جاز .(۱)

ترجمہ:

اگر کسی نے غیر کو اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا تو یہ صورت جائز ہے۔

❁❁❁

زکوٰۃ کے وجوب میں سونے، چاندی کے ناقص نصاب اور نقد رقم کو ملانے کا طریقہ کار

سوال نمبر (384):

اگر کسی خاتون کے پاس تین تولہ سونا اور دو سو روپے نقد ہوں تو کیا سونے کی قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے اس عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز اس بات کی بھی وضاحت کریں کہ سونے چاندی کے دو ناقص نصابوں کی موجودگی میں ان دونوں نصابوں کو ملا کر زکوٰۃ کا حکم کیا جائے گا یا نہیں؟

بیّنوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعی نقطۂ نظر سے اگر کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی یا نقدی ہو، لیکن کوئی بھی اپنے نصاب تک نہ پہنچتا ہو، یعنی سونا ساڑھے سات تولہ سے کم ہو اور چاندی ساڑھے باون تولہ سے کم ہو، اسی طرح نقد رقم بھی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم ہو تو ایسی صورت میں ان کو باہم ملا کر دیکھا جائے گا کہ یہ نصاب کو پہنچتے ہیں یا نہیں؟ اگر ان کے

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار، كتاب الزكوة ،مطلب في زكوة ثمن المبيع وفاءً،قوله : (ولو تصدق) :۱۸۹/۳

باہم ملنے سے چاندی کا نصاب پورا ہوتا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

اب سونے اور چاندی کا باہم ملانا قیمت کے اعتبار سے ہوگا یا اجزا کے اعتبار سے، اس کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ ضم بالقیمۃ (قیمتوں کو ملانے) اور صاحبینؒ ضم بالأ جزا (اجزا کو ملانے) کا حکم کرتے ہیں۔

آج کل سونے اور چاندی کی قیمتوں میں حد درجہ تفاوت واقع ہوئی ہے، اس لیے ضم بالقیمۃ میں حرج کی وجہ سے ضم بالا جزا کے طریقے پر جواب دینے میں امت کے لیے آسانی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

ضم بالا جزا کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس مقدار میں سونا موجود ہے، اسے سات سے ضرب دیا جائے، پھر جو حاصلِ ضرب ہو، اسے ساڑھے باون سے منفی کریں، اس کا جو حاصل آئے اس مقدار میں چاندی یا اس کی قیمت کا کسی شخص کے پاس موجود ہونا زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مکمل نصاب شمار ہوگا۔

صورت مسئولہ کے مطابق اگر کسی خاتون کے پاس تین تولہ سونا ہو تو صاحبِ نصاب بننے کے لیے اس کے پاس ساڑھے اکتیس تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اس خاتون کے پاس تین تولہ سونا اور دو سو روپے ہیں اور دو سو روپے ساڑھے اکتیس تولہ چاندی کی قیمت کے برابر نہیں، اس لیے ضم بالا جزا پر عمل کرنے کے باوجود اس عورت پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

والدّلیل علیٰ ذلک:

ویضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب، ويكمل احدى النصابين بالآخر عند علمائنا...... ثم قال أبو حنيفة: يضم باعتبار القيمة...... وقال أبو يوسف، ومحمد: يضم باعتبار الأجزاء يعني بالوزن.(۱)

ترجمہ: اور سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے کے ساتھ ملایا جائے گا اور ہمارے علما کے ہاں ایک نصاب کو دوسرے نصاب سے پورا کیا جائے گا۔ پھر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: ''دونوں نصابوں کو قیمت کے اعتبار سے ملایا جائے گا'' اور امام ابویوسفؒ و محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ''اجزا یعنی وزن کے اعتبار سے ملایا جائے گا''۔

ومنها كون المال نصابا، فلاتجب في أقل منه.(۲)

ترجمہ: اور زکوٰۃ کی شرائط میں سے ایک شرط مال کا نصاب کے برابر ہونا ہے، پس نصاب سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

(۱) الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكوة:۲/۱۷٤

(۲) الفتاوى الهندية، كتاب الزكوة،الباب الأول في تفسيرها وصفتها......:۱/۱۷۲

مصادر ومراجع

نمبرشمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر
		الف	
١	إرشاد السّاري إلى مناسك الملاعلي القاري	حسين بن محمدسعيد عبدالغني المكي	دار الكتب العلمية بيروت
٢	أحكام القرآن	ظفرأحمد العثماني (١٣٩٤هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراجي
٣	أحكام القرآن	أبو بكر أحمد بن علي الرازي الجصاص الحنفي (٣٧٠هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
٤	إسلامی تهذيب وتمدن اردوترجمه "التشبه في الإسلام"	قاری محمد طيب قاسمي (١٤٠٣هـ)	إداره إسلاميات لاهور
٥	إعلاء السنن	ظفرأحمد العثماني (١٣٩٤هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
٦	إعلام الموقّعين	ابن القيم الجوزية (٧٥١هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
٧	الإتقان في علوم القرآن	جلال الدين السيوطي (٩١١هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
٨	الاختيارلتعليل المختار	أبوالفضل عبد اللّٰه الموصلي (٦٨٣هـ)	دارالمعرفة بيروت لبنان
٩	الاستصناع	سعودبن مسعد الثبيتي	دارابن حزم بيروت
١٠	الاعتصام	أبوإسحاق إبراهيم الشاطبي (٧٩٠هـ)	مكتبه رشيديه پشاور
١١	الأشباه والنظائر	زين الدين بن إبراهيم ابن نجيم (٩٧٠هـ)	ايج ايم سعيد كراجي
١٢	البحر الرائق	ابن نجيم (٩٧٠هـ)	دارالكتب العلمية بيروت

١٣	البداية والنهاية	إسماعيل ابن كثير (٧٧٤هـ)	دارالفكر بيروت
١٤	الترغيب والترهيب	زكي الدين عبدالعظيم بن عبدالقوي المنذري (٦٥٦هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
١٥	التشريع الجنائي الإسلامي	عبدالقادر عودة	موسسة الرسالة بيروت
١٦	التعليق الصّبيح	محمد إدريس الكاندهلوي (١٣٩٤هـ)	المكتبة العثمانية لاهور
١٧	التعليق الميسر على حاشية الروض الأزهر في شرح الفقه الاكبر	الشيخ الوهبي سليمان الغاوجي	دار البشائر الإسلامية بيروت
١٨	التفسيرالكبير	فخر الدين الرازي (٦٠٦هـ)	دارإحياء التراث العربي لبنان
١٩	التلخيص الحبير	ابن حجر العسقلاني (٨٥٢هـ)	المكتبة الا ثرية شيخو پوره
٢٠	الجامع لأحكام القرآن للقرطبي	محمد القرطبي (٦٧١هـ)	دارإحياء التراث العربي لبنان
٢١	الجوهرة النيرة	أبوبكربن علي بن محمدالزبيدي (٨٠٠هـ)	دارالكتب العلمية لبنان
٢٢	الحيلة الناجزة	أشرف على التهانوي (١٣٦٢هـ)	دارالإشاعت كراچی
٢٣	الدّرالمختار مع ردالمحتار	محمد بن علي الحصكفي (١٠٨٨هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٢٤	الدّرالمنتقى على هامش مجمع الأنهر	ملا علي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	دار احياء التراث العربي بيروت لبنان
٢٥	الزهد الكبيرللبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (٤٥٨هـ)	دارالجنان بيروت لبنان
٢٦	الشريفية شرح السراجية	السيدالشريف علي الجرجاني (٨١٦هـ)	المكتبة الحقانية پشاور
٢٧	السنن الكبرى للنسائي	أحمد النسائي (٣٠٣هـ)	موسسة الرسالة بيروت لبنان

۲۸	السنن الكبرى للبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (۴۵۸هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
۲۹	السّراجي في الميراث	محمدبن عبدالرشيد السجاوندي (۶۰۰هـ)	الميزان لاهور
۳۰	السّعاية	محمد عبدالحي اللكهنوي (۱۳۰۴هـ)	سهيل اكيڈمي لاهور
۳۱	الشمائل المحمدية للترمذي	محمد بن عيسى الترمذي (۲۷۹هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۳۲	العرف الشذي	أنورشاه الكشميري (۱۳۵۲هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
۳۳	العقائد الإسلامية	سيد سابق (۱۴۲۰هـ)	دار الكتاب العربي
۳۴	العقيدة في الله	عمرسليمان الأشقر (۱۴۳۳هـ)	مكتبة الفلاح الكويت
۳۵	العناية على هامش فتح القدير	أكمل الدين محمدبن محمد البابرتي (۷۸۶هـ)	المكتبة الحقانية پشاور
۳۶	الفتاوى البزازية على هامش الفتاوى الهندية	محمد بن شهاب الكردي (۸۲۷هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه، دارالكتب العلمية بيروت
۳۷	الفتاوى الخانية على هامش الفتاوى الهندية	فخرالدين حسن بن منصور الأوزجندي (۵۹۲هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
۳۸	الفتاوى الكاملية في الحوادث الطرابلسية	محمدكامل بن مصطفى الطرابلسي (۱۳۱۵هـ)	المكتبة الحقانية پشاور
۳۹	الفتاوى الهندية (العالمگيرية)	شيخ نظام وجماعة من علماء الهند	مكتبه رشيديه كوئٹه
۴۰	الفتاوى التاتارخانية	عالم بن العلاء الدهلوي (۷۸۶هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
۴۱	الفقه الحنفي وأدلته	أسعد محمد سعيد الصاغرجي	دارالكلم الطيب بيروت لبنان

٤٢	الفقه الإسلامي وأدلته	د.وهبة الزحيلي (١٤٣٦هـ)	دارإحسان دمشق
٤٣	القاموس الجديد	وحيد الزمان قاسمي كيرانوي (١٤١٥هـ)	إداره إسلاميات لاهور كراچی
٤٤	الكفاية علىٰ هامش فتح القدير	جلال الدين الخوارزمي(٧٦٩هـ)	مكتبه حقانيه پشاور
٤٥	المبسوط للسرخسي	شمس الأئمة السرخسي (٤٨٣هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
٤٦	المبسوط للشيباني	محمد بن الحسن الشيباني (١٨٩هـ)	دارالمعارف النعمانية لاهور
٤٧	المجموع شرح المهذب	محي الدين أبوزكريا يحيىٰ بن شرف النووي (٦٧٦هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٤٨	المحيط البرهاني في الفقه النعماني	محمودبن أحمدبن عبدالعزيز عمربن مازة البخاري (٦١٦هـ)	المكتبة الغفارية كوئٹه
٤٩	المختصرللقدوري	أبوالحسين أحمد القدوري (٤٢٨هـ)	الميزان لاهور
٥٠	المدخل	محمدبن محمد العبدري المالكي المعروف بابن الحاج (٧٢٧هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥١	المسامرة على المسايرة	كمال الدين محمد بن محمد ابن أبي الشريف (٩٠٦هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥٢	المستدرك على الصحيحين	أبوعبدالله محمدبن عبدالله الحاكم النيسابوري (٤٠٥هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٥٣	المسلك المتقسط في المنسك المتوسط على هامش إرشادالساري	الملا علي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٥٤	المصنف لابن أبي شيبة	الإمام أبوبكر عبد الله بن محمد ابن أبي شيبة (٢٣٥هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچی، طيب إكادمي ملتان

٥٥	المعجم الأوسط	الحافظ سليمان الطبراني(٣٦٠هـ)	مكتبة المعارف الرياض
٥٦	المعجم الكبيرللطبراني	الحافظ أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني (٣٦٠هـ)	شركة معمل و مطبعة الزهراء الحديثة المحدودة عراق
٥٧	المغني على الشرح الكبير	للإمامين موفق الدين(٦٢٠هـ) و شمس الدين ابني قدامة(٦٨٣هـ)	المكتبة التجارية المكة المكرمة
٥٨	المفهم شرح صحيح مسلم	أحمد بن عمر بن إبراهيم القرطبي (٦٥٦هـ)	دارابن كثيردمشق، دارالكلم الطيب بيروت لبنان
٥٩	المنجد في اللغة والأعلام	جماعة علماء المستشرقين	دار المشرق بيروت لبنان
٦٠	الموافقات في أصول الأحكام	أبو إسحاق إبراهيم بن موسى اللخمي الشاطبي (٧٩٠هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
٦١	الموسوعة الفقهية الكويتية	وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت	طباعة ذات السلاسل الكويت
٦٢	الموضوعات الكبرى	ملاعلي بن سلطان القاري (١٠١٤هـ)	مكتبه دارالسلام پشاور
٦٣	النبراس شرح شرح العقائد	عبد العزيز فرهاروي (١٢٣٩هـ)	المكتبة الحقانية ملتان
٦٤	النتف في الفتاوى	علي بن الحسين السغدي (٤٦١هـ)	موسسة الرسالة بيروت دار الفرقان عمان
٦٥	النّهر الفائق	عمر بن إبراهيم بن نجيم (١٠٠٥هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
٦٦	الوجيز	عبد الكريم زيدان (١٤٣٥هـ)	فاران اكيڈمی لاهور
٦٧	الوسيط في شرح القانون المدني	عبدالرزاق السنهوري (١٣٩١هـ)	دارإحياء التراث العربي، بيروت
٦٨	الهداية	برهان الدين أبو الحسن علي بن أبي بكر المرغيناني (٥٩٣هـ)	مكتبه رحمانيه لاهور

٦٩	اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة	جلال الدين عبد الرحمن السيوطي (٩١١هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٧٠	الأحكام السلطانية	علي بن محمد الماوردي (٤٥٠هـ)	نفيس اكيڈمی کراچی
٧١	كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار	تقي الدين أبوبكر بن محمد الحصني (٨٣٩هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٧٢	الإتقان في علوم القرآن	جلال الدين عبدالرحمن السيوطي (٩١١هـ)	سهيل اكيڈمی لاهور
٧٣	الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف	علاؤالدين علي بن سليمان المرداوي (٨٨٥هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
٧٤	إمدادالفتاوی	أشرف علي التهانوي (١٣٦٢هـ)	مكتبه دارالعلوم كراچی
٧٥	أوجز المسالك	محمدزكريا الكاندهلوي (١٣٠٢هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٧٦	اوزان شرعيه	مفتي محمد شفيع (١٣٩٦هـ)	إدارة المعارف كراچی
٧٧	آكام المرجان في أحكام الجان	بدر الدين أبوعبد الله محمد بن عبد الله الشبلي (٧٦٩هـ)	كارخانه تجارت كتب كراچی
٧٨	أشرف التوضيح	نذير أحمد (١٤٢٥هـ)	مكتبة العارفي فيصل آباد
	ب		
٧٩	بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع	علاء الدين أبوبكربن مسعود الكاساني (٥٨٧هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٨٠	بداية المجتهد ونهاية المقتصد	ابن رشد محمدبن أحمد القرطبي (٥٩٥هـ)	مكتبة نزار مصطفي الباز مكة المكرمة
٨١	بذل المجهود في حل أبي داؤد	خليل أحمد السهارنفوري (١٣٤٦هـ)	دار اللوئ للنشر و التوزيع الرياض

ت

٨٢	تاريخ التشريع الإسلامي	منّاع القطان (١٤٢٠هـ)	مؤسسة الرسالة بيروت لبنان
٨٣	تبصرة الحكّام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام	إبراهيم بن علي ابن فرحون المالكى (٧٩٩هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٨٤	تبيين الحقائق في شرح كنزالدّقائق	فخرالدين عثمان بن علي الزيلعي (٧٤٣هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٨٥	تحفة الفقهآء	علاء الدين السمر قندي (٥٧٥هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
٨٦	تفسير المظهري	محمد ثناء اللّٰه پانی پتی (١٢٢٥هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه پاكستان
٨٧	تفسيرالقرآن الكريم	عمادالدين إسماعيل بن كثير (٧٧٤هـ)	مكتبه إمداديه مكة المكرمة
٨٨	تفسير أبي السعود	أبو السعود محمد بن محمد (٩٨٢هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
٨٩	تقرير ترمذي	محمد تقي العثماني	ميمن إسلامك پبلشرز كراچي
٩٠	تقريرات الرافعي	محمدرشيد بن عبداللطيف البيساري الرافعي(١٣٢٣هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٩١	تقليد كى شرعى حيثيت	محمد تقي العثماني	ميمن إسلامك پبلشرز كراچي
٩٢	تكملة البحرالرائق	محمدبن حسين بن علي الطوري (١١٣٨هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
٩٣	قرة عيون الأخيار تكملة ردالمحتار	محمدعلاء الدين بن محمدأمين ابن عابدين (١٣٠٦هـ)	مكتبه إمداديه ملتان
٩٤	تكملة عمدة الرعاية على شرح الوقاية	مولانا فتح محمد التائب (١٣٢٧هـ)	مكتبه رحمانية اقراء سنٹر غزنى سٹريٹ اردو بازار لاهور

۹۵	تكملة فتح الملهم	محمدتقي العثماني	مكتبه دارالعلوم كراجي
۹۶	تنوير الأبصار مع الدرالمختار	محمد بن عبدالله بن أحمد التمرتاشي (۱۰۰٤هـ)	مكتبه إمداديه ملتان

ج، ح، خ، د

۹۷	جامع البيان المعروف تفسيرالطبري	أبو جعفر محمدبن جرير الطبري (۳۱۰هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
۹۸	جامع الترمذي	أبوعيسىٰ محمدبن عيسى الترمذي (۲۷۹هـ)	الميزان، لاهور
۹۹	جامع الرموز	شمس الدين محمد القهستاني (۹۵۳هـ)	ايج۔ ايم۔ سعيد كراجى
۱۰۰	جواهرالفقه	مفتي محمد شفيع (۱۳۹٦هـ)	مكتبه دارالعلوم كراجى
۱۰۱	حاشية الشلبي على تبين الحقائق	شهاب الدين أحمد بن يونس الشلبي (۱۰۱۰هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
۱۰۲	حاشية الموسوعة الفقهية الكويتية	وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية	طباعة ذات السلاسل الكويت
۱۰۳	حاشية الهداية	محمد عبد الحيّ اللكهنوي (۱۳۰٤هـ)	مكتبه رحمانيه لاهور
۱۰٤	حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح	أحمد بن محمد الطحطاوي الحنفي (۱۲۳۱هـ)	المكتبةالعربية كوئته
۱۰۵	حاشية على البناية في شرح الهداية	ناصرالإسلام محمد عمر رامفوري (۱۲۹۵هـ)	مكتبة رشيديه كوئته
۱۰٦	حجة الله البالغة	شاه ولي اللّٰه أحمد الدهلوي (۱۱۷٦هـ)	المكتبة السلفيةلاهور

١٠٧	خلاصه التحقيق في حكم التقليد و التلفيق	عبد الغني النابلسي (١١٤٣هـ)	مكتبة الحقيقة استنبول، تركيا
١٠٨	خلاصة الفتاوى	طاهربن أحمد البخاري (٥٤٢هـ)	مكتبه رشيديه كوئته
١٠٩	درر الحكام شرح مجلة الأحكام	علي حيدر (١٢٥٤هـ)	المكتبة العربية كوئته

ر ، س ، ش

١١٠	رحمة الأمة في اختلاف الآئمة	أبو عبد الله محمد بن عبد الرحمن قاضي صفد (٧٨٠هـ)	دارالفكر بيروت لبنان
١١١	ردّالمحتار على الدّرالمختار	محمدأمين ابن عابدين (١٢٥٢هـ)	مكتبه امداديه ملتان
١١٢	روح المعاني	شهاب الدين محمود الآلوسي البغدادي (١٢٧٠هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان
١١٣	سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد	شمس الدين محمد بن يوسف الشامي (٩٤٢هـ)	دار الكتب العلمية بيروت ، لبنان
١١٤	سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة	محمد ناصرالدين الألباني (١٤٢٠هـ)	المكتب الإسلامي بيروت
١١٥	سنن الدارمي	عبدالله بن عبد الرحمن الدارمي (٢٥٥هـ)	قديمى كتب خانه كراچى
١١٦	سنن النسائي	أبو عبد الرحمن أحمدبن شعيب الخراساني النسائي (٣٠٣هـ)	مكتبه رحمانيه اردو بازار لاهور
١١٧	سنن أبي داؤد	سليمان بن الأشعث السجستاني (٢٧٥هـ)	ايچ ايم سعيد كراچى
١١٨	سنن الدارقطني	علي بن عمر الدار قطني (٣٨٥هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان

۱۱۹	شرح السّنة	الحسين بن مسعود البغوي (۵۱۰هـ)	المكتب الإسلامي بيروت، لبنان
۱۲۰	شرح العقائد النّسفية	مسعود بن عمر التفتازاني (۷۹۳هـ)	مكتبه حقانيه بشاور
۱۲۱	شرح العقيدة الطحاوية	ابن أبي العزّ الحنفي (۷۹۲هـ)	قديمى كتب خانه كراجي
۱۲۲	شرح المجلّة	سليم رستم باز اللبناني (۱۳۳۸هـ)	المكتبة الحبيبية كوئته
۱۲۳	شرح المجلة	خالد الأتاسي (۱۳۲۶هـ)	المكتبة الحقانية بشاور
۱۲۴	شرح النقاية	علي بن محمد سلطان القاري (۱۰۱۴هـ)	ايج ايم سعيد كمپنى كراجي
۱۲۵	شرح الوقاية	عبيدا لله بن مسعود (۷۴۷هـ)	مكتبه رشيديه كوئته
۱۲۶	شرح صحيح البخاري لابن بطال	أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك (۴۴۹هـ)	مكتبة الرشد الرياض
۱۲۷	شرح عقود رسم المفتى لابن عابدين	محمد أمين الشهير بابن عابدين (۱۲۴۳هـ)	مكتبة البشرى كراجي
۱۲۸	شرح مسلم للنووي	يحيى بن شرف النووي (۶۷۶هـ)	مكتبه دارالفكر بيروت لبنان
۱۲۹	شرح معاني الآثار	أحمد بن محمد الطحاوي (۳۲۱هـ)	ايج ايم سعيد كمپنى كراجي
۱۳۰	شعب الإيمان للبيهقي	أبوبكر أحمد بن الحسين البيهقي (۴۵۸هـ)	دارالكتب العلميه بيروت لبنان

ص، ع، غ

۱۳۱	صحيح ابن حبان	محمد بن حبان (۳۵۴هـ)	مكتبة دارالفكر بيروت لبنان

۱۳۲	صحيح البخاري	محمدبن إسماعيل البخاري (۲۵٦هـ)	قديمي كتب خانه كراچي
۱۳۳	صحيح مسلم	مسلم بن الحجاج القشيري (۲٦۱هـ)	قديمي كتب خانه كراچي
۱۳٤	عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد	شاه ولي الله الدهلوي (۱۱۷٦هـ)	دار الفتح الشارقه
۱۳۵	علوم الحديث	عبيدالله أسعدي	مجلس نشريات إسلام كراچي
۱۳٦	علوم القرآن	محمد تقي عثماني	مكتبه دارالعلوم كراچي
۱۳۷	عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية	محمد عبد الحي اللكهنوي (۱۳۰٤هـ)	مكتبه رشيديه كوئٹه
۱۳۸	عمدة القاري شرح صحيح البخاري	العلامة بدرالدين العيني (۸۵۵هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان
۱۳۹	عون المعبود شرح سنن أبي داؤد	محمدشمس الحق عظيم آبادي (۱۳۲۹هـ)	دارالفكربيروت، لبنان
۱٤۰	غمز عيون البصائر شرح الأشباه والنظائر	أحمدبن محمد الحموي (۱۰۹۸هـ)	إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراچي
۱٤۱	غنية الناسك في بغية المناسك	محمد حسن شاه المهاجر المكي (۱۳٤٦هـ)	مكتبة ادارة القرآن والعلوم الإسلامية كراچي
۱٤۲	غنيةالمستملي المعروف بالحلبي الكبيري	إبراهيم الحلبي (۹۵٦هـ)	مكتبه نعمانيه كوئٹه

ف

۱٤۳	فتاوىٰ ابن تيميه	تقي الدين ابن تيميه (۷۲۸هـ)	تحت إشراف الرئاسة العامة لشئون الحرمين الشريفين
۱٤٤	فتاوىٰ المرأة المسلمة	جماعة من علماء العرب	دارالفكر بيروت لبنان

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۴۵	فتاویٰ خیریة علیٰ هامش تنقیح الفتاویٰ الحامدية	خیر الدین الرملی (۱۰۸۱هـ)	مکتبہ حقانیہ پشاور پاکستان
۱۴۶	فتاویٰ رشیدیہ	رشیداحمد گنگوهي(۱۳۲۳هـ)	موتمرالمصنفین اکوڑہ خٹك
۱۴۷	فتح الباري	أحمد بن علي بن حجر العسقلاني (۸۵۲هـ)	دارالفكر بيروت، لبنان
۱۴۸	فتح الغفار شرح المنار	زين الدين بن إبراهيم ابن نجيم(۹۷۰هـ)	مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ
۱۴۹	فتح القدير الجامع بين فني الرواية والدراية من علم التفسير	محمد بن علي بن محمد الشوكاني (۱۲۵۰هـ)	دار الفكر بيروت لبنان
۱۵۰	فتح القدير	ابن الهمام كمال الدين محمدبن عبدالواحد (۸۶۱هـ)	مکتبہ حقانیہ پشاور پاکستان
۱۵۱	فتح الملهم شرح صحيح مسلم	شبيرأحمد العثماني(۱۳۶۹هـ)	مکتبہ دارالعلوم کراچی
۱۵۲	فقه السنة	السيد السابق (۱۴۲۰هـ)	دار ابن كثير دمشق لبنان
۱۵۳	فيض الباري على صحيح البخاري	محمد أنورشاه الكشميري (۱۳۵۲هـ)	مکتبہ حقانیہ پشاور
۱۵۴	فيض القدير شرح الجامع الصغير	محمد عبد الرؤوف المناوي (۱۰۳۱هـ)	دارالكتب العلمية بيروت، لبنان

ق، ک

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۵۵	قاموس الفقه	سيف الله رحمانی	زم زم پبلشرز کراچی
۱۵۶	كتاب التعريفات	سيد شريف الجرجاني(۸۱۶هـ)	دارالمنارللطباعة والنشر
۱۵۷	كتاب الفقه على المذاهب الأربعة	عبدالرحمن بن محمدعوض الجزيري (۱۳۶۰هـ)	وحيدي كتب خانه پشاور
۱۵۸	كتاب الأموال	أبو عبيد قاسم بن سلام (۲۲۴هـ)	دارالكتب العلمية بيروت

١٥٩	كشاف القناع عن متن الإقناع	منصور بن يونس البهوتي (١٠٥١هـ)	دار الكتب العلميه بيروت
١٦٠	كشف الأسرار	أبو البركات عبدالله بن أحمد حافظ الدين النسفي (٧١٠هـ)	دارالكتب العلمية بيروت
١٦١	كفايت المفتى	مفتى كفايت الله دهلوىؒ (١٣٥٢هـ)	دارالاشاعت كراچى
١٦٢	كنزالدّقائق	أبوالبركات عبدالله بن أحمد حافظ الدين النسفي (٧١٠هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنى كراچى
١٦٣	كنزالعمال	علاء الدين المتقي الهندي (٩٧٥هـ)	اداره تاليفات اشرفيه ملتان پاكستان

ل،م

١٦٤	لسان الحكام	إبراهيم بن محمد، المعروف بابن الشحنة الحلبي (٨٨٢هـ)	البابي الحلبي القاهرة
١٦٥	لسان العرب	محمد بن منظور الافريقي (٧١١هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
١٦٦	ماهنامه العصرپشاور	مفتى غلام الرحمن	جامعه عثمانيه پشاور
١٦٧	مجلة الأحكام العدلية	لجنة العلماء المحققين	مير محمد كتب خانه كراچى
١٦٨	مجمع الأنهرشرح ملتقى الأبحر	عبدالله بن محمد بن سليمان داماداَفندي (١٠٧٨هـ)	دارإحياء التراث العربي بيروت
١٦٩	مجمع الزوائد	نور الدين علي بن أبي بكرالهيثمي (٨٠٧هـ)	دار الكتب العلمية بيروت
١٧٠	مجموعه قوانين اسلامى	ڈاكٹرتنزيل الرحمن	اداره تحقيقات اسلامى اسلام آباد
١٧١	مجموعة رسائل ابن عابدين	محمدأمين ابن عابدين (١٢٤٣هـ)	سهيل اكيڈمي لاهور

۱۷۲	مجموعة رسائل اللكهنوي	عبدالحي اللكهنوي (۱۳۰٤هـ)	إدارة القران كراجي
۱۷۳	مرقاة المفاتيح	ملا علي بن سلطان القاري (۱۰۱٤هـ)	المكتبة الحقانية پشاور
۱۷٤	مسند الإمام أحمد	أحمد بن حنبل (۲٤۱هـ)	دار إحياء التراث العربي بيروت
۱۷٥	مسند أبي عوانة	أبو عوانه يعقوب بن إسحاق الأسفرائيني (۳۱٦هـ)	دار المعرفة بيروت
۱۷٦	مسند أبي يعلى الموصلي	أحمدبن علي الموصلي(۳۰۷هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان
۱۷۷	مشكوة المصابيح	محمدبن عبدالله الخطيب التبريزي (۷۳۷هـ)	المكتبة الحقانيه بشاور
۱۷۸	مصنف عبدالرزاق	أبو بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني(۲۱۱هـ)	إدارة القران والعلوم الاسلاميه كراچى
۱۷۹	معارف السنن	محمديوسف البنوري (۱۳۹۷هـ)	ايچ۔ ايم ۔سعيد كراچي
۱۸۰	معجم لغة الفقهاء	محمد رواس قلعه جي (۱٤۳٥هـ)	دارالنفائس بيروت
۱۸۱	معين الحكام	علاء الدين علي بن خليل الطرابلسي (۸٤٤هـ)	مكتبة القدس كوئثه
۱۸۲	مغني المحتاج	محمدبن أحمد الخطيب الشربيني(۹۷۷هـ)	دارالذخائرللمطبوعات قم إيران
۱۸۳	مفردات غريب القرآن	الحسين بن محمد الراغب الأصفهاني (٥۰۲هـ)	دارالقلم دمشق
۱۸٤	منحةالخالق على البحرالرائق	محمدأمين ابن عابدين (۱۲٤۳هـ)	دار الكتب العلمية بيروت لبنان
۱۸٥	منهاج السنن شرح جامع السنن	المفتي محمد فريد(۱٤۳۲هـ)	مكتبه حقانيه پشاور

١٨٦	موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان	نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي (٨٠٧هـ)	المطبعة السلفية و مكتبتها بيروت
١٨٧	موسوعة الفقه الإسلامي المعاصر	عبد الحليم عويس (١٤٣٣هـ)	دار الوفاء منصورة
١٨٨	مؤطا الإمام مالك	مالك بن انس (١٧٩هـ)	الميزان لاهور
١٨٩	نفع المفتي و السائل	عبد الحي اللكهنوي (١٣٠٤هـ)	ايچ ايم سعيد كمپنی كراچی
١٩٠	نور الأنوار	ملاأحمدجيون (١١٣٠هـ)	مير محمد كتب خانه كراچی
١٩١	نيل الأوطار	محمدبن علي بن محمد الشوكاني (١٢٥٠هـ)	دارالكتب العلمية بيروت لبنان


العصر اکیڈمی پشاور
AL-ASR ACADEMY
JAMIA USMANIA PESHAWAR


+92 333-9273561 / +92 321-9273561